قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

۲۰ واں
کُل ہند
اردو
کتاب میلہ
بھیونڈی
۱۷ تا ۲۵؍دسمبر ۲۰۱۶ء

ماہنامہ اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

فروری 2017 قیمت 15₹

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچّوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

پیاری پیاری نظمیں

قسط وار ناول

عجیب و غریب خبریں

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں

معلوماتی مضامین

ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

کہکشاں ♦ سیاحتی مقامات

اردو ایس ایم ایس ♦ اردو فیس بک ♦ دماغی ورزش

ننھے فنکار ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

مشمولات

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:19، شمارہ:02، فروری 2017

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدر آباد-500002
فون: 040-24415194

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
آپ کی بات — قارئین کے خطوط 5

کور اسٹوری
قومی اردو کونسل کا بیسواں اردو کتاب میلہ — شعیب رضا فاطمی 7
عالمی کتاب میلے میں قومی اردو کونسل کا مشاعرہ 13

انٹرویو
تنقید کا دائرہ محدود ہوگیا ہے: کیول دھیر — عبدالحی 16

زبان و تعلیم
فاصلاتی طرز تعلیم اور ٹیچر ایجوکیشن پروگرام — محمد اطہر حسین 21
متعدد یونیورسٹیوں کے نصاب میں اردو کی شمولیت — ایم جے وارثی 24

یوم وفات پر
مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت — فیروز بخت احمد 25

نقد و نگاہ
عبدالغفور نساخ اور ان کی تصانیف — معین الدین 28
اردو میں جامعاتی تحقیق مسائل اور ان کا حل — محمد اسلم فاروقی 32

ثقافتی دریچے
دکنی پر ملیالم اور ملیالم پر دکنی اثرات — سید سجاد حسین 35

شخصیت
مولانا مظہر الحق اور ان کے کارنامے — محمد توقیر عالم 38

سلسلۂ صحافت
امرتسر میں اردو صحافت — اوم پرکاش سونی 40

قانونیات
قانونیات کی ارتقائی منزلیں — ندیم غوری 42

چراغ دل
تصوف کا ایک روشن چراغ — سیما صغیر 47

رسالوں کے خاص نمبر
اردوئے معلیٰ (غالب نمبر) — قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی 49

خراج عقیدت
ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی: ممتاز دانشور — معصوم مرادآبادی 51

خراج محبت
حیرت ہے تم رؤف رضا سے نہیں ملے — جاوید قمر 53

کمپیوٹر
کمپیوٹر کی بناوٹ 56

سائنس و ٹیکنالوجی
ای بینکنگ: ایک انقلابی ٹیکنالوجی — فرمان چودھری 58

زبان وادب اور سوشل میڈیا — مبین نذیر 60

طب
اردو زبان وادب اور طب — وسیم احمد 62

فلم
ہندوستانی سنیما کے سو برس — انیس امروہوی 64

کتابوں کی دنیا
تبصرہ وتعارف — ادارہ 67

عالمی اردو نامہ
اردو نامہ — ادارہ 79

خبر نامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 81

ہماری بات

ذوقِ مطالعہ کے زوال پر گفتگو بہت پرانی ہے۔ رسائل و جرائد میں اس تعلق سے تحریریں بھی شائع ہوتی رہی ہیں۔ دانشورانِ علم و ادب نے بھی اس کے اسباب و علل پر روشنی ڈالی ہے اور یہ سچ ہے کہ صارفی معاشرت کی ترجیحات بہت حد تک تبدیل ہو چکی ہیں جس کی وجہ سے علم و ادب سے دوری کا رجحان بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ آج کے معاشرے میں ذہنی تفریح کے وسیع تر ذرائع کی وجہ سے کتابوں سے آنکھوں کا رشتہ کمزور پڑتا جا رہا ہے۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی اور انٹرنیٹ کی وجہ سے بھی ہمارے رویوں میں نمایاں تبدیلی آئی ہے۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کتاب اور انسان کا رشتہ بہت پرانا ہے اور تہذیبی ارتقا کا عمل کتابوں سے ہی مشروط ہے کیونکہ کتابیں ہی کسی بھی معاشرے کو وحشی سماج بننے سے بچاتی ہیں۔ کتابوں کے لفظوں میں جو روشنی ہوتی ہے وہ انسان کی باطنی ذات اور خارجی وجود کو روشن کر دیتی ہے۔ لفظوں سے اگر رشتہ ٹوٹ جائے تو انسان ایک تاریک وجود میں تبدیل ہو جاتا ہے کیونکہ یہ لفظ ہی ہیں جو انسان کو زندگی کے آداب و اطوار سکھاتے ہیں۔ کسی بڑے مفکر نے کہا تھا کہ اگر کسی قوم کو تباہ و برباد کرنا ہو تو اس کے علمی ذخیرے کو نیست و نابود کر دو۔ ماضی میں اسی مقصد کے تحت کتابوں کے عظیم الشان ذخیرے نذرِ آتش کر دیے گئے۔ بہت سے کتب خانوں کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔ اس تباہی کے پیچھے مقصد صرف یہی تھا کہ ان روشنیوں سے محروم کر دیا جائے جو ان کتابوں کی سطروں سے انسانی ذہنوں تک منتقل ہوتی ہیں۔

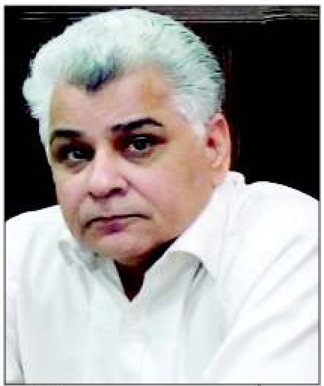

ماضی میں جو کتب خانے تعمیر کیے گئے ان کتب خانوں کا بنیادی مقصد ان علمی ذخیروں کا تحفظ تھا جس سے انسانی تہذیب ارتقا کی منزلیں طے کر سکے۔ دنیا میں بہت سے ایسے مشہور کتب خانے ہیں جہاں آج بھی ہماری تاریخ اور تہذیب کا بیش بہا سرمایہ محفوظ ہے۔ وہ کتب خانے یقیناً ہمارے لیے روشنی کے مینار ہیں۔

آج صورتِ حال قدرے تبدیل ہو گئی ہے۔ تاہم خوش آئند بات یہ ہے کہ مختلف ملکوں میں کتابوں کا جشن منایا جاتا ہے۔ عالمی سطح کے میلوں کا انعقاد ہوتا ہے اور کتابوں سے رشتہ جوڑنے کی کوششیں ہوتی ہیں اور اس کے مثبت اور مفید ثمرات بھی سامنے آ رہے ہیں۔ قومی اردو کونسل بھی کتابوں کے مطالعے کا ذوق پیدا کرنے کے لیے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں کتاب میلوں کا انعقاد کرتی رہی ہے۔ حال ہی میں قومی اردو کونسل نے مہاراشٹر کی تاریخی سرزمین بھیونڈی میں بیسواں اردو کتاب میلہ منعقد کیا تھا۔ اس میلے کے تعلق سے اخبارات میں جو رپورٹیں شائع ہوئی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ قاری کے بحران کے تعلق سے جو ایک عام تصور ہے وہ غلط ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اردو کتابوں کا بازار ختم ہو گیا ہے۔ کوشش کی جائے تو اردو کے کئی اور بازار وجود میں آ سکتے ہیں۔ بس ضرورت ہے کہ اردو میں ایسی کتابوں کی اشاعت زیادہ ہو جو طلبہ کی شخصیت سازی اور مستقبل کے سنوارنے میں معاون و مفید ہوں۔

نئے عہد کے تقاضے اور مطالبات تبدیل ہو چکے ہیں۔ خاص طور پر اب سائنسی علوم و فنون کی طرف لوگوں کی توجہ بڑھ رہی ہے۔ اردو میں ایسی کتابوں کی کمی پہلے سے محسوس کی جا رہی ہے۔ سائنسی اصطلاحات کی بھی کمی ہے اور اس کے علاوہ اور بہت سے مسائل ہیں جن کو حل کرنے کی کوشش کی جائے تو کتابوں کی اہمیت اور معنویت معاشرے کے ذہنوں میں نقش کی جا سکتی ہے۔

اردو دنیا کے شمارے میں بھیونڈی کتاب میلے کے تعلق سے کور اسٹوری شائع کی جا رہی ہے۔ اسے پڑھ کر آپ کو اندازہ ہوگا کہ کتابوں کا یہ جشن نہ صرف بہت کامیاب رہا بلکہ وہاں ایک ایسا جوش اور جنوں دیکھنے کو ملا جو عام طور پر کتاب میلے میں دیکھنے کو کم ملتا ہے۔ اس سے یہ امید قائم ہوتی ہے کہ اگر مسلسل اور متواتر کوشش کی جائے تو کتابوں کے تعلق سے معاشرے کی ذہنیت بدل سکتی ہے۔ اس میلے میں خاص بات یہ رہی کہ ہمارے ہردلعزیز مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل عالیجناب پرکاش جاوڈیکر نے اس میلے کا افتتاح کیا اور وہاں اپنے خطاب میں بڑی اہم بات کہی کہ ''کتابیں ہی آدمی کو انسان بناتی ہیں۔ تعلیم کے بغیر دنیا میں کچھ بھی نہیں۔ آپ زیادہ سے زیادہ کتابیں خریدیں، زیادہ سے زیادہ پڑھیں، یہی ہماری خواہش ہے۔ اردو بڑی ہی پیاری اور میٹھی زبان ہے اور ہر شخص اس سے محبت کرتا ہے۔''

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

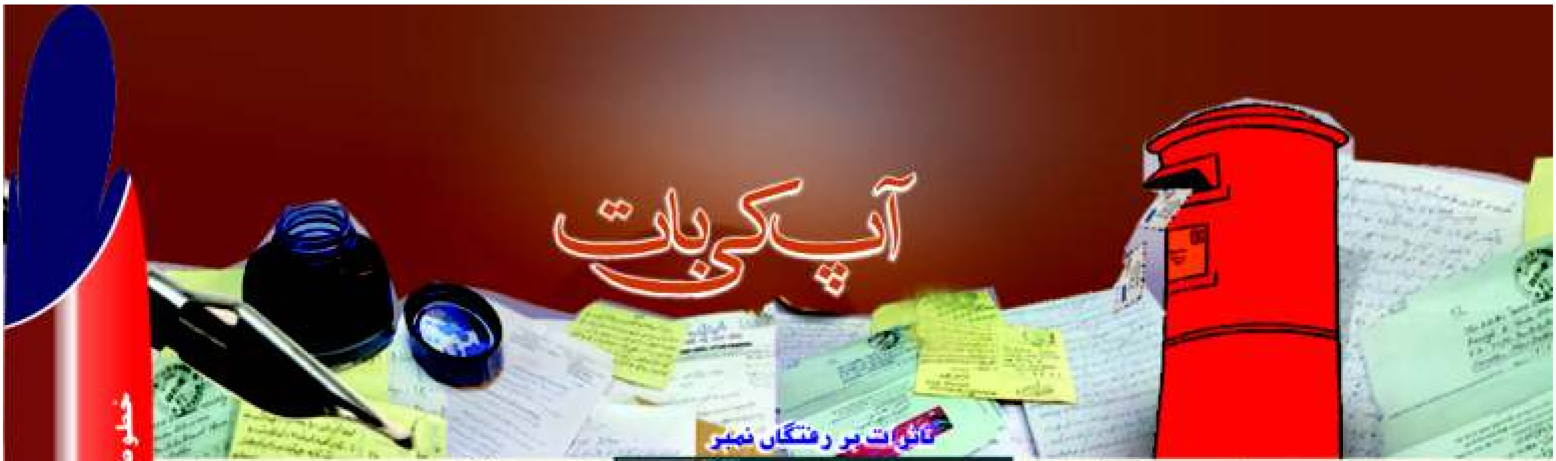

آپ کی بات

تاثرات بر رفتگاں نمبر

ماہنامہ 'اردو دنیا' نئی دہلی اور ماہنامہ 'شاعر' ممبئی کے تازہ شماروں میں مشاہیر ادبا و شعرا کے رخصت ہونے پر اس بار 'ماتمی تحریریں' خاص طور سے شائع کی گئیں ہیں۔ اردو دنیا کے مدیر اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر نے 'اپنی بات' میں لکھا ہے کہ: " 2016 علمی اور ادبی دنیا کے لیے قیامت خیز ثابت ہوا کہ اس سال بہت سی آفتاب و ماہتاب ہستیاں روپوش ہوگئیں۔" ان کو ناصر کاظمی کا یہ شعر بھی یاد آیا کہ۔

زندگی جن کے تصور سے جلا پاتی تھی
ہائے کیا لوگ تھے جو دامِ اجل میں آئے

پروفیسر ارتضیٰ کریم کو بخوبی احساس ہے کہ 'یادِ رفتگاں' کا یہ شمارہ مرحومین کو ایک طرح سے خراجِ عقیدت ہے... تاہم وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ "ماضی میں بہت سے رسالوں نے وفیات نگاری کی جو روایت قائم کی تھی یہ اسی کو زندہ رکھنے کی ایک کوشش ہے۔" ماہنامہ 'شاعر' کے مدیر افتخار امام صدیقی نے لکھا ہے کہ "اس شمارے کو مرحوم ادبا، شعرا کے نام پیش کرتے ہوئے ہمیں کوئی مسرت نہیں ہو رہی ہے۔ اس نوع کے دو شمارے ماضی میں پیش کیے جاچکے ہیں۔" بلاشبہ کسی کی موت ہمارے لیے باعث مسرت نہیں ہوسکتی لیکن ان کی خدمات کو محفوظ کر کے دستاویز بنانے کی کوشش لائقِ صد ستائش تو بن ہی سکتی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر شمس بدایونی کا 'وفیات نگاری' کے موضوع پر لکھا ہوا عالمانہ مضمون ہماری آنکھیں کھولتا ہے۔ انھوں نے اپنے مضمون (اردو دنیا، دسمبر 2016) میں ایک جگہ بجا طور پر سوال قائم کیا ہے کہ "بعض مضامین میں مرحوم شخصیت کا صرف ماتم کیا جاتا ہے، تاریخ وفات کا اندراج نہیں، کیا ایسے مضامین کو بھی وفیات کے ذخیرے کا حصہ سمجھنا صحیح ہوگا؟" اس کے ساتھ ہی ایک سوال یہ بھی اہم ہے کہ کیا اردو میں 'وفیات نگاری' کی کوئی ہمہ گیر و قاموسی (Encyclopaedic) کوشش ہوئی ہے؟ اس کا جواب مایوس کن ہے۔ اردو دنیا میں تو اہل علم و دانش اور طلبا کے استفادے کے لیے اب تک کوئی 'کلیدی لغت' بھی موجود نہیں ہے۔ جہاں تک وفیات نگاری کا تعلق ہے، اس سلسلے میں صرف شعرا اور ادبا ہی کیوں، اردو میں وفیات

نگاری کا عمل پایۂ تکمیل کو اس وقت پہنچ سکتا ہے جب کم سے کم 632 عیسوی سے 2016 تک کی شخصیات (انسانی سماج کے جملہ شعبہ جات سے متعلق اہم افراد) کا مکمل احاطہ کیا جائے۔ یہ کام اس قدر علمی ہے کہ اسے کثیر الجہات تاریخی علوم کے ماہرین ہی انجام دے سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دائرۃ المعارفی کام ایک ادارے کی سرپرستی میں لائق و فائق ٹیم ہی انجام دے سکتی ہے۔ ایک شخصیت کے بارے میں جامع الفاظ میں معلومات جمع کرنے کا خاکہ اس طرح ہوسکتا ہے: تاریخ پیدائش (مقام)، تاریخ وفات (مقام)، دو تعارفی جملے، دو سطروں میں اہم کام یا کارنامے۔ 632 سے 2016 تک شخصیات پر مشتمل اس طرح کے انسائیکلوپیڈیا کی اشاعت یقینی طور پر ایک علمی و تاریخی کارنامہ ہی نہیں خیال کیا جائے گا بلکہ موجودہ اور آئندہ نسل پر عظیم احسان ہوگا۔ (اداریہ 'اردو بک ریویو')

❖ **عارف اقبال**: نئی دہلی: اکتوبر تا دسمبر 2016

'اردو دنیا' دسمبر 2016 کا شمارہ پیشِ نظر ہے۔ شمارہ وفیات نگاری پر مشتمل ہے اور واقعی لکھنے والوں اور کونسل نے حق ادا کر دیا ہے۔ ادب کے دور افتادہ علاقوں میں بسنے والے ہم جیسے چھوٹے لوگ تو بس اتنا جانتے تھے کہ اردو کا بڑا ادیب مرتا ہے اور امر ہو جاتا ہے مگر موجودہ شمارے سے کئی ایسے اجنبی لکھنے والوں کے بارے میں پتہ چلا جن کے بارے میں کوئی صحیح معلومات حاصل نہیں تھی۔ خاص کر محترمہ فاطمہ جائسی، منظر شہاب، سجاد بخاری، اثر بیاولی، نظمی سکندر آبادی وغیرہ جیسے کئی قابلِ ذکر فنکار اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ خدا مغفرت کرے۔

نیز مکرمی ڈاکٹر شمس بدایونی صاحب کا مقالہ بہت ہی پر مغز ہے۔ اس موضوع پر موصوف نے عمدہ مواد پیش کیا ہے لیکن دسویں صدی ہجری کی تاریخ النور السافر جو زبانِ عربی میں ابوبکر عبدالقادر العیدروس الحضرمی کی کتاب ہے جس میں 901ھ سے 1000ھ کے درمیان وفات پانے والے مشاہیر کا تذکرہ ہے جس کا اردو میں ترجمہ ڈاکٹر محمد عارف الدین شاہ فاروقی نے کیا ہے اور گجرات اردو اکادمی سے شائع ہوا ہے۔ اس کا ذکر بھی اس متذکرہ مقالے میں ہوتا تو مقالے کی جامعیت میں مزید اضافہ ہو جاتا۔

❖ **پروفیسر بامبے والا محی الدین جی**: احمد آباد

زیرِ نظر شمارے کے اداریہ 'ہماری بات' میں پروفیسر ارتضیٰ کریم نے بڑی دردمندی اور رقت کے ساتھ 2016 کی آفتاب و ماہتاب ہستیوں کی وفات پر ایک دل دوز نقشہ کھینچا ہے اور ان تمام ہستیوں کے نام جیسے انتظار حسین، ندا فاضلی، اسلوب احمد انصاری، اسلم فرخی، عابد سہیل، انور سدید، جوگندر پال، شکیل الرحمٰن، سید و جعفر، خلیق انجم، پیغام آفاقی، شمیم نکہت، راشد آذر اور منظر شہاب اور اسی ماہ دسمبر میں ادب کے ایک اور بڑے ستون شہنشاہ گیت حضرت بیکل اتساہی اور انھوں نے فراموش کار عہد کا المیہ بیان کرتے ہوئے جن جملوں کو اپنے اداریے کا ماخذ و منبع بنایا ہے انھیں پڑھتے ہوئے آنکھیں نم ہو جاتی ہیں اس شعر کے ساتھ موصوف نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے:

زندگی جن کے تصور سے جلا پاتی تھی
ہائے کیا لوگ تھے جو دامِ اجل میں آئے

مجھے تو اس ضمن میں عزیز قیسی کا ایک شعر یاد آ رہا ہے:

مر جاؤ کوئی نام و نسب پوچھتا نہیں
مردوں کے سلسلے میں بڑا مہرباں ہے شہر

بقول ارتضیٰ کریم ہماری ادبی دنیا میں ایسی بہت سی اہم شخصیتیں ہیں جن کی موت کی خبریں بھی اخبارات کے صفحات پر جگہ نہیں پاتیں ان کا یہ امر قابل تحسین و مبارکباد ہے کہ انھوں نے دسمبر کے شمارے کو رفتگاں میں تعزیتی تحریروں کی صورت ایک ان مٹ دستاویز بنا کر مصحفِ شعر و ادب میں محفوظ کر دیا ہے۔ یقیناً دورِ آئندہ کا قاری انھیں پڑھ کر کارزار رفتگاں میں اپنی تخلیقات و تصنیفات کے گل بوٹے بکھیرنے والے ان نامور مرحومین کو زندہ و تابندہ کر دے گا۔ ڈاکٹر حیات افتخار نے مرحوم سجاد بخاری کے تعلق سے بہت جامع اور موثر مضمون پیش کیا ہے۔ حضرت شمس بدایونی کا مضمون بھی ہمارے معلوماتی ذخیرے میں اضافے کا باعث ہے۔ محمد شرافت علی کا مضمون 'اردو کا محبوب مدیر محبوب الرحمٰن فاروقی' پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی۔ موصوف نے ایک فراموش شدہ عظیم شخصیت پر قلم اٹھا کر ماہ نامہ 'آجکل' کو ایک نئی زندگی دینے والے ایمان دار اور دیانت دار مدیر کی یاد کو تازگی بخشی ہے۔

◆ **علیم صبا نویدی**: رائس منڈی اسٹریٹ، چنئی، تمل ناڈو

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا حالیہ شمارہ بابت دسمبر 2016 نظر نواز ہوا۔ آپ نے اس شمارے کو یاد رفتگاں کے نام مختص کر کے نہایت ہی مستحسن قدم اٹھایا ہے۔ آپ نے مرحومین کی تصاویر ٹائٹل صفحے پر اور ان کے متعلق مضامین کے ساتھ نہایت ہی اہتمام کے ساتھ شائع کیے ہیں جو آپ کی ادارتی صلاحیتوں کے غماز ہونے کے ساتھ آپ کی ادارتی ٹیم کے اراکین کی دلچسپی اور لگن کا بھی ثبوت ہیں۔ آپ نے 'ہماری بات' میں لکھا ہے کہ ہماری ادبی دنیا میں بہت سی شخصیتیں ایسی ہیں جن کی موت کی خبر بھی اخبارات کے صفحوں میں جگہ نہیں پائی'' آپ کی باریک بینی کی داد دینی چاہیے۔ ایسی صورت حال میں جب مرحومین کو خراج عقیدت کے طور پر جو مضامین لکھے جاتے ہیں ان میں بطور خاص اس بات کا خیال رکھا جانا چاہیے کہ مرحوم کی تاریخ یا سنہ پیدائش اور تاریخ وفات کی نشاندہی کر دی جائے۔ اس شمارے کے بعض مضامین میں یہ سہو نمایاں ہے۔

◆ **ڈاکٹر حیات افتخار**: مکان نمبر 80، چولے میڈ، چنئی

ماہِ دسمبر 2016 کا شمارہ نظر نواز ہوا جہاں گزرے ہوئے لوگوں کی خدمات اور کاموں سے واقفیت ہوئی وہیں یہ احساس بھی ہوا کہ قصباتی زندگی سے تعلق رکھنے والے ادیب و شعرا نمایاں خدمات انجام دینے کے باوجود اردو دنیا ان سے ناواقف رہتی ہے خود مدیر محترم نے اس کا اظہار کیا ہے کیا کیا جائے لکھنے پڑھنے والوں کی نگاہ اپنے اطراف و جوانب ہی پر مرکوز رہتی ہے پورے ہندوستان کا یہی المیہ ہے قصباتی سطح پر بے شمار ایسے لوگ ہیں جن کی فکر، خیال، زبان، اسلوب بڑا رچا اور سجا ہوتا ہے ان کے کاموں کا ایک حصہ یقینی طور پر ایسا ہے جسے اسی سطح پر رکھا جا سکتا ہے جو شہر میں رہنے والے ادیبوں اور شاعروں کے کام کے ذیل میں آتا ہے مگر افسوس ہے ان پر نہ لکھنے والے ملتے ہیں اور نہ ان کے کاموں کو سراہنے والے تاجدار تاج دیوبند کے رہنے والے تھے ان کے تین مجموعے منظر عام پر آئے شمارے میں شامل اشتیاق صاحب کا مضمون تاجدار تاج کی شخصیت اور ان کے فن پر مکمل گفتگو کے ذیل میں نہیں آتا عجیب بات ہے کہ صاحب مضمون نے تاجدار صاحب کی شاعری کو صرف فلمی گانوں تک محدود رکھا ان کے کلام پر کچھ لکھنے کی کوشش نہیں کی۔ ضروری تھا کہ وہ ان کے مجموعہ ہائے کلام پر مؤثر اور باوزن انداز میں روشنی ڈالتے تاکہ اردو دنیا کے قارئین تاجدار تاج سے مکمل واقفیت حاصل کرتے یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اردو دنیا کا ہر شمارہ ایک نئی جہت اور سمت کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور یقینی طور پر اس میں آپ کی محنتوں اور انتخاب کو بنیادی حیثیت حاصل ہے کامیاب تخلیقات کی شمولیت کے لیے دلی مبارکباد۔

◆ **نسیم اختر شاہ قیصر**: شاہ منزل، محلہ خانقاہ، دیوبند، یوپی

'اردو دنیا' دسمبر ماہ کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ مجھے بہت پسند آیا۔ سرورق پر لکھا ہوا ہے ''ہم اپنے رفتگاں کو یاد رکھنا چاہتے ہیں'' رواں سال میں جو ادبا و شعرا ہم سے جدا ہو گئے ان تمام مرحومین کی تصاویر دیکھ کر آنکھیں نم تھیں اور ابھی تک یہ سلسلہ رکا بھی نہیں تھا کہ خبر آئی بیکل اتساہی ہم سے جدا ہو گئے۔ ہماری بات میں پروفیسر ارتضیٰ کریم صاحب کا اداریہ اردو وفیات نگاری کی اہمیت و افادیت کی روایت کو جہاں نہ صرف اجاگر کرتا ہے بلکہ یادرفتگاں کے اس شمارے کی پیش کش میں ہمارے قلم کاروں کے کارہائے نمایاں کو بخوبی ظاہر بھی کرتا ہے اور میری نظر میں آپ کی یہ کوشش اپنے مرحومین کو بہترین خراج عقیدت ہے۔ آپ کا درد بجا ہے کہ ''اس فراموش کاری کے دور میں بڑی بڑی شخصیتوں کو بھول جانا معاشرے کا ایک اجتماعی المیہ بن گیا ہے اور آج یہ اہم ذمے داری ان باشعور اور بالغ نظر افراد کی ہے جو صارفی معاشرے میں بھی روحانی اقدار سے اپنا رشتہ جوڑے ہوئے ہیں۔'' آپ نے شمس بدایونی کا مضمون 'ہند و پاک میں اردو وفیات نگاری کی روایت' شامل کر کے مجھ جیسے ادب کے طالب علم پر بڑا احسان کیا۔ یقیناً مستقبل میں بھی اردو کے مورخین و محققین وفیات نگاری کی اہمیت و معنویت کو نظر انداز نہیں کریں گے۔ دیگر مشمولات میں اظہر ابرار کا مضمون 'خوشبو جیسی شخصیت شمیم نکہت' تحریر کر کے انھوں نے واقعی مرحومہ شمیم نکہت کو بہترین خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ محمد شرافت علی، قدوس جاوید، حبیب نثار، ارمان نجمی، مظفر حسین سید اور دیگر تمام قلم کاروں نے بہترین انداز میں اردو زبان و ادب کی ان مرحومین کی شخصیت و فن پر سیر حاصل گفتگو کی جو رواں سال میں ہم سے دور چلے گئے، اور ان کی زندگیوں کے مخفی گوشوں کو بھی بخوبی اجاگر کیا۔ یقیناً یہ مجلّہ ان تمام ادبا و شعرائے کرام کی یادوں کا حسین گلدستہ ہے۔

◆ **احمد سیف سید آصف رضا**: کامٹی کول مائنس (کھدان)

'اردو دنیا' دسمبر 2016 کا شمارہ موصول ہوا۔ رواں سال میں ہم سے جدا ہو چکے قلم کاروں کی خلش ہمیشہ باقی رہے گی اللہ رب العزت انھیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ اداریے میں شامل 'ہماری بات' میں آپ نے وفیات نگاری کی اہمیت و معنویت کو اجاگر کرنے کے لیے شمس بدایونی کے مضمون کو شامل کیا یقیناً اردو میں وفیات نگاری کی اہمیت کو مزید سمجھنے کے لیے یہ مضمون بڑا مفید ثابت ہوگا۔

◆ **ڈاکٹر اظہر ابرار**: اسسٹنٹ پروفیسر ایس کے پورول کالج کامٹی

قومی اردو کونسل کی مطبوعات نمبر

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا ایک شمارہ قومی اردو کونسل کی مطبوعات کے تعارف اور جائزے پر محیط ہوگا۔ اس خصوصی شمارے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی سے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا، لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس تکنیک و جغرافیہ، سماجیات، سیاسیات، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، قانون، فنون لطیفہ، کتب خانہ داری و کتابیات، معاشیات/تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب، تراجم اور دیگر موضوعات پر شائع ہونے والی کتابوں پر تبصروں کے علاوہ قومی اردو کونسل کی اشاعتی خدمات اور اشاعتی منصوبوں کی تفصیلات بھی درج ہوں گی۔

شعیب رضا فاطمی

قومی اردو کونسل کا 20 واں کتاب میلہ

20 ویں کل ہند اردو کتاب میلہ بھیونڈی 17 تا 25 دسمبر کا اختتام ہو چکا ہے۔ کوکن مسلم ایجوکیشن سوسائٹی کے زیر انتظام چلنے والے رئیس ہائی اسکول اور جونیئر کالج کا میدان بیوہ کی مانگ کی طرح سنسان پڑا ہے۔ ساتھ ہی حسرت کی آماجگاہ ہے جی ایم کالج آڈیٹوریم اور اردو بسیرا آڈیٹوریم بھی جہاں ان 9 دنوں میں کم و بیش 25 ثقافتی و ادبی پروگرام منعقد ہوئے۔ یہ سچ ہے کہ ''جشن کے بعد کا سناٹا بہت کھلتا ہے'' لیکن بعض جشن ایسے بھی ہوتے ہیں جو بظاہر ختم ہو جاتے ہیں لیکن اس کے اثرات دور رس ہوتے ہیں۔ قومی کونسل کا اردو میلہ'' ایک ایسا ہی جشن ہے جس کے آغاز کو 16 برس کا عرصہ ہوا اور بقول پروفیسر ارتضیٰ کریم یہ میلہ اب عین شباب کے عالم میں ہے۔ بھیونڈی میں منعقد ہونے والے میلے کی کامیابی اس کا ثبوت بھی فراہم کرتی ہے کہ وہاں شائقین زبان و ادب نے جس طرح اردو کتابوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور محض 9 دنوں میں ایک کروڑ 12 لاکھ کی کتابیں خرید ڈالیں۔

لفظ میلہ ہمارے یہاں ہر دور میں ازدحام کے معنوں میں استعمال ہوتا آیا ہے جہاں کھانے پینے سے لے کر سیر و تفریح کے لوازمات ہوتے ہیں لیکن اس میلے کو ادبی میلے کی شکل دینا اور پھر تفریح کی جگہ کانفرنس، مذاکرے، تقریری مقابلے، غزل سرائی، ڈرامے، مشاعرے اور دیگر ڈھیر سارے ثقافتی پروگرام کے ساتھ کتابوں کی فروخت، ایک عجیب سا منظر ہوتا ہے لیکن کس قدر خوش کن۔

بھیونڈی تھانہ ضلع میں واقع ہے جو ریاست مہاراشٹر کا مغربی حصہ ہے۔ ممبئی سے 50 کیلو میٹر شمال مشرق تھانہ سے 22 کیلو میٹر شمال مشرق میں اور کلیان سے 15 کیلو میٹر کی دوری پر نیشنل ہائی وے نمبر 3 کے کنارے آباد ہے جس کے چاروں سمت کوہساروں کے سلسلے پھیلے ہوئے ہیں جن سے نکل کر کئی ندیاں بے تابانہ کٹے پھٹے اور اونچے نیچے ساحلوں سے الجھتے ہوئے آغوش سمندر میں سما جاتی ہیں۔ اس شہر کی تاریخ بہت قدیم ہے مغلوں کے دور میں اسے اسلام آباد عرف بھیونڈی کہا جاتا تھا۔ وہاں کے قدیم باشندے اسے بھیمڑی کے نام سے بھی پکارتے ہیں۔ بھیونڈی کی تاریخ کے مطابق قدیم زمانے سے ہی بھیونڈی اور عرب ممالک کے درمیان تجارتی تعلقات رہے ہیں۔ جب عرب سیاح اور عرب تاجر تجارت اور کسب معاش کے سلسلے میں کوکن اور بالخصوص سوپارہ، کلیان، تھانہ اور بھیونڈی میں بسنے لگے تو آپسی میل جول اور رشتے داریوں کی وجہ سے ایک نئی مخلوط نسل وجود میں آئی جو نوائطی کہلائی۔ ان نوائطیوں کو ہی کوکنی مسلمانوں کا مورثین اعلیٰ تصور کیا جاتا ہے۔ کوکن برادری کے لوگ ہی بھیونڈی کے اصل باشندے ہیں۔ قدیم زمانے سے ہی یہ بستی ایسی گزرگاہ تھی جو دکن اور کوکن کو ملاتی تھی جب خلجی سلطنت کی وسعت تھانہ اور بھیونڈی کی سرحدوں کو چھونے لگی تو دلی دور نہ رہی اور مہاجرین کی آمد و رفت آگرہ روڈ سے ہونے لگی۔ ان غریب الوطن مہاجرین نے 1857 کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد انگریزوں کے ظلم و استبداد کے بعد اور پھر 1864 کے بنگال اور یوپی کے قحط کے دوران معاشی بحران کے سبب جبلپور، ناگپور، شہادہ، دھولیہ، ایولہ اور مالیگاؤں کے راستے بھیونڈی اور ممبئی میں اپنی بستیاں بسالیں۔ نو وارد مہاجرین اپنے ساتھ اپنی تہذیب بھی لائے اور زبان بھی جسے کوکنی لوگوں نے بھی اپنایا اور پھر مراٹھی اور کوکنی زبان میں موجود

اردو کتابوں کی فروخت کا قومی ریکارڈ

قومی اردو کونسل کے کتاب میلوں کا حساب کتاب

	ماہ	سال	مقام	مجموعی فروخت
1	نومبر	2000	لال قلعہ، دہلی	10لاکھ روپے
2	نومبر	2001	لال قلعہ، دہلی	12لاکھ روپے
3	جنوری	2003	انجمن اسلام، صابوصدیق گراؤنڈ ممبئی، مہاراشٹر	16لاکھ روپے
4	ستمبر	2003	سری نگر، جموں کشمیر	22لاکھ روپے
5	جنوری	2004	انجمن اسلام، صابوصدیق گراؤنڈ ممبئی، مہاراشٹر	23لاکھ روپے
6	دسمبر	2004	حیدرآباد، آندھراپردیش	24لاکھ روپے
7	دسمبر	2005	لکھنؤ، اترپردیش	23لاکھ روپے
8	دسمبر	2006	کولکاتہ، مغربی بنگال	16لاکھ روپے
9	نومبر	2007	پٹنہ، بہار	14لاکھ روپے
10	جنوری	2009	ممبئی، مہاراشٹر	26لاکھ روپے
11	فروری-مارچ	2010	حیدرآباد، آندھراپردیش	52لاکھ روپے
12	مارچ	2011	جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی گراؤنڈ دہلی	15لاکھ روپے
13	جنوری	2012	انجمن اسلام، صابوصدیق گراؤنڈ ممبئی، مہاراشٹر	52.4لاکھ روپے
14	نومبر	2012	لکھنؤ، اترپردیش	25لاکھ روپے
15	ستمبر	2013	شیواجی، چھوٹا میدان، بنگلور، کرناٹک	31لاکھ روپے
16	دسمبر-جنوری	2013-14	مالیگاؤں	87لاکھ روپے
17	دسمبر-جنوری	2014-15	عام خاص میدان، اورنگ آباد	1,29,40,722 روپے
18	نومبر	2015	جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی گراؤنڈ دہلی	ایک کروڑ سے زائد
19	دسمبر	2015	قلی قطب شاہ اسٹیڈیم، حیدرآباد	
20	دسمبر	2016	رئیس ہائی اسکول، بھیونڈی، مہاراشٹر	ایک کروڑ 12 لاکھ روپے

عربی زبان نے بھی اردو کو ان کے قریب کر دیا۔

یہ تمہید اس لیے بھی ضروری تھی کہ ہم جس تاریخ ساز بھیونڈی کتاب میلے کا ذکر کرنے جا رہے ہیں اس شہر کی تاریخ پر ایک غائر نظر ڈالے بغیر آگے بڑھنا اس شہر کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ذریعے منعقد کیے جانے والے میلوں میں یہ بیسواں کتاب میلہ تھا اور ملک کی موجودہ صورت حال میں جب یہ تصور کرنا بھی محال تھا کہ بھیونڈی کتاب میلہ کامیاب ہوگا وہاں تجارت کا ایک نیا ریکارڈ قائم ہوا جو اپنے آپ میں خوش آئند تو ہے ہی مبارکباد کے مستحق ہیں اہالیان بھیونڈی ممبرا، نالہ سوپارہ اور گردونواح کے تمام محبان اردو، یوں تو اس میلے کی تیاری کئی مہینوں سے کی جا رہی تھی اور رئیس ہائی اسکول کی پوری انتظامیہ سمیت بھیونڈی کے تمام اردو اسکول کا عملہ اردو انجمن، اخبارات و رسائل کے نمائندگان، سماجی و سیاسی کارکنان اور عام عوام لیکن ان سب کو اردو زبان اور اس کے فروغ کے لیے باہم شیر و شکر کرنے والا ایک نوجوان بھلائے نہیں بھولتا جسے لوگ امتیاز خلیل کہتے ہیں۔ امتیاز خلیل کا تعلق مالیگاؤں سے ہے اور اس سے قبل مالیگاؤں کتاب میلے میں بھی اس نوجوان کی کارکردگی قابل داد تھی لیکن اس میلے میں جس طرح امتیاز خلیل نے قومی کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضی کریم کا اعتماد حاصل کیا اور پھر ریسرچ آفیسر و شعبہ فروخت کے انچارج شاہنواز خرم کو ساتھ لے کر کوکن مسلم ایجوکیشن سوسائٹی کے صدر اسلم فقیہ سے گفت و شنید کے بعد ایک ایسا جامع پروگرام ترتیب دیا جس پلان کو نوٹوں کا بحران بھی گزند نہ پہنچا سکا۔

بات طویل ہو جائے گی اگر میں میلے سے قبل کے ان تین مہینوں کا ذکر کروں جس میں بیداری مہم کے تحت 50 سے زیادہ میٹنگ، نکڑ ناٹک اور جلوس نکالے گئے۔ سیکڑوں ہورڈنگ کی روداد شائع ہوتی رہی اور بالآخر اس ہدف کو حاصل کر لیا گیا جس کا عہد پہلی میٹنگ میں جناب اسلم فقیہ اور ان کے رفقاء نے کیا تھا۔

میں یہاں اگر یہ ذکر نہ کروں تو بددیانتی ہوگی کہ میلے کی تاریخ طے ہونے سے قبل پارلیامنٹ میں ہمارے وزیر محترم پرکاش جاوڈیکر نے ایک سوال کے جواب میں قومی کونسل کی کارکردگی پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ اعلان کر دیا تھا کہ 2016 کا کتاب میلہ مہاراشٹر میں ہوگا اور اس میلے میں نہ صرف میں شریک رہوں گا بلکہ معزز ممبران پارلیامنٹ سے بھی گزارش ہے کہ وہ اس میلے میں تشریف لا کر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی عملی کارکردگی

ملاحظہ فرمائیں۔ یہ اس کامیاب میلے کا آغاز تھا اور اب باری تھی قومی کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم کی کہ وہ ایک ایسی جگہ کا انتخاب کریں جہاں میلہ کامیاب ہو بہر حال یہ مرحلہ بھی ختم ہوا لیکن جب سب کچھ ہو گیا، تاریخ کا اعلان بھی ہو گیا وزیر محترم نے افتتاح کرنے کا وعدہ بھی کر لیا کہ 8 نومبر کو رات آٹھ بجے وزیر اعظم نے پرانے نوٹوں کو نئے نوٹ سے بدلنے کا اعلان کر دیا۔ نوٹوں کے اس بحران میں کاروباری نوعیت کے کسی ایسے اجتماع کا کامیاب ہونا جس میں ملک کے دور دراز علاقوں سے پبلشرز کو کتابیں لے کر بھیونڈی پہنچنا تھا۔ تقریباً طے ہو چکا تھا کہ اب یہ میلہ اپنی مقررہ تاریخوں میں نہیں ہوگا۔ لیکن شکوک وشبہات کے اس اندھیرے کو چاک کیا قومی کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اور منتظمین میلہ کو دوٹوک لفظ میں کہہ دیا کہ یہ کتاب میلہ مقررہ تاریخوں میں ہی منعقد کیا جائے گا اور انشاء اللہ کامیاب بھی ہوگا۔ ڈائرکٹر کے اس پر اعتماد فیصلے نے تمام کارکنان میں ایک جوش بھر دیا اور وہ کارواں جو تذبذب کا شکار ہو رہا تھا پھر چل پڑا۔

کتاب میلے کا افتتاح 17 دسمبر کو طے تھا جو وزیر محترم پرکاش جاوڈیکر کو کرنا تھا۔ ڈائرکٹر 15 دسمبر کو ہی بھیونڈی آگئے اور تمام تیاریوں کا جائزہ لے کر 16 جنوری کو 2 بجے ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کا یہ بیسواں کل ہند اردو کتاب میلہ 17 تا 25 دسمبر کوکن مسلم ایجوکیشن سوسائٹی بھیونڈی کے اشتراک سے رئیس ہائی اسکول کے میدان میں منعقد ہوگا۔ جس میں ملک کے نامور ناشرین ہزاروں موضوعات پر لاکھوں کتابوں کے ساتھ موجود ہوں گے۔ میلے کا افتتاح مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل پرکاش جاوڈیکر کے ہاتھوں ہوگا۔ افتتاحی پروگرام کا آغاز صلاح الدین ایوبی جونیئر کالج کے کیمپس میں ہوگا جہاں سے کاروان اردو کو وزیر محترم ہری جھنڈی دکھا کر روانہ کریں گے اس جلوس میں بھیونڈی اور اطراف کے اسکولوں کے طلبہ و طالبات ہوں گے کارواں کے آگے ہمارے مشاہیر اردو ادیبوں وشعرا کے کٹ آؤٹس سے مزین بگھیاں ہوں گی جو ساڑھے تین کیلو میٹر کا سفر طے کر کے رئیس ہائی اسکول کے احاطے میں پہنچیں گی اور یہاں وزیر محترم کے ساتھ مقامی ممبر آف پارلیامنٹ کپل پاٹل ایم ایل اے روپیش مہاترے، مہیش چوگلے، اسلم فقیہہ ساڑھے گیارہ بجے میلے کا باضابطہ افتتاح کریں گے۔ کتاب میلے کے افتتاحی پروگرام کا یہ مختصر خاکہ پیش کرتے ہوئے ڈائرکٹر قومی اردو کونسل نے صحافیوں سے اردو کونسل کے بیس سالہ سفر پر سیر حاصل گفتگو کی اور کہا کہ یہ بیس سال کا عرصہ ملک میں اردو زبان وادب کے لیے نہایت باوقار اور کثیر الحصول ثابت ہوا ہے۔

کتاب میلے کے آغاز سے ایک روز پہلے پریس کانفرنس کے بعد ڈائرکٹر قومی کونسل ممبرا کے لیے روانہ ہو گئے جہاں ممبرا کے زیادہ تر اسکولوں کے ہزاروں طلبہ کا جلوس ان کا منتظر تھا۔ بیداری مہم کے سلسلے کا یہ آخری جلوس تھا جس کے کنوینر معروف شاعر و ادیب عرفان جعفری تھے۔

یہ جلوس بھی اپنے آپ میں ایک مثال تھی ممبرا پولیس اسٹیشن سے جب جلوس آگے بڑھا تو سب سے آگے ایک کھلی جیپ پر پروفیسر ارتضیٰ کریم کے ساتھ خود عرفان جعفری اور بھیونڈی کے معروف ادیب عبد الملک مومن اور کوکن مسلم ایجوکیشن سوسائٹی کے صدر اسلم فقیہہ موجود تھے جبکہ ان کے پیچھے اسکولی بچوں کا ایک جتھا این سی سی کے ڈریس میں بینڈ بجاتا ہوا چل رہا تھا اور اس کے پیچھے اسکولی بچے اور بچیاں اپنے زرق برق لباس میں ہاتھوں میں پلے کارڈ اور تختیاں لیے اردو زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے رواں دواں تھے۔ نہایت منظم انداز میں یہ جلوس سڑک کے کنارے چلا جا رہا تھا اور ممبرا کے لوگ جگہ جگہ ان کے استقبال کے لیے کھڑے ہوئے تھے۔ عبد اللہ ریزیڈنسی وائی جنکشن کوسہ تک تقریباً دو گھنٹے کا یہ جلوس دیکھ کر ہر شخص یہ محسوس کر سکتا تھا کہ اردو کا مستقبل محفوظ ہے۔

آج 17 دسمبر ہے رئیس ہائی اسکول بھیونڈی کا

گراؤنڈ 125 کتاب کی دکانوں سے دلہن کی طرح سج گیا ہے۔ چاروں طرف لوگوں کا ازدحام ہے اور دکانوں کے سامنے کی تین ہزار کرسیاں بھر چکی ہیں ۔ کرسیوں کے سامنے کشادہ اسٹیج جس کے سامنے صوفے اور سینٹر ٹیبل جبکہ اس کے عقب میں بھی کرسیوں کی قطار۔ عوام کی بیتابی بڑھتی جا رہی ہے ۔ سارے لوگ اپنے ہر دلعزیز وزیر پرکاش جاوڈیکر کے منتظر ہیں کہ یکا یک سلطان صلاح الدین ایوبی اسکول سے نکلنے والا جلوس میلے کے ایک دروازے سے داخل ہوتا ہے اور اس کاروان اردو کا استقبال کرتے ہوئے وزیر محترم پرکاش جاوڈیکر کے ساتھ ڈائرکٹر قومی کونسل اور دیگر عمائدین شہر و مہمانان نظر آ رہے ہیں ۔ کاروانِ اردو کا قافلہ رئیس ہائی اسکول کے ایک دروازے سے داخل ہوکر پورے گراؤنڈ کا چکر لگاتے ہوئے دوسرے دروازے سے باہر جا رہا ہے جہاں ان کے لیے کولڈ ڈرنک، پانی، فروٹ وغیرہ کا خاص انتظام ہے جبکہ دوسری طرف مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل، ڈائرکٹر قومی کونسل پروفیسر ارتضیٰ کریم، مقامی ممبر آف پارلیامنٹ کپل پاٹل، ایم ایل اے روپیش مہاترے، مہیش چوگلے میلے کا فیتہ کاٹنے میں وزیر موصوف کی مدد کر رہے ہیں۔ تالیوں کی گڑگڑاہٹ کے درمیان یہ کام بھی انجام کو پہنچا اور پھر وزیر موصوف میلے میں داخل ہوئے اور پہلے رو کے پہلے اسٹال، جو قومی کونسل کا اسٹال تھا، سے ہوتے ہوئے کئی دکانوں کا سرسری جائزہ لیا اور پھر اسٹیج کی طرف بڑھ گئے جہاں ان کے استقبال میں اسکولی بچیوں نے استقبالیہ گیت اور ترانہ ہندی پیش کیے۔ ایک نہایت پروقار افتتاحیہ جلسے کا آغاز ہو چکا تھا۔ رئیس ہائی اسکول کا تاریخی احاطہ جہاں 1948 میں ترقی پسند مصنفین کی ''بھیمڑی کانفرنس'' کا انعقاد ہوا تھا آج پھر ایک تاریخ ساز

کتابیں ہی آدمی کو انسان بناتی ہیں تعلیم کے بغیر دنیا میں کچھ بھی نہیں۔ آپ زیادہ سے زیادہ کتابیں خریدیں اور زیادہ سے زیادہ پڑھیں یہی ہماری خواہش ہے۔ اردو بڑی ہی پیاری اور میٹھی زبان ہے اور ہر شخص اس سے محبت کرتا ہے۔

اردو کتاب میلے کے انعقاد کا سہرا اپنے سر پر باندھے جانے کا منظر دیکھ رہا تھا۔ اردو کی قدیم بستیوں سے دور کوکن کے علاقے میں اردو کے شیدائیوں کا یہ ہجوم اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ اس زبان کے بڑھنے، پھلنے اور پھولنے کے راستے کبھی مسدود نہیں ہوئے اور نہ یہ زبان کبھی محدود علاقے میں محصور ہوئی۔ اسٹیج پر تقاریر سے قبل وزیر محترم کی خدمت میں گلدستہ، دوشالہ اور مومنٹو وغیرہ پیش کیے جا رہے ہیں۔ اس تاریخی موقع پر وزیر محترم نے قومی کونسل کا ادبی کلینڈر، 2017 معروف ،ڈکشنری'' فرہنگِ آصفیہ'' کے جدید ایڈیشن کا سیٹ، پروفیسر ارتضیٰ کریم کی مشہور کتاب'' اردو فکشن کی تنقید''، خواجہ عبدالمنتقم کی کتاب'' دستور ہند کا معمار ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر''،'' خواتین سے متعلق جنسی و دیگر جرائم'' اور '' وقف قوانین'' کے علاوہ بچوں کے لیے خاص طور پر با تصویر کہانیوں پر مشتمل تیرہ کتابوں کے سیٹ کا اجرا کیا۔ بعد از آں اپنے خطبے میں پرکاش جاوڈیکر نے اپنے منفرد لب ولہجے میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ کتابیں ہی آدمی کو انسان بناتی ہیں تعلیم کے بغیر دنیا میں کچھ بھی نہیں۔ آپ زیادہ سے زیادہ کتابیں خریدیں اور زیادہ سے زیادہ پڑھیں یہی ہماری خواہش ہے۔ اردو بڑی ہی پیاری اور میٹھی زبان ہے اور ہر شخص اس سے محبت کرتا ہے۔ معروف فلمی اداکار اپنے انداز میں جب اردو کے ڈائیلاگ بولتے ہیں تو ایسا لگتا ہے ان کے منہ سے پھول جھڑ رہے ہوں۔ ابھی پروگرام کے آغاز میں اسکولی بچیوں نے جب ترانہ ہندی'' سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' جس خوبصورت اور مسحور کن انداز میں پیش کیا اس پیش کش سے یہاں موجود کوئی بھی شخص متاثر ہوئے بغیر

نہیں رہا۔ ہم ان بچیوں کو دلی مبارک باد دیتے ہیں۔ شری جاوڈیکر نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی خدمات اور کارکردگی کا مختصراً ذکر کرتے ہوئے کہا کہ کونسل اردو کے فروغ کے لیے ہمیشہ اپنے عہد کی پابند رہی ہے اور اس زبان کے فروغ کے لیے جہد مسلسل جاری رکھے ہوئے ہے۔ تاہم انھوں نے کہا کہ جہاں جہاں بھی بھاجپا کی حکومت ہے وہاں ہندو مسلم بھی یکساں طور پر تعلیم کے میدان میں مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں۔ البتہ یوپی، بہار اور بنگال جیسی ریاستوں میں تعلیمی ضرورت پر زیادہ سے زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ میں بذات خود اردو کا آن لائن کورس کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ لوگ مجھ سے اردو میں براہ راست رابطہ کرسکیں۔ قومی کونسل نے اردو کے ساتھ ساتھ فارسی اور عربی کا ڈپلوما کورس بڑے پیمانے پر شروع کیا ہے تاکہ ہمارے وہ بھارتیہ نوجوان جو ملازمت کے لیے عرب ممالک جاتے ہیں ان کے ساتھ زبان کا کوئی مسئلہ نہ رہے اور انھیں کوئی پریشانی نہ ہو۔ انھوں نے کہا کہ اردو میڈیم اسکولوں کے بطور خاص سرکاری اسکولوں کے معیار تعلیم کو بہتر بنانے کی آج سب سے زیادہ ضرورت ہے اور یہ تبھی ممکن ہوگا جب سماج کے ذمے داران تعلیم کے معاملے میں اپنی پیش رفت میں مزید تیزی لائیں۔ یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ جہاں کہیں بھی جھگی جھونپڑیوں میں رہنے والوں کو تعلیم سے آراستہ کرنے کے مقصد سے چھوٹے پیمانے پر ہی سہی اہتمام کیا گیا تو ان بچوں کا رزلٹ امید کے برخلاف زیادہ بہتر رہا۔ ہمیں ہمیشہ یہ دھیان رکھنا چاہیے کہ سماج کے تعاون کے بغیر تعلیمی ترقی نہیں ہوسکتی اور جب تک تعلیم بہتر نہیں ہوگی تو دیش بھی ترقی نہیں کرے گا۔ سماج کا ایک طبقہ تعلیم پائے گا اور دوسرا طبقہ اس سے محروم رہے گا تو اجتماعی ترقی کی امید بھی نہیں کی جاسکتی۔ ہم چاہتے ہیں کہ سب کا ساتھ ہو اور سب کا وکاس ہو۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کھلے میدان میں بیٹھے ہزاروں سامعین اور اردو سے محبت کرنے والے طلباء و طالبات اور اساتذہ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ آج کی یہ دھوپ چاندنی بن گئی ہے۔ آپ کی محبت ہمیں تقویت اور حوصلہ پہنچا رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم اردو والے یقینی طور پر خوش قسمت ہیں کہ ہمیں پرکاش جاوڈیکر جیسا مرکزی وزیر ملا ہے۔ حالیہ دنوں میں تمام زبانوں کے اخباروں نے یہ خبر شائع کی تھی کہ مرکزی وزیر برائے انسانی وسائل شری پرکاش جاوڈیکر اردو سیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کی اس خواہش نے ہمارا حوصلہ بلند کردیا ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اردو کتاب میلے کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ نوٹ بندی کی وجہ سے لوگوں کو کچھ مالی پریشانیاں ہوسکتی ہیں۔ لیکن اردو سے محبت کا جذبہ اگر اسی طرح قائم رہا تو ہمارا یقین ہے کہ کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ بھیونڈی کے مختلف بینکوں، اے ٹی ایم والوں سے جہاں مثبت صلاح مشورے ہوئے ہیں وہیں کتاب میلے میں موجود تمام پبلشروں کو سوائپ مشین رکھنے کی بھی ہدایت دی گئی ہے۔ بھیونڈی کے رکن پارلیمان شری کپل پاٹل نے اپنی مختصر تقریر میں کہا کہ ان دنوں عام طور پر یہ دیکھا جارہا ہے کہ کالج اور اسکولوں کے بچے زبان و ادب کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ کتابوں سے دور بھاگ رہے ہیں۔ کتابوں سے ملنے والی طاقت کا ان کو اندازہ نہیں۔ کتابوں کے مطالعے سے جو علم اور طاقت حاصل ہوتی ہے وہ کوئی بھی اور کیسا بھی آندھی طوفان آجائے کسی انسان سے ان کی یہ طاقت بہا کر نہیں لے جاسکتا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ بھیونڈی میں مسلم سماج کی اکثریت ہے اور انھیں قومی دھارے میں لانے کے لیے ان کی بہتر سے بہتر تعلیم بہت ضروری ہے۔ ہم سب کو اس جانب توجہ دینی چاہیے۔ قدیم تعلیمی ادارہ انجمن اسلام ممبئی کے صدر ڈاکٹر ظہیر قاضی نے برجستہ کہا کہ اردو اس ملک کی زبان ہے اور اردو تا قیامت زندہ رہے گی۔ انقلاب زندہ باد کا نعرہ بھی اسی اردو کی دین ہے اور لوگوں کو یاد ہوگا کہ خلا میں پرواز کرتے وقت جب وزیر اعظم اندرا گاندھی نے راکیش شرما سے پوچھا کہ ہندوستان کیسا لگ رہا ہے تو اس کا جواب تھا "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا"۔ انھوں نے کہا کہ اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کرکے بہت

سارے لوگوں نے بڑے بڑے اور باوقار عہدے پائے ہیں اور انھیں بھارت رتن کا اعزاز بھی دیا گیا ہے۔ اسی شہر بھیونڈی کے داماد بیرسٹر عبدالرحمن انتولے اس ریاست کے وزیر اعلیٰ رہے اور مرکزی وزیر بھی۔ جناب اسلم پٹھان اور معروف اداکار دلیپ کمار بھی انجمن اسلام اسکول میں اردو میڈیم کے طالب علم رہے ہیں جنھیں حالیہ دنوں وزیر داخلہ نے ان کے گھر جا کر بھارت رتن کا اعزاز سونپا۔ اردو گنگا جمنی اور دلوں کو جوڑنے والی زبان ہے اور یہ سب کی زبان ہے جو اپنی شیرینی کی بدولت سب کے دل جیت لیتی ہے۔ سماج وادی پارٹی کے صدر اور رکن اسمبلی مہاراشٹر شری ابو عاصم اعظمی نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ سکتی بلکتی بھیونڈی میں آپ کا استقبال ہے اور کسمپرسی کے ان حالات میں اردو کتاب میلے کے انعقاد پر ہم اہالیان بھیونڈی کو مبارک دیتے ہیں۔ انھوں نے جاوڈیکر صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ہم آپ کا بہت احترام کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ ایک ایسی پالیسی تیار کریں تاکہ اردو اور اردو والوں سے تعصب کا سلسلہ بند ہو جائے۔ اعظم کیمپس پونے کے روح رواں شری پی اے انعام دار اور کوکن مسلم ایجوکیشن سوسائٹی کے صدر اسلم فقیہ نے بھی حاضرین سے خطاب کیا۔ اسٹیج پر دیگر مہمانوں کے ساتھ رکن اسمبلی مہیش چوگھلے، بھیونڈی بی جے پی کے صدر سنتوش شیٹی، بھیونڈی کانگریس کے صدر شعیب گڈو، سماج وادی پارٹی کے صدر عبدالسلام نعمانی، وسئی ویرار مہانگر پالیکا کے اولین ڈپٹی میئر صغیر ڈانگے، انجینئر وراج کامنکر، تھانے ضلع پریشد کے سابق نائب صدر عرفان محمد حسین بھورے، شجاع الدین انصاری، روزنامہ اردو ٹائمز کے مالک و مدیر سعید احمد، روزنامہ ہندوستان کے مدیر سرفراز آرزو، ڈاکٹر محمد علی پاٹنکر، منور پیر بھائی، ممتاز پیر بھائی، شفیع مقری، پرنسپل ضیاء الرحمن انصاری، عبدالعزیز انصاری اور عامر صدیقی وغیرہ موجود تھے۔ ابتدا میں نظامت کی ذمے داری مخلص مدعو نے ادا کی جبکہ پروگرام کے بقیہ حصے کی نظامت امتیاز خلیل نے انجام دی۔ راشٹر یہ گیت کے ساتھ ہی اس افتتاحی پروگرام کے اختتام کا اعلان ہوا۔

بہر حال 17 تاریخ کے افتتاحی پروگرام کی خبریں 18 تاریخ کے اخبارات میں شائع ہوئیں جس میں افتتاحی جلسے کو نہایت باوقار اور 'کتاب میلہ کا شاندار افتتاح' قرار دیا گیا۔ اس کے بعد کتاب میلے میں ہر روز 3 ثقافتی پروگرام 10 بجے تا ایک بجے پھر ڈھائی بجے سے 4.30 اور آخری پروگرام 6 بجے شام سے رات کے دس بجے تک منعقد ہوتے رہے۔ پہلے کے دونوں پروگرام جی ایم مومن ویمنس کالج کے ہال میں یا پھر 'اردو بسیرا' کے خوبصورت آڈیٹوریم میں منعقد ہوتے تھے۔ جبکہ شام 6 بجے رئیس ہائی اسکول کے گراؤنڈ کے بڑے اسٹیج پر پروگرام کا انعقاد کیا جاتا تھا۔

اس سلسلے میں 17 تا 25 دسمبر تقریباً 25 پروگرام کا انعقاد ہوا جس میں ڈرامہ، غزل سرائی، تمثیلی مشاعرہ، بیت بازی، مشاعرے، محفل افسانہ، ادبی چوپال الاؤ، کے علاوہ اہم موضوعات پر سیمینار، سمپوزیم اور مذاکرے بھی ہوئے۔ جس میں اردو ذریعہ تعلیم مسائل اور حل، سول سروس گائیڈنس، اردو ادب کے فروغ میں بھیونڈی، ممبرا اور میرا روڈ کی خدمات، یاد رفتگاں، آل مہاراشٹر تقریری مقابلہ، اردو اور انفارمیشن ٹکنالوجی، میونسپل اردو اسکولوں کا مقابلۂ تقریر۔ مقابلۂ حمد خوانی، شام نسواں، ایک شام محنت کشوں کے نام جیسے بے حد کامیاب اور سودمند پروگرام بھی منعقد کیے گئے۔

اس کتاب میلے میں ہر روز عوام کی دلچسپی گذشتہ دن سے زیادہ نظر آئی۔ کتابوں کی خریداری بھی توقع سے زیادہ تھی آخری دن تقریباً 34 لاکھ کی کتابیں فروخت ہوئیں اور یہ وہ دن تھا جب قومی کونسل کے ذریعے منعقد ابھی تک کی خریداری کے سارے ریکارڈ ٹوٹ گئے اور ایک نیا ریکارڈ بنا ایک کروڑ بارہ لاکھ کا۔

اس کتاب میلے نے یہ بھی ثابت کیا کہ کتابیں آج بھی پڑھی جا رہی ہیں۔ شائقین کتب آج بھی موجود ہیں یہ بات ضرور ہے کہ ہم جہاں انھیں تلاش کر رہے ہیں وہاں نہیں ہیں۔ اب اردو زبان نے اپنے مراکز تبدیل کر لیے ہیں اور وہاں وہ بے حد خوش و خرم پھل پھول رہی ہے۔

Mr. Shoaib Raza Fatmi
Mob.:9968778671

عالمی کتاب میلے میں کل ہند مشاعرہ کا انعقاد

ادارہ

نئی دهلی: پرگتی میدان میں منعقدہ عالمی کتاب میلہ میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام ایک شاندار کل ہند مشاعرے کا اہتمام ہنس دھونی اوپن تھیٹر میں کیا گیا، جس میں ملک کے طول وعرض سے شعرا کرام تشریف لائے۔ مشاعرے کے آغاز سے پہلے کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضی کریم نے تمام شعرائے کرام کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ انھوں نے اس موقعے پر آج کے بدلتے تناظر میں عالمی کتاب میلہ بالخصوص کتابوں کی افادیت پر سیر حاصل گفتگو کی۔ انھوں نے NBT کے ڈائرکٹر کا بھی شکریہ ادا کیا اور ان کی جانب سے بھی مہمانان اور شعرائے کرام کا استقبال کیا۔ مشاعرے کی صدارت ایڈوکیٹ اور معروف شاعرہ محترمہ مینا خان نے کی، جب کہ نظامت کے فرائض معین شاداب نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ معروف شاعر اقبال اشہر نے اپنی مشہور زمانہ نظم اردو سنائی۔ ڈائرکٹر پروفیسر ارتضی کریم کے شکریے پر مشاعرہ اپنے اختتام کو پہنچا۔ پیش ہے مشاعرے میں پڑھے گئے کچھ منتخب اشعار:

روشنی کے شہروں میں روشنی نہیں ملتی
یوں تو لوگ زندہ ہیں زندگی نہیں ملتی
کائنات میں یوں تو ہر شئے میسر ہے
جس کی آرزو کیجیے بس وہی نہیں ملتی

(ایم آر قاسمی)

آیت عشق روانی میں پڑھی جاتی ہے
یہ دعا صرف جوانی میں پڑھی جاتی ہے
تری آنکھوں کی سرخی بھی عجیب سرخی ہے
ایسی تحریر تو پانی میں پڑھی جاتی ہے

(اتش عباس)

ایک مدت بھی ترے واسطے پل ہو جاتی
مری مشکل ترے دیدار سے حل ہو جاتی

(کاشف رضا)

تقسیم مفت ہوتی ہے اردو کی ہر کتاب
دیوانہ ہے جو کہتا ہے دیوان بک گیا
دیوان اپنا بک نہ سکا ایک بھی مگر
گھر کا تمام قیمتی سامان بک گیا

(احمد علوی)

وہ یقیناً شباب جیسا تھا
سراپا گلاب جیسا تھا
اب اندھیروں میں گھر گیا حسنین
جو وطن آفتاب جیسا تھا

(حسنین دلکش)

گونگی بہری سی منزلیں ابھریں
جب بھی اندھوں نے رہنمائی کی
سارے الزام اسی پر آئے حنیف
جس نے دنیا میں بھلائی کی

(ڈاکٹر حنیف ترین)

اسی کو حق وہ یہاں پہ غزل سرائی کا
جو لکھ کر لاتے ہیں اردو زبان کاغذ پر
شبنمی لہجہ میرے کام آ گیا
آگ تو لوگوں نے بھڑکائی بہت

(انور غازی آبادی)

حرمت الفاظ سے پیہم وضو کرتا رہا
میں کتابوں سے ہمیشہ گفتگو کرتا رہا

(شمس رمزی)

آواز حق پہ ہم نے جو لبیک کہہ دیا
آنکھوں میں خار بن کے چبھتے جا رہے ہیں ہم

(امیر امروہوی)

پھول سے نازک کہا جاتا ہے بیٹی کو مگر
ہم غریبوں کے لیے پتھر سے بھی بھاری ہوئی

(دانش ایوبی)

دل کو ہم نے دل رکھا پتھر نہیں ہونے دیا
اس زمیں کو آج تک بنجر نہیں ہونے دیا

(شاداں کرتپوری)

میری نگاہ بدن پر ٹھہر گئی ورنہ
وہ اپنی روح میرے نام کرنے والا تھا

(مکیش امروہوی)

کوئی تذلیل کرتا ہے تو اس سے دکھ تو ہوتا ہے
مگر ایک فائدہ بھی ہے تکبر ٹوٹ جاتا ہے

(معین شاداب)

صحیح کو چھوڑ مت دینا غلط کو مان مت لینا
کسی انسان کی دھوکے سے ہرگز جان مت لینا

(شکیل سکندرآبادی)

سندیش ہمارا یہی اپدیش ہمارا
ایک سورگ کی تصویر بنے دیش ہمارا

(نزہت نگار)

امیروں کی تو چاندی کٹ رہی ہے
قطاروں میں تو ہماری کٹ رہی ہے
تصور میں ہے اس کے اتنی گرمی
کہ ایک چادر میں سردی کٹ رہی ہے

(ملک زادہ جاوید)

بہار آئی تو طرز ادا بدلنے لگے
گلوں کو دیکھیے اپنی قبا بدلنے لگے
چراغ میرے بجھا تو رہے اے لوگو
ذرا بتاؤ اگر یہ ہوا بدلنے لگے

(ماجد دیوبندی)

نفرتوں کی راہ سے اب لوٹ آنا چاہیے
پیار کی شمعیں اندھیروں میں جلانا چاہیے
کر سکیں اپنے بزرگوں سے مہذب گفتگو
اپنے بچوں کو ہمیں اردو پڑھانا چاہیے

(ملک نسیم)

راہ دیکھیں گے تیری چاہے زمانے لگ جائیں
یا تو آجائے تو یا ہم ہی ٹھکانے لگ جائیں

(عرفان جعفری)

ہر کسی نے دیکھی ہے روشنی چراغوں کی
کاش دیکھتا کوئی تیرگی چراغوں کی

(ایڈوکیٹ مینا خان)

شاعرات کا مشاعرہ

نئی دھلی: پرگتی میدان میں منعقدہ عالمی کتاب میلہ میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام ایک خوبصورت کل ہند مشاعرہ کا انعقاد ہال نمبر 7 کے تھیم پویلین میں کیا گیا، جس میں قومی سطح کی شاعرات نے شرکت کی اور اپنے کلام پیش کیے۔ اس موقع پر کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضی نے تمام شاعرات اور سامعین کا استقبال کیا اور کہا کہ آج قومی اردو کونسل نے یہ خوبصورت کہکشاں سجائی ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا جب شاعرات دوسرے ناموں سے شاعری کرتی تھیں لیکن آج کے بدلتے حالات میں اردو شاعری ہو یا نثر نگاری خواتین

نے اپنی ایک مستحکم شناخت بنائی ہے۔ اس مشاعرہ کی صدارت بنگلور سے تشریف لائیں محترمہ شائستہ یوسف نے کی جب کہ نظامت کے فرائض انتہائی خوش اسلوبی کے ساتھ جناب شعیب رضا فاطمی نے انجام دیے۔ ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم کے شکریے پر مشاعرہ اختتام کو پہنچا۔ پیش ہے مشاعرے میں پڑھے گئے کچھ منتخب اشعار:

تیرا خیال میری انجمن میں رہتا ہے
عجیب پھول ہے تنہا چمن میں رہتا ہے
میں اس سے دور بھی جاؤں تو کس طرح جاؤں
وہ عطر بن کے میرے پیرہن میں رہتا ہے
مانگے جاؤں تو اب تک مری چوکھٹ پہ وسیم
میری ہی شکل کی ایک لڑکی کھڑی ملتی ہے

(ڈاکٹر وسیم راشد، دہلی)

کام سب شاہکار کرتے ہیں
زخم نذر بہار کرتے ہیں
جانتے ہیں کہ قتل ہوں گے مگر
ذکر حق بار بار کرتے ہیں

(غزال ضیغم لکھنؤ)

ایک نظر میں نے تجھ کو نظر بھر دیکھ لیا
جیسے کسی پیاسے نے سمندر دیکھ لیا
سب سکھیوں کے ہاتھ ہوئے پیلے پیلے
میں نے اپنے ہاتھوں میں مقدر دیکھ لیا

گھومتی رہی ہے تو اپنی شرطوں پر
دنیا ہم نے تیرا چکر دیکھ لیا
خیریت پوچھ کے وہ کیسی سزا دیتا ہے
جب بھی ملتا ہے میرا درد بڑھا دیتا ہے
میری تصویر کو رکھتا ہے سلیقے سے کبھی
اور کبھی میز سے میری تصویر ہٹا دیتا ہے

(ڈاکٹر قمر سرور، احمد نگر، مہاراشٹر)

میں زندگی کی کتاب میں فسانہ بے اثر نہیں تھی
ورق تو الٹ گئے جلدی تم میں بے اثر نہیں تھی
عشق میں مجنوں فرہاد نہیں ہونے کے
یہ نئے لوگ ہیں برباد نہیں ہونے کے
گھومتی پھرتی ہوں ہروقت تمہارے پیچھے
تم مگر وہ ہو کہ آباد نہیں ہونے کے
ہم نے خود پہنی ہے نصرت وفا کی زنجیر
ہم تو خود ہی کبھی آزاد نہیں ہونے کے
تول کر دیکھ لے عظمت کی ترازو میں اسے
میری چادر تیری دستار سے بھاری ہوگی

(نصرت مہدی، بھوپال)

خزاں سے مستقل سا ایک ناتا جوڑ رکھا ہے
خود اپنی ناؤ کو گرداب کے رخ موڑ رکھا ہے
گرا کر وادیوں پر برق ٹیلوں کو کھنڈر کر کے
زمیں کو ظالموں نے جھنجھوڑ رکھا ہے

ہماری خامشی سے دوست افسردہ نہ ہو جائیں
کچھ عرصے کے لیے خود ہم نے جینا چھوڑ رکھا ہے

(ڈاکٹر ترنم ریاض، دہلی)

تشنگی میری تقدیر ہے میرا بادل سلامت رہے
کوئی سایہ نہیں ہے تو کیا سر پہ آنچل سلامت رہے
بے گھروں کا سہارا ہے وہ رات بھر کو ہمارا ہے وہ
ہے پرندوں کے لب پر دعا اپنا پیپل سلامت رہے
جو ہم پہ گزری ہے تمھیں بتائیں کیا
یہ دل تو ٹوٹ گیا ہم بھی ٹوٹ جائیں کیا
ہمارے چہرے کے داغوں پر طنز کرتے ہو
ہمارے پاس بھی ہے آئینہ دکھائیں کیا

(نسیم نکہت لکھنؤ)

میں کہاں سے خریدوں شائستہ
میرے بچے نے خواب مانگا ہے
میں اجالے تلاش کرتی ہوں تو اندھیروں کی بات کرتا ہے
آسماں کا مکان کا جادو پیڑ پتوں میں کیوں اترتا ہے
جسم کے ٹوٹ کر بکھرنے تک ہر دھڑکن کو راز رکھتا ہے
ہاتھ آ جائے گا مچھیروں کو چاند کیوں پانی میں اترتا ہے

(شائستہ یوسف، بنگلور)

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 10، 15 جنوری 2017

■

Idara

عبدالحی

تنقید کا دائرہ محدود ہو گیا ہے

کیول دھیر

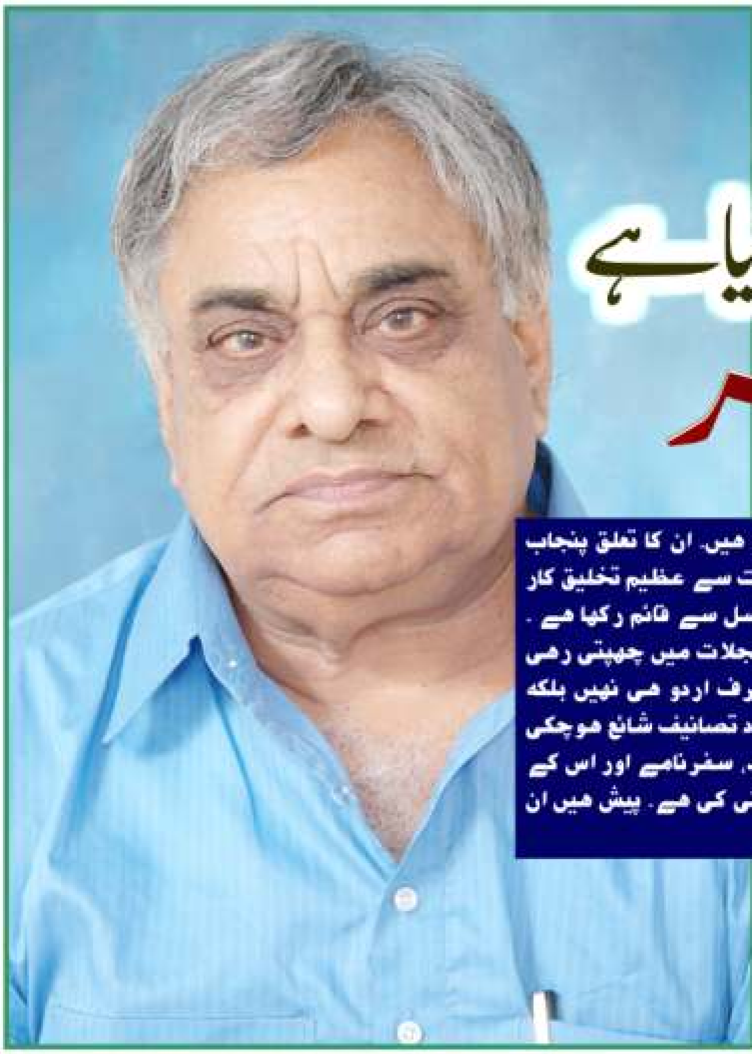

ڈاکٹر کیول دھیر اردو کے ایک اہم افسانہ نگار ہیں۔ ان کا تعلق پنجاب کی اس دھرتی سے ہے جس نے 'اردو دنیا' کو بہت سے عظیم تخلیق کار دیے۔ وہاں کی تخلیقی روایت کو انھوں نے تسلسل سے قائم رکھا ہے۔ ان کی تخلیقات برصغیر ہند و پاک کے مقتدر مجلات میں چھپتی رہی ہیں۔ وہ نہایت ہی سرگرم اور فعال ہیں اور صرف اردو ہی نہیں بلکہ ہندی، پنجابی اور انگریزی میں بھی ان کی متعدد تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ ان کا موضوعاتی دائرہ بھی وسیع ہے۔ تنقید، سفرنامے اور اس کے علاوہ دیگر اصناف میں بھی انھوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ پیش ہیں ان سے لیے گئے انٹرویو کے کچھ اقتباسات:

ڈاکٹر عبدالحی: سب سے پہلے آپ کے کوائف کے بارے میں پوچھنا چاہوں گا؟ اپنی تعلیم و تربیت اور پرورش کے حوالے سے گفتگو کریں:

ڈاکٹر کیول دھیر: پانچ اکتوبر 1938 کو موضع ٹکّو ضلع منٹگمری (اب ضلع ساہیوال) متحدہ ہندوستان میں پیدا ہوا۔ تقسیم وطن کے بعد اب یہ قصبہ پاکستان میں ہے۔ میرے والد موضع ٹکّو کے سرکاری ہسپتال میں بطور ڈاکٹر تعینات تھے۔ تقسیم وطن کے پہلے کے ان برسوں میں والد ضلع منٹگمری کے دیگر مقامات پر تعینات رہے اور میرے بچپن کے ننھے ننھے پاؤں نے یہاں کی مقدس دھرتی پر چلنا اور دوڑنا سیکھا۔ جریدۂ چہارسو کے مدیر گلزار جاوید نے ایک انٹرویو میں میری یادوں کو کچھ اس طرح کریدا تھا کہ ماضی کے کردار بارہا میرے ذہن کے دریچوں سے جھانکنے لگتے ہیں— ہسپتال میں کئی ملازم تھے۔ رشیداں دائی تھی، کلّن ماشکی تھا، کالو جمعدار تھا اور ان سب کی گود کا دلار مجھے ملا تھا اور ان سب کے آنگنوں نے کونوں میں 'اوپلوں' کی آگ پر کڑھتی دودھ کی کاڑھنیوں میں دودھ پر آئی ملائی، سانجھے چولہوں کی مسّی روٹی اور دیسی گھی کی چوری نے ہی شاید جسم کے خون کو سانجھی مسّی تہذیب کی لالی عطا کی تھی۔ ذہن کے جھروکوں سے دھندلی سی یادیں آج بھی جھلکتی ہیں تو مجھے قطار در قطار کھڑے شیشم کے درخت یاد آتے ہیں۔ بالکل قریب سے بہتی چھوٹی سی ندی کے پانی میں گھنٹوں نہانے کی ٹھنڈک کا احساس زندہ ہو جاتا ہے۔ ہمارے دادا لاہور میں رہتے تھے اور اکثر ہم ان کے پاس بھی چلے جایا کرتے تھے۔ لاہور کے بیچوں بیچ بہتی نہر کی پگڈنڈیوں پر دادا کی انگلی پکڑ کر صبح کی سیر کا لطف ہم کبھی بھولے نہیں ہیں۔ ہمارے بچپن کا ماحول اور درسگاہ کی ایسی چھوٹی سی دنیا تھی جس میں اپنے بچپن کے ننھے وجود کو لے کر داخل ہوئے تھے اور لگ بھگ نو سال تک ہم جنت جیسی اس دنیا کی معصوم دولت سے مالا مال رہے تھے۔ ہمارا یہ بچپن بس اتنا ہی مختصر تھا۔

تقسیم وطن ہمارے لیے ایک ایسا سانحہ ہے جس نے ہم سے ہمارا بچپن چھین لیا اور جس نے ہمیں اور ہماری معصوم یادوں کو غمناک بنا دیا۔ اس طویل المناک کہانی کو چند سطروں میں بس یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ہم نے دادا کو کھو دیا۔ ہم نے ٹکّو اور لاہور کو کھو دیا۔ لگ بھگ ڈیڑھ ماہ ہم قافلوں میں چل کر، ویرانوں اور اندھیروں میں چھپ کر، کیمپوں میں شب و روز بسر کر کے، لمحہ لمحہ مر کر زندہ ہوتے ہوئے بمشکل اپنے آبائی گاؤں ملو پوتہ (بھارتی پنجاب کے علاقہ دوآبہ میں صنعتی شہر پھگواڑہ کے پاس) پہنچے جہاں فسادات شروع ہونے سے چند ہفتے قبل ہماری والدہ ہم سے چھوٹے دو بھائیوں کے ساتھ بخیریت پہنچ گئی تھیں۔

لگ بھگ ایک سال گاؤں میں رہے جہاں چوتھی جماعت میں وہاں کے پرائمری اسکول میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد پھگواڑہ منتقل ہو گئے۔ والد صاحب کی علالت، مالی دشواریاں اور دیگر مختلف مسائل کا سامنا کرتے ہوئے زندگی کی جدوجہد کا سفر جاری رہا۔ پھگواڑہ کے لیے ہائی اسکول سے دسویں تک تعلیم حاصل کی۔ ہماری پڑھائی کے

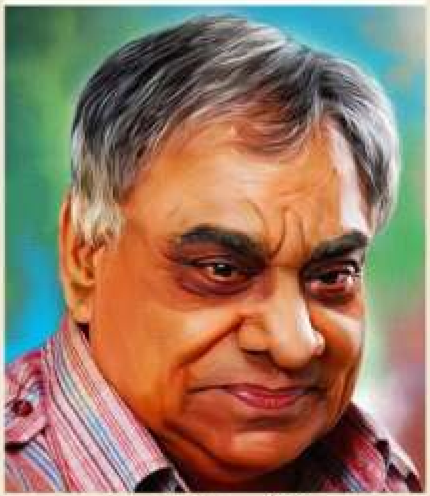

نصاب میں اس زمانے میں نہ اردو تھی اور نہ ہی ہندی یا گورمکھی۔ ہمارے پاس سائنس کے مضامین تھے اور امتحان میں کسی بھی زبان میں سوالات کے جواب دینے کی اجازت تھی۔ ہم نے اردو کا دامن تھاما (جواب تک تھامے ہوئے ہیں) ہندی بھی سیکھی، بعد میں گورمکھی کا امتحان بھی پاس کرنا پڑا کیونکہ پنجاب میں سرکاری ملازمت کے لیے یہ لازمی تھا۔

دہلی میں ایف۔ ایس۔ سی کی اور وہاں کے اجمل خاں طبیہ کالج میں طب کی پڑھائی کے لیے داخل ہوگئے۔ ایک سال بعد ہم دہلی کو اور طبیہ کالج کو خیر باد کہہ کر سرکاری طبی کالج پٹنہ (بہار) میں مائیگریشن لے کر داخل ہوگئے۔ ساڑھے چار سال بعد ڈگری کے ساتھ ڈاکٹر بن کر ہم واپس پنجاب آگئے جہاں بطور میڈیکل آفیسر ہم نے سرکاری نوکری کی اور آخرکار سال 1996 میں ایک اعلیٰ عہدے سے ریٹائر ہوکر مستقل طور پر لدھیانہ میں مقیم ہوگئے۔ ہم 1975 میں ٹرانسفر ہوکر لدھیانہ آئے تھے اور مختلف عہدوں پر ترقی یاب ہوتے ہوئے زیادہ عرصہ اسی شہر میں رہے۔

ہمارے خاندان میں کوئی ادیب، کوئی فنکار نہیں رہا۔ دادا اپنے زمانے میں کافی تعلیم یافتہ تھے۔ والد صاحب بھی ڈاکٹر تھے لیکن ادب میں کبھی کسی کی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ ادب کے جراثیم ہمارے خون میں کب کیسے سرایت کرگئے، پتہ نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ اسکول کے زمانے سے ہی ادب آزمائی کا آغاز ہوگیا تھا۔ اردو ماہنامہ 'کھلونا' اور ہندی رسالہ 'چنداماما' اس دور کے ہمارے پسندیدہ جریدے تھے۔

ع ح: آپ نے گریجویشن میڈیسن میں کیا، لیکن ادب اور بالخصوص اردو ادب کی جانب آپ کس طرح سے راغب ہوئے؟

ڈاکٹر کیول دھیر: ہم نے جیسے پہلے عرض کیا کہ ادب سے ہماری دلچسپی بچپن ہی سے پیدا ہوگئی تھی۔ رسالوں کے علاوہ اس زمانے میں ہندی اردو اخبارات کے میگزین سیکشن شائع ہوتے تھے اور پورا ایک صفحہ بچوں کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔ یہ آسانی سے دستیاب بھی ہوجاتے تھے۔ ہم بہت دلچسپی سے انھیں پڑھتے بھی تھے اور کچھ بھی لکھنے کی کوشش بھی کرتے تھے جس میں کبھی کبھی کامیاب بھی ہوجاتے تھے۔

شاعری میں ہماری دلچسپی اسے پڑھنے اور سننے تک ہی محدود رہی جو آج بھی قائم ہے۔ کہانی لکھنا ہمیں پسند تھا۔ اس کا آغاز ہندی اخبارات 'ہندی ملاپ' اور 'ویر پرتاپ' سے ہوا اور یہیں سے ہمیں آگے بڑھنے کا راستہ بھی ملا میٹرک پاس کرنے کے بعد حصول تعلیم کے لیے دہلی قیام کے دوران ابتدائی سطح پر ادبی حلقوں میں ہمیں پہچان پیدا کرنے کے مواقع پیدا ہوئے اور ادب میں ہماری دلچسپی میں اضافہ بھی ہوا۔ مالی ضرورت تھی، دلچسپی بھی تھی جس کی وجہ سے ہندی رسالہ ماہنامہ 'شکتی' میں ہم نے پارٹ ٹائم نوکری بھی کی۔ کئی ہندی رسائل میں وقفے کے ساتھ لکھنے بھی لگے۔

حالات سے جنمی جدوجہد کی کہانی بہت طویل ہے۔ صرف اطلاعاً عرض ہے کہ دہلی سے سرکاری طبی کالج پٹنہ میں داخلہ لینا بھی اسی طویل کہانی کا ایک باب ہے۔ آل انڈیا سوتنتر پارٹی ملک کے سیاسی افق پر نئی نئی طلوع ہوئی تھی۔ یہ پارٹی راج گوپال اچاریہ کی قیادت میں بنی تھی اور بہار کی جارکھنڈ پارٹی کے راجہ رام گڑھ ان کے ساتھ مل کر ان کی ریڑھ کی ہڈی بن گئے۔ انھوں نے پٹنہ سے اردو اور ہندی زبانوں میں ایک ہفتہ وار اخبار 'سوتنتر تا' نکالا تھا۔ اردو ایڈیشن کی ادارت کی ذمے داری (نوکری) مجھے مل گئی اور میں نے ساڑھے چار سال تک یہ ذمے داری نبھائی۔ ساتھ ساتھ اپنی طبی تعلیم بھی مکمل کی۔ اسی زمانے میں میں باقاعدہ لکھنے لگا تھا اور میری ہندی کہانیاں 'دھرم یگ'، 'ساپتاہک ہندوستان' اور دیگر ممتاز ہندی رسالوں میں شائع ہونے لگی تھیں۔ 1957 میں میری کہانیوں کا اولین مجموعہ 'دھرتی روپڑی' (بہ زبان ہندی) شائع ہوا تھا اور اس کا ابتدائیہ ہندی کے ممتاز ادیب وکوی جناب ناگارجن نے لکھا تھا۔

ہندی زبان نے مجھے کہانی کار بنایا اور اردو زبان نے میرے کہانی کو نہ صرف سجایا سنوارا بلکہ ایک پہچان بھی عطا کی۔

یہ کہانی بھی بہت طویل اور دلچسپ ہے کہ میں اردو ادب کی جانب سے کس طرح راغب ہوا۔ تفصیل بھی پھر کبھی، بس یہاں اتنا ہی کہ اس کی وجہ راجہ مہدی علی خاں اور افسانہ نگار مہندر ناتھ بنے جن کی ترغیب نے محبت اور ضد نے مجھے اردو میں بھی لکھنے کے لیے مجبور کردیا۔ تب سے میری پہلی ترجیح اردو بن گئی اور دوسری ہندی زبان۔

ع ح: آپ کا پہلا افسانوی مجموعہ 'دھرتی روپڑی' 1957 میں ہندی میں شائع ہوا، اردو میں افسانہ لکھنا کب سے شروع کیا؟

ڈاکٹر کیول دھیر: 1960 کے آس پاس اردو میں میرا پہلا افسانہ 'واشتی' ماہنامہ 'بیسویں صدی' کے خاص نمبر میں شائع ہوا اور محض اتفاق کی بات ہے کہ اسی ماہ کے 'شمع' میں بھی میرا دوسرا اردو افسانہ بلاعنوان شائع ہوا۔

اردو میں افسانہ نگاری کا میرا یہ آغاز تھا لیکن ہندی میں لکھنا میں نے بند نہیں کیا۔ میں نے نہ صرف اردو میں شائع ہوئی اپنی کئی کہانیوں کا ہندی ترجمہ کیا بلکہ ہندی زبان میں میرے چار ناول بھی شائع ہوئے ہیں۔ صحت، جنسیات اور دیگر موضوعات پر میری درجنوں کتابیں ہندی میں شائع ہوئی ہیں۔

ع ح: کیول دھیر جی آپ نے کئی زبانوں میں افسانے اور ناول تحریر کیے ہیں۔ مافی الضمیر کی آواز کس زبان میں پیش کرنا آپ کو زیادہ بہتر لگا!

ڈاکٹر کیول دھیر: عبدالحی صاحب! "میں جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا۔" — اردو میری محبوبہ ہے، میرا پہلا عشق ہے اور ہندی میری سہیلی ہے۔

یہاں ایک بات میں واضح کردوں کہ اردو اور ہندی، ان دونوں زبانوں کو بطور مضمون میں نے پڑھا ہی نہیں۔ ملکی تقسیم کے بعد اسکولوں میں تعلیم کا نام بھی شروع شروع میں واضح نہیں تھا اور اس کے علاوہ سائنس کا طالب علم ہونے کی وجہ سے ان زبانوں کو باقاعدہ پڑھنے، سیکھنے کا موقع ملا ہی نہیں— عشق بہت کچھ سکھا دیتا ہے اور میری لسانی تعلیم بھی میرا عشق ہی ہے۔

ع ح: افسانہ لکھنے کی تحریک کب اور کیسے ہوئی، کیا افسانے میں آپ کسی کو استاد مانتے ہیں یا افسانے میں آپ کا آئیڈیل کون ہے؟

ڈاکٹر کیول دھیر: بچپن کے زمانے میں جب انسان ہوش سنبھالتا ہے تو وہ پہلے نانی دادی ماں کی کہانیاں سنتا ہے اور بڑا ہوتا ہے۔ تو کہانیاں اس کی سوچ میں شریک ہوجاتی ہیں۔ وہ کہانیوں کو پڑھتا بھی ہے یعنی اس عمر کے بچے کے اندر ایک معصوم کہانی کار چھپا رہتا ہے۔ بالغ ہوتا ہے تو لڑکپن کی کہانیاں بھی جوان ہونے لگتی ہیں لیکن وہ نانی دادی ماں کی کہانیوں جیسی معصوم نہیں ہوتیں بلکہ حالات، سماج اور ماحول جیسی ہوتی ہیں۔ کچھ لوگ ان کہانیوں کو ساتھ لے کر بڑے ہوتے جاتے ہیں اور وہ باقاعدہ لکھنے لگ جاتے ہیں۔ اکثر لوگ معاشرے اور سماج کی تلخیوں میں گم ہوجاتے ہیں اور ان کے اندر کا

معصوم کہانی کار بھی کہیں گم ہو جاتا ہے۔ ہم بچپن اور لڑکپن کی کہانیوں کو ساتھ لے کر بڑے ہوئے اور یوں کہانی کار بن گئے۔

افسانہ نگاری میں ہمیں نہ تو کوئی استاد ملا اور نہ ہی اس کی ضرورت ہم نے محسوس کی۔ میرا تجربہ اور یقین ہے کہ ادب کا مطالعہ ادیب کا سب سے بڑا استاد ہوتا ہے۔ مجھے شروع سے ہی مطالعے میں گہری دلچسپی تھی۔ ابن صفی کے جاسوسی ناول پڑھے۔ رومانی دنیا بے پناہ پڑھا۔ دسویں جماعت میں تھے تو منٹو کی کتاب 'ٹھنڈا گوشت' کے افسانے پڑھے۔ منٹو کے یہ افسانے تب کچھ زیادہ ہماری سمجھ میں نہیں آئے لیکن آگے چل کر جب ہم نے ان کو دوبارہ پڑھا تو منٹو ہماری سمجھ میں آیا۔ آج بھی منٹو اور موپساں ہمیں سب سے زیادہ پسند ہیں اور آپ کے الفاظ میں کسی حد تک 'آئیڈیل' بھی کہہ سکتے ہیں۔

ع ح: آپ کے سامنے افسانوی ادب کی روشن روایت رہی ہے۔ کیا آپ نے افسانوں میں روایت کی پاسداری کی ہے یا کچھ الگ سے کہنے کی کوشش کی ہے؟

ڈاکٹر کیول دھیر: بلاشبہ اردو ادب میں افسانوی ادب کی روشن روایت رہی ہے جو لگ بھگ منشی پریم چند سے شروع ہوتی ہے۔ اردو میں افسانہ میں نے 1960 کی دہائی میں لکھنا شروع کیا۔ وہ دور روایتی افسانہ نگاری کا تھا اور منٹو کے بعد عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، رام لعل اور بہت سے دوسرے افسانہ نگار روایتی افسانے کی بھرپور نمائندگی کر رہے تھے۔ میں نے بھی روایتی افسانے کا دامن تھاما۔ حالانکہ اسی دہائی میں مختلف ناموں سے روایت سے ہٹ کر افسانہ نگاری کی بعض تحریکیں پیدا ہوئیں۔ علامتی افسانہ بھی اسی زمانے میں وجود میں آیا لیکن روایتی افسانہ ہمیشہ زندہ رہا جبکہ دیگر تحریکیں دھیرے دھیرے ختم ہوگئیں یا ماند پڑگئیں۔

جہاں تک کچھ الگ کہنے کی بات ہے، وہ ہر افسانہ نگار کہنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ وقت اور حالات کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ روایتی افسانے میں بھی کچھ الگ کہاں لکھا گیا ہے لیکن بنیادی طور پر وہ روایتی افسانہ ہی رہا ہے۔ میں آج تک اس روایت سے الگ نہیں ہوسکا۔

ع ح: ڈاکٹر صاحب آپ نے جب باقاعدہ لکھنا شروع کیا تو اس وقت مختلف ادبی نظریات اور ازم کے نعرے بلند ہورہے تھے۔ کیا آپ ایسی کسی تحریک سے متاثر ہوئے؟ اور ایسے کسی نظریے یا ازم کے تحت لکھی گئی کہانی کے بارے میں آپ کیا رائے دیں گے؟

ڈاکٹر کیول دھیر: یقیناً ساٹھ کی دہائی میں جب میں نے باقاعدہ لکھنا شروع کیا تو روایتی کہانی ماند پڑ رہی تھی نظریاتی کہانی ادب پر حاوی ہورہی تھی لیکن میں نے روایتی کہانی کا دامن نہیں چھوڑا۔ میرا عقیدہ تھا اور ہے کہ نظریوں اور نعروں کے شور میں فن پارے کی صدا سنائی ہی کہاں دیتی ہے، صرف شور ہی کانوں میں پڑتا ہے۔ کہانی میں تو کہانی کار کو اپنے کرداروں کے عمل اور عقیدے کے ساتھ ساتھ سفر کرنا پڑتا ہے اور تب کہانی اپنا روپ اختیار کرتی ہے۔

شروع شروع میں ترقی پسند ادیبوں اور ادب کو ضرور قبولیت حاصل ہوئی کیونکہ انھوں نے اپنی کہانیوں

پروفیسر ارتضیٰ کریم کو ساحر ایوارڈ سے نوازتے ہوئے ڈاکٹر کیول دھیر اور ڈاکٹر راکیش بھارتی متل (بھارتی ایزٹیل)

میں زندگی کے جبر کو بخوبی واضح کیا اور مثال کے طور پر منشی پریم چند کی کہانی 'کفن'، منٹو کی 'نیا قانون'، راجندر سنگھ بیدی کی 'لاجونتی'، عصمت چغتائی کی 'دو رتھ' وغیرہ لیکن بعد میں ان لوگوں کی کہانیاں ان کا مینی فیسٹو بننے لگی تھیں۔ اسی طرح جدیدیت پسند بھی بالواسطہ طور پر نعرے باز ہوگئے تھے۔ آخرکار یہ لوگ پس منظر ہوتے چلے گئے اور روایتی کہانی زندہ رہی جو آج بھی زندہ ہے۔

ع ح: ایک دور تھا جب اردو افسانہ بلندیوں پر تھا لیکن بعد ازاں اس کے سفر میں تکان کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی وجوہات کیا ہیں؟

ڈاکٹر کیول دھیر: میں اس رائے سے اتفاق نہیں کرتا۔ اردو افسانے کا سفر بدستور جاری ہے۔ فرق صرف اس دور کا اور آج کے دور کا ہے۔ اس وقت ہندوستان غیر منقسم تھا۔ افسانہ نگاروں کی ایک لمبی قطار تھی۔ پریم چند کے بعد منٹو، بیدی، عصمت، قاسمی، کرشن چندر، اشک، ممتاز مفتی، غلام عباس اور بہت سے دوسرے لوگ اول اول تھے۔ اس کے بعد سفر کو ملکی تقسیم نے سست کردیا لیکن یہ عارضی کیفیت تھی۔ اگر نام یاد کیے جائیں تو ان لوگوں کے علاوہ قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، آغا بابر، بلونت سنگھ، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، رام لعل، جیلانی بانو، غیاث احمد گدی، سریندر پرکاش، غلام الثقلین، جوگندر پال، اقبال مجید، بلراج مین را، انور سجاد، احمد بمیش، اے حمید، رتن سنگھ، رشید امجد، منشا یاد، زاہدہ حنا، گلزار ناصر بغدادی، ہرچرن چاولہ، مہندر ناتھ، واجدہ تبسم — اور — اور ایک طویل فہرست ہے۔ اس کے بعد میرے ہمعصروں میں اور آج کی پیڑھی میں بھی درجنوں نام ہیں جو بہت اہم ہیں۔

ع ح: آپ کے دو مشہور سفرنامے منظر عام پر آچکے ہیں۔ 'خوشبو کا سفر' اور 'گوری کے دیش میں' خصوصی طور پر 'خوشبو کا سفر' جو پاکستان کے سفر سے وابستہ ہے۔ آپ اپنے تجربات اور محسوسات سے ہمیں آگاہ کریں۔

ڈاکٹر کیول دھیر: 'خوشبو کا سفر' پاکستان کے میرے اولین سفر سے وابستہ ہے جو میں نے 1985 میں کیا تھا۔ اس سفر پر جانے کی داستان بھی دلچسپ ہے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اس زمانے میں اپنی قیادت میں بھارتی ادیبوں کا ایک وفد لے کر پاکستان تشریف لے گئے تھے۔ ان کی خواہش اور کوشش رہی کہ میں بھی اس سرکاری وفد کا حصہ بنوں لیکن عین آخری وقت پر بھارت سرکار نے وفد کے ممبران کی تعداد سولہ سے کم کر کے دس کردی اور حذف شدہ ممبران میں ہم بھی تھے لیکن بیدی صاحب نے پاکستان کا ہمارا ویزا لگوا دیا تاکہ ہم بھی ان کے ساتھ سفر پر روانہ ہوسکیں۔ ہم ان کے ساتھ تو نہیں جاسکے اور واگھہ بارڈر کے راستے لاہور پہنچ گئے اور چند روز لاہور میں ہم نے ساتھ ساتھ گزارے۔ ہم کئی لحاظ سے خوش قسمت رہے کہ لاہور میں ہماری میزبان بیگم بشریٰ رحمٰن بن گئیں اور بھارتی ادیبوں کے وفد کے اراکین (جن میں پروفیسر گوپی چند نارنگ، جگن ناتھ آزاد، حامدی کاشمیری، ڈاکٹر خلیق انجم اور دیگر شامل تھے)

کے ساتھ غیر سرکاری ہوتے ہوئے بھی ہم سرکاری تقریبات میں شرکت کرتے رہے اور اس بہانے ہماری ملاقات پاکستان کے بہت سے صفِ اول کے ادیبوں سے ہوگئی۔ 'بیسویں صدی' اور 'شمع' میں ہم اکثر لکھتے تھے اور یہ دونوں جریدے وہاں بھی بے حد مقبول تھے۔ اس حوالے سے ہمیں پڑھنے والے اور ہمارے نام سے واقف ادیبوں و شاعروں کی تعداد بھی کافی تھی۔ ہم تین ہفتے لاہور میں رہے اور لگ بھگ تمام بڑے لوگوں سے ہماری ملاقاتیں رہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، فرخندہ لودھی، سائرا ہاشمی، اے حمید، اظہر جاوید، عطاء الحق قاسمی، اشفاق احمد جیسے بے شمار دوستوں نے ہمیں اپنی بے پناہ محبت سے نوازا۔ ہمارے اعزاز میں تقریبات منعقد کیں اور اس طرح پاکستان میں ہمارے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع ہوگیا۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آپ کو ہر طرح کی سہولت میسر ہوجائے، مختلف ادبی نظریات کے لوگوں سے بات چیت کرنے کا موقع مل جائے اور ہر جگہ آپ کو محبتوں سے مالال کردیا جائے تو ظاہر ہے کہ سفرنامہ محبتوں کی کتاب بن جائے گا۔ 'خوشبو کا سفر' محبتوں کی ایک ایسی ہی کتاب ہے جو سرحد کے اس پار اور اس پار بے حد مقبول ہوئی۔

جہاں تک سفرنامہ 'گوری کے دیش' کا سوال ہے، یہ میرے امریکہ، کناڈا، برطانیہ اور یوروپ کے مختلف ممالک کے کئی بار کے سفر کی مشترکہ داستان ہے۔ اس میں ادب کم اور سیاحت زیادہ ہے۔

ع ح: ابدال بیلا کا مشہور ناول 'دروازہ کھلتا ہے' جس کا ترجمہ آپ نے ہندی زبان میں کیا ہے پہلی بار پاکستان کے معروف پبلی کیشن، سے شائع ہوا ہے۔ کیا یہ دونوں ملکوں کے درمیان خوشگوار رشتوں کے قیام میں معاون ہوگا۔

ڈاکٹر کیول دھیر: ابدال بیلا کا ناول 'دروازہ کھلتا ہے' اٹھارہ سو صفحات کی ایک ضخیم ناول ہے جو متحدہ ہندوستان کی لگ بھگ پانچ سو سالہ تہذیبی اور ثقافتی تاریخ کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ ہندی زبان میں اس ناول کے ترجمے اور اشاعت کی کہانی بھی بہت دلچسپ ہے۔ ہمارے بھارت کے وزیر اعظم جناب اٹل بہاری واجپئی جب بس یاترا کے ساتھ لاہور تشریف لے گئے تھے تب وہاں کے ذمے دار حکومتی اراکین اور متعلقہ سرکاری افسران کو علم ہوا کہ واجپئی صاحب ہندی کے ادیب/کوی ہیں اور انھیں پاکستان کے ادب کے حوالے سے بطور تحفہ کوئی ایسی کتاب پیش کی جانی چاہیے جو ہندی زبان میں ہو لیکن ایسی کوئی کتاب وہاں دستیاب نہیں تھی۔ ہمیں یہ تو معلوم نہیں کہ ہمارے وزیر اعظم کو انھوں نے کیا ادبی تحفہ پیش کیا لیکن تب پہلی بار وہاں ابدال بیلا کے اس ناول کے ہندی زبان میں ترجمے کی کہانی نے جنم لیا۔ اعلیٰ سطح کی ایک کمیٹی کی تشکیل ہوئی۔ سولہ سترہ ماہ کی سرکاری کارروائیوں کے بعد ابدال بیلا کے ناول 'دروازہ کھلتا ہے' کے ہندی زبان میں ترجمے کا فیصلہ لیا گیا اور دوسرا مرحلہ یہ تھا کہ پاکستان میں اس کتاب کا ہندی ترجمہ کیسے ہو، کوئی حل نہیں ملا تو اس کے ترجمے کے لیے میرا انتخاب ہوا اور اشاعت کی ذمے داری پاکستان کے سب سے بڑے اشاعتی ادارے سنگ میل پبلی کیشنز نے لی۔ تقریباً پانچ سال مجھے اس ضخیم ناول کو ہندی ترجمے کرنے میں لگے اور ایک ڈیڑھ سال کا عرصہ لاہور سے اس کی ہندی طباعت و اشاعت میں لگا اور اس طرح یہ ناول ایک تاریخی دستاویز بن گیا۔ پاکستان میں اس ناول کے ہندی ایڈیشن کی بہت پذیرائی ہوئی۔ بڑے پیمانے پر اس کی رسم اجرا انجام دی گئی۔ اخبارات میں کالم رکھے گئے اور اسے تب بھارت پاک دوستی کی ایک دستاویز قرار دیا گیا۔

قلم کا حوالہ اور رشتہ بہت اہم و طاقتور ہوتا ہے۔ دونوں پڑوسی ملکوں کے درمیان آپسی تعلقات خوشگوار نہیں رہے لیکن قلم اور ادب کے حسن اور فراخ دلی سے ہم پرامید ہیں کہ یہ ناول دونوں ممالک کے درمیان بند پڑے دروازوں کو وا کرے گا اور دوستی اور محبت کا دروازہ ضرور کھلے گا۔

ع ح: تنقید کا موضوع اکثر زیر بحث رہا ہے۔ یہ اکثر کہا جاتا ہے کہ تنقید کا دائرہ محدود اور اعتبار مشکوک ہوگیا ہے۔ آپ کی رائے کیا ہے؟

ڈاکٹر کیول دھیر: اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں اپنے ایک انٹرویو میں میں نے کہا تھا کہ حقیقتاً جہاں تنقید کا دائرہ محدود ہوا ہے وہاں اس کا اعتبار بھی

مشکوک ہوگیا ہے۔ تنقید آج خانوں اور گروہوں میں بٹ گئی ہے اور نتیجے کے طور پر گروہ بندی پروان چڑھی ہے۔ اعتبار مشکوک ہونے کی وجہ نقاد کی کم علمی، تنگ نظری اور ذاتی مفاد بھی ہیں۔ ایک بہت چھوٹا سا طبقہ ضرور موجود ہے جو بااصول بات کہنے کی کوشش کرتا ہے لیکن آج حالات ایسے ہیں اور 'تنقید کا بیوپار' کچھ اس طرح پنپ رہا ہے کہ اس طبقے کو ذاتیات کی سطح پر پرکھا جاتا ہے۔

ع ح: اسی حوالے سے ایک ذاتی سوال کہ آپ تنقید کے معاملے میں نظرانداز ہوئے ہیں۔ پچاس سال سے زائد آپ کے ادبی سفر کا مناسب ردِ عمل ادبی حلقوں میں کیوں نہیں ہوا؟

ڈاکٹر کیول دھیر: تنقید کا دائرہ محدود اور اعتبار مشکوک والی بات یہاں بھی لاگو ہوتی ہے۔ پیشے سے ڈاکٹر ہونے اور اس کی اپنی مصروفیات کے باوجود میں نے پچاس سے زائد برس ادب کو دیے ہیں۔ ادب نے مجھے ذہنی اور قلبی تسکین و خوشی عطا کی ہے۔ مجھے میری کہانیاں پڑھنے والوں کا ایک وسیع حلقہ دیا ہے۔ میرا قاری مجھ سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ میری ادبی کتابوں کی اشاعت بھارت کے علاوہ پاکستان میں بھی ہوتی ہے۔ انعامات اور اعزازات بھی حاصل ہوئے۔ بھارت اور پاکستان میں چار ذہین طالب علموں نے میرے افسانوی ادب پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ہے۔ بھارت، پاکستان، امریکہ، کناڈا اور برطانیہ کے کئی ٹیلی ویژن چینلوں نے مجھ پر ڈاکومینٹری اور ٹیلی فلمیں بنائی ہیں۔ چہار سو، تخلیق، بازگشت، پرواز ادب، بیاض وغیرہ بہت سے ادبی جریدوں نے میرے ادبی سفر پر خاص نمبر شائع کیے ہیں۔ اور بھی بہت کچھ حاصل ہوا۔ عزت، شہرت، بے پناہ محبت کی دولت حاصل ہوئی اور کیا چاہیے؟

ع ح: اردو زبان کے مستقبل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ڈاکٹر کیول دھیر: اردو محض ایک زبان ہی نہیں، ایک تہذیب ہے۔ اس کا تہذیبی اور ثقافتی پس منظر عظیم اور لامثال ہے۔ جس طرح تہذیب اور ثقافت کبھی ہم سے جدا نہیں ہوئی اسی طرح اردو کا مستقبل بھی محفوظ ہے۔

ع ح: اردو کی ترقی کے لیے لوگ اسے روزگار سے جوڑنے کی باتیں کرتے رہے ہیں۔ آپ کو کیا لگتا ہے کہ کیا روزگار سے جوڑ دینے سے اردو پھر سے اپنا کھویا مقام حاصل کرسکتی ہے؟ اردو کی ترویج و ترقی کے لیے آپ کیا کہیں گے؟

ڈاکٹر کیول دھیر: کسی حد تک یہ بات صحیح ہے کہ اردو کی ترقی کے لیے اسے روزگار سے جوڑنا چاہیے۔ دراصل روزگار انسانی بقا کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ آج کا دور جس تیز رفتاری کے ساتھ ہر شعبے میں تکنیکی ہوگیا ہے، زبان کی اہمیت اور ضرورت اسی اعتبار سے شدید ہوگئی ہے۔ ہمارا ملک یورپ اور لاطینی امریکہ جیسا نہیں ہے جہاں صرف ایک ہی زبان یعنی انگریزی سے ان کا نظام چلتا ہے۔ ہمارے دیش میں مختلف پردیش ہیں، مختلف زبانیں ہیں۔ اس لحاظ سے زبانوں کی اہمیت بھی بڑھ جاتی ہے، ضرورت بھی بڑھتی ہے۔ اور اردو بھی ہمارے دیش کی ایک ایسی طاقتور و اہم ترین زبان ہے جو ہمارے نظام کا حصہ رہی ہے اور اب بھی ہے۔ اس کی علاقائی ضرورت اور اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس ضرورت اور اہمیت کے پیش نظر اردو کی ترویج و ترقی ہونی چاہیے اور اسے روزگار سے جوڑنا ایک اہم قدم ہے۔

اردو کی ترویج اور ترقی کے لیے ملک کی سرکاریں اب اس سے غافل نہیں ہیں۔ صوبائی سطح پر اردو اکادمیاں ہیں۔ مرکزی سطح پر سب سے بڑا ادارہ این سی پی یو ایل ہے اور یہ تمام ادارے اردو کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ملک میں یونیورسٹی سطح پر بھی اردو کے شعبے قائم ہیں جہاں اردو کی تعلیمی سرگرمیاں جاری ہیں۔ میرے خیال میں ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ان تمام تنظیموں، اداروں اور شعبوں کو ایمان داری اور نیک نیتی کے ساتھ تعلیمی مقاصد کے لیے آگے بڑھایا جائے۔ اگر ایسا ہوجائے تو اردو کی ترویج و ترقی اپنے آپ ہوگی۔

ع ح: ساحر لدھیانوی کلچرل اکادمی کے حوالے سے بتائیں۔ اس کے مقاصد اور مستقبل کے منصوبوں پر روشنی ڈالیں۔

ڈاکٹر کیول دھیر: ساحر لدھیانوی کلچرل اکادمی (جو اب انٹرنیشنل کے نام سے رجسٹرڈ ہے) مکمل طور پر ایک ادبی ادارہ ہے جس کا قیام 1972 میں ہوا تھا۔ تب چند دوستوں کی طرف سے ایک چھوٹی سی ادبی انجمن قائم کی گئی تھی۔ 1975 میں پہلی بار اس کی طرف سے کل ہند سطح پر اور بہت بڑے پیمانے پر ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا جس میں جناب علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر اور صف اوّل کے درجن بھر دیگر شعرا نے شرکت کی۔ بعد ازاں مشاعرے کا انعقاد بڑے پیمانے پر ہر سال ہونے لگا۔ اکتوبر 1980 میں ساحر لدھیانوی ہم سے جدا ہوگئے اور اس کے بعد ماہ مارچ میں ہر سال ساحر لدھیانوی کے یوم ولادت پر 'جشن ساحر' کے نام سے ایک تقریب کا انعقاد کیا جانے لگا جس کے تحت ادبی سیمینار، موسیقی کے مقابلے، کل ہند مشاعرہ وغیرہ ادبی پروگرام ہوتے ہیں اور یہ تمام پروگرام ساحر لدھیانوی کے نام سے منسوب ہوتے ہیں۔ یہ ایک طرح سے خراج عقیدت ہے جو لدھیانہ شہر اپنے عزیز اور عظیم شاعر ساحر کو پیش کرتا ہے۔ ادب، فن، صحافت اور ثقافت کے شعبوں میں نمایاں کارکردگی کے لیے اکادمی کی طرف سے ہر سال ساحر ایوارڈ اور ادیب ایوارڈ پیش کیے جاتے ہیں۔ اب تک یہ ایوارڈ پچاس سے زائد شخصیتوں کو پیش کیے جاچکے ہیں جن میں جناب سنیل دت (فلم اسٹار)، شبانہ اعظمی، راج ببر، نادرہ ظہیر ببر، رامانند ساگر، جاوید اختر، ہرچرن چاولہ، علی سردار جعفری، قتیل شفائی، جیسے بڑے نام شامل ہیں۔ 2000 کے موقعے پر بطور خاص ادیب ایوارڈ ایسی گیارہ شخصیتوں کو دیے گئے تھے جو برطانیہ، امریکہ، کناڈا، جرمنی، ناروے وغیرہ دیار غیر میں اردو زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ یہ سلسلہ گذشتہ 29 برسوں سے مسلسل جاری ہے۔ میں بطور جنرل سکریٹری اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔ میں یہ بھی عرض کردوں کہ یہ ادارہ بغیر کسی سرکاری گرانٹ کے چل رہا ہے اور ابھی تک نہایت کامیابی سے چل رہا ہے۔

مقامی اور صوبائی ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کی بوقت ضرورت مالی مدد کرنا بھی اس ادارے کا مقصد ہے۔ اس طرح کی مدد عام لوگوں کے مالی تعاون سے کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر معروف اردو شاعر جناب کرشن ادیب کی زندگی میں ہی ایک خوب صورت گھر کی تعمیر کی گئی جس پر آئی لاکھوں روپے کی لاگت کا ایک بڑا حصہ اس ادارے نے خرچ کیا۔ بیماری، بچوں کی تعلیم اور شادی جیسے کاموں کے لیے بھی اس کی طرف سے ضرورت مند قلم کاروں اور فنکاروں کی ہر ممکن مالی مدد کی جاتی ہے۔

چھ برس پہلے انگریزی زبان میں 'دی سکلپچر' نام سے ایک سالانہ جریدے کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس کا مقصد مشرق اور مغرب کے درمیان ادبی اور ثقافتی پل کا کام کر رہے لوگوں اور ان کے کارناموں کو منظر عام پر لانا اور ادب کی دنیا کو ادب کی سرگرمیوں سے روشناس کرانا ہے۔ انشاء اللہ! مستقبل میں بھی ساحر کلچرل اکادمی (ادیب انٹرنیشنل) کی ایسی سرگرمیاں جاری رہیں گی۔

ع ح: کیا آپ اپنے ادبی سفر سے مطمئن ہیں؟

ڈاکٹر کیول دھیر: شاید نہیں کیونکہ تخلیقی کام کرنے والے کسی بھی شخص کو اپنی ادبی کاوشوں سے مطمئن نہیں ہوجانا چاہیے۔ میرا عقیدہ ہے کہ قلمکار کی کوئی بھی کتاب اس کی منزل نہیں ہوتی بلکہ سنگ میل ہوتی ہے۔ ذرا رک کر دم لیا اور پھر قلم، دوات اور کاغذ— اور ایک نئی کتاب۔ میرے ذہن میں کوئی نہ کوئی منصوبہ جنم لیتا رہتا ہے۔ ابھی ابھی میں نے ساحر لدھیانوی کے تعلق سے ایک بڑے پراجیکٹ پر کام ختم کیا ہے۔ لگ بھگ ایک ہزار صفحات کی بڑے سائز کی یہ کتاب سنگ میل، لاہور سے شائع ہو رہی ہے۔ ذرا دم لے کر اب خودنوشت سوانح عمری پر کام شروع کروں گا۔ میں مستقل مزاج نہیں ہوں۔ یہ کام بہت صبر اور حوصلے کا ہے— لیکن وشواس تبھی ہے کہ مکمل کرلوں گا۔

فنی سفر کے مرحلے کا تو علم نہیں۔ پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو ذرا سا اطمینان ہوتا ہے کہ زندگی میں کچھ کام تو کیا! اردو، ہندی، انگریزی میں کل ملا کر ایک سو سے زائد کتابیں شائع ہوگئیں۔ کچھ مزید پائپ لائن میں ہیں۔ چند بڑے اور کئی چھوٹے انعامات و اعزازات سے نوازا گیا جن میں قابل فخر اور قابل ذکر یہ ہیں: پنجاب سرکار کا سب سے بڑا صوبائی انعام 'شرومنی اردو ساہتیہ کار ایوارڈ' (توصیفی سند اور پانچ لاکھ روپے)، دی ایشین لٹریری فاؤنڈیشن یو ایس اے کا لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ (توصیفی سند اور پانچ ہزار ڈالر)، 'ایمبیسڈر فار پیس سارک ایوارڈ'، ہاؤس آف کامنز کناڈا سرکار کا عالمی اعزاز، بھارت کی اتر پردیش، بہار، بنگال، پنجاب، کرناٹک صوبائی اردو اکادمیوں کی طرف سے نو بار کتابوں پر انعام— اور بھی بہت کچھ۔ ادب کے حوالے سے گیارہ بار پاکستان، سات بار برطانیہ، پانچ بار امریکہ اور کناڈا اور ایک بار ناروے، دو بار فرانس اور یوروپ کے متعدد ممالک کا سفر— اور یہ سب صرف اور صرف اردو کے حوالے سے!

■

Dr. Abdul Hai ,
ahaijnu@gmail.com
Dr. Kewal Dheer, B-116, B.R.S. Nagar, Ludhiana - 141012 (Punjab)

فاصلاتی طرزِ تعلیم اور ٹیچر ایجوکیشن پروگرام

محمد اطہر حسین

جدید جمہوری معاشروں میں، تعلیم جمہوری تصورات کی تکمیل میں مدد فراہم کرتی ہے۔ ہم اکیسویں صدی کی دوسری دہائی پر کھڑے ہیں اور ایک اختصاص طلب اور کاروباری معاشرے کی طرف تیزی سے گامزن ہیں۔ ملک کے ترقیاتی اہداف کے حصول میں تعلیم بے حد اہم عوامل میں سے ایک ہے۔ یہ قومی ترقی کی کلید ہے اور یہ انسانی وسائل پر سرمایہ کاری ہے۔ جمہوریت میں سو فیصد شرح خواندگی اور سب کے لیے تعلیم کا ہدف اچھے اساتذہ کی ضرورت کا آئینہ دار ہے۔ تعلیم کی تمام سطحوں پر طلبا کے داخلے میں اضافہ، تربیت یافتہ اساتذہ کی بلاتعطل فراہمی کی ضرورت پر زور دیتا ہے تاہم اساتذہ کی تربیت (Teacher Training) کے روایتی ادارے (Conventional Institutions) یہ اہم ضرورت پوری کرنے سے قاصر ہیں۔ ایسے میں فاصلاتی نظام کے تحت اساتذہ کی تربیت کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ دوہرے نظام (Daul Mode) کے تحت کام کرنے والی کئی یونیورسٹیاں ہیں جو فاصلاتی تعلیمی ادارے (Directorate of Distance Edcation) چلاتی ہیں اور ایسی بھی یونیورسٹیاں ہیں جو فاصلاتی نظام کے تحت کام کرتی ہیں جنھیں ہندوستان میں اوپن یونیورسٹی کا نام دیا جاتا ہے، ان میں فاصلاتی نظام (Distance Mode) کے تحت ٹیچر ایجوکیشن پروگرام بھی چلائے جاتے ہیں۔

"تعلیم شعور کی ترقی اور معاشرے کی تعمیر نو کا بنیادی آلہ ہے۔" (مہاتما گاندھی)

تعلیم کا مقصد انسان کے پوشیدہ معقول آفاقی تصورات کو اجاگر کرنا ہے۔ مشہور فلسفی جون ڈیوی (John Dewy) تعلیم کو 'معاشرتی قابلیت کی افزودگی' تصور کرتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ "بچے کی پوشیدہ صلاحیتوں کو ابھارنے اور سدھارنے کا عمل" تعلیم ہے۔ باباے قوم مہاتما گاندھی تعلیم کو 'شخصیت کی ہمہ جہت نشوونما' کہتے ہیں۔

بقول ڈاکٹر ذاکر حسین "تعلیم کسی سماج کی اس جانی بوجھی اور سوچی سمجھی کوشش کا نام ہے جو وہ اس لیے حاصل کرتا ہے کہ ان کا وجود باقی رہ سکے اور اس کے افراد میں یہ قابلیت پیدا ہو جائے کہ بدلے ہوئے حالات کے ساتھ سماجی زندگی میں بھی مناسب اور ضروری تبدیلی پیدا کر سکے۔"

درجہ بالا تعریفوں اور تشریحوں کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ تعلیم کا تصور ایک ہیرے کی مانند ہے جو وقت اور حالات کے ساتھ مختلف زاویوں اور رنگوں میں ابھرتا ہے۔

تعلیم کو معاشرتی تبدیلی کا ایک آلہ تصور کیا جاتا ہے اور انسانی وسائل پر سرمایہ کاری سمجھا جاتا ہے جو بالآخر معاشرے کی سماجی اور معاشی ترقی میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔

یوں تو عموماً ماہرین نے تعلیم کی دو قسموں: رسمی اور غیر رسمی تعلیم (Formal and Informal Education) کا بیان کیا ہے لیکن ان دو قسموں کے علاوہ بھی تعلیم کی ایک اور قسم نیم رسمی تعلیم (Non Formal Education) ہے۔ نیم رسمی تعلیم ایک ایسا نظام تعلیم ہے جس کے ذریعے انسان اپنی مشغولیات میں سرگرم رہنے کے ساتھ ساتھ اپنی تعلیمی قابلیت میں اضافے کے لیے علم حاصل کرتا ہے۔

رسمی تعلیمی نظام عصری تقاضوں کی تکمیل کرنے سے قاصر رہا ہے جس کے نتیجے میں نیم رسمی تعلیمی نظام یا فاصلاتی تعلیمی نظام ایک متبادل کی طرح سامنے آیا تا کہ عصری و مستقبل کی تعلیمی ترقی کے تقاضوں کی بھرپائی ہو سکے۔

فاصلاتی تعلیمی نظام دراصل براہ راست تعلیمی نظام کا تکملہ ہے۔ جو جدید دور کے 'تمام عمر تعلیم' (Life Long Education) کے تصور کو عملی جامہ پہنانے کا اہم ترین ذریعہ بن گیا ہے۔ فاصلاتی تعلیم ایک وسیع اصطلاح جس میں وسیع پیمانے پر درس و تدریس کے طریقہ کار شامل ہیں۔ فاصلاتی تعلیم کا مطلب طالب علم اور معلم کے درمیان فاصلہ ہے یعنی رسمی طور سے ہٹ کر اس نظام تعلیم میں معلم اور متعلم کو روبرو ہونے کا موقع بہت کم ہوتا ہے اور بعض اوقات نہیں بھی ہوتا ہے۔ فاصلاتی نظام تعلیم ایسے اساتذہ کے لیے جو اپنی تعلیمی اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں میں بہتری کے خواہاں ہیں، گھر اور کام کی جگہ سے الگ ہوئے بغیر تعلیم کا ایک منفرد ذریعہ فراہم کرتی ہے۔ اس نظام تعلیم کی سب سے بڑی خوبی اس کی لچک ہے جو تعلیم حاصل کرنے والوں کو اپنی رفتار سے ترقی کے مواقع دیتا ہے۔

اس نظام میں ترسیلی ذرائع ابلاغ (Information and Communication Teachnology) کے استعمال نے تدریسی و اکتسابی عمل کو نہ صرف آسان بنایا ہے بلکہ بہترین نتائج بھی برآمد ہوئے ہیں۔ جدید ٹکنالوجی کا استعمال رسمی نظام تعلیم کے مقابلے میں فاصلاتی تعلیم میں زیادہ کیا جانے لگا اور اس نظام کا ایک اہم حصہ

بن گیا۔ ترسیلی ذرائع ابلاغ کی ترقی تعلیمی ٹکنالوجی کی مدد سے فاصلاتی نظام تعلیم طلبہ کے لیے نہایت ہی مفید سہولیات فراہم کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ جو عناصر فاصلاتی نظام تعلیم کی وسعت اور اس کے معیار کی بلندی میں سرگرداں ہیں، وہ درج ذیل ہیں:

- مطالعاتی مواد(Study Material)
- مطالعاتی مراکز(Study Centers)
- مشاوراتی کلاسیز(Counseling Classes)
- ذاتی رابطہ پروگرام(Personal Contact Program)
- تفویضات(Assignments)
- مشقی تدریس(Practice Teaching)
- الکٹرانک میڈیا(Electronic Media)
- اکیڈمک کاؤنسلر(Academic Counselor)
- کوآرڈینیٹر(Coordinator)
- متعلم(Students)

یہ تمام اجزا فاصلاتی نظام تعلیم کی بہتری اور اس کو موثر بنانے میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔

ٹیچر ایجوکیشن:

ہندوستان میں ٹیچر ایجوکیشن کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ ٹیچر ایجوکیشن ہمارے ملک میں شروع ہوئے سو سال سے زیادہ ہو گئے ہیں۔ ہندوستان کے پاس اساتذہ کی تعلیم یعنی ٹیچر ایجوکیشن کے لیے دنیا کا سب سے بڑا نظام موجود ہے اور یونیورسٹیوں میں، شعبہ تعلیم اور ان کے ملحقہ کالجوں کے علاوہ حکومتی اور حکومت کی مدد سے چلنے والے ادارے، نجی اور سیلف فائننسنگ کالجس اور اوپن یونیورسٹیاں بھی اساتذہ کی تعلیم کے فروغ میں مصروف عمل ہیں۔ ہندوستان کا اپنا روایتی نظام تعلیم بھی ہے جسے 'گروکل' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ گروکل نظام تعلیم انیسویں صدی کی پہلی چوتھائی تک جاری رہا جب یہاں کے روایتی اسکولوں کی جگہ یورپ کے اسکولوں جیسے نئے اسکولوں نے لے لی۔ اس وقت یہ محسوس کیا گیا کہ روایتی اسکول کے اساتذہ بچوں کو وہ تعلیم نہیں دے سکتے جس کی تعلیم انھوں نے خود نہیں لی ہے، لہٰذا اساتذہ کی تربیت پیشہ ورانہ تعلیم ہی پر مبنی ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ 1815 سے 1854 کے درمیان اساتذہ کی تربیت متعارف کیے جانے کی ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی تھی، ان ہی آرا نے بتدریج ملک میں عام اسکولوں کے قیام کی راہ ہموار کی۔ چنانچہ 1856 میں پہلے عام اسکول کے قیام کے ساتھ ہی اساتذہ کی تربیت ہندوستان کے تعلیمی نظام کا لازمی حصہ بن گیا۔ ہندوستانی تعلیمی کمیشن (1882) نے جسے ہنٹر کمیشن کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، ابتدائی اور ثانوی تعلیم سے جڑے اساتذہ کے لیے علیحدہ تربیتی پروگرام شروع کیے جانے کی اجازت دے دی۔ کچھ منتخب شہروں میں یونیورسٹیوں سے منسلک تربیتی کالج کھولے گئے۔ ان کالجوں کے ذریعے چلائے جانے والے پروگرام کو Licentiate in Teaching کہا جانے لگا جسے بعد میں B.Ed. کی ڈگری کی حیثیت حاصل ہوئی۔ اس طرح اساتذہ کی تعلیم (Teacher Education) کا باضابطہ نظام وجود میں آیا جو سو سال سے زائد وقت گزرنے کے باوجود بھی اپنی ابتدائی شکل سے بڑی حد تک مشابہت رکھتا ہے۔

ثانوی یا سیکنڈری اسکولوں میں تدریس کے لیے جو کورس ان دنوں رائج ہے اسے B.Ed کہا جاتا ہے جس کی معیاد پہلے ایک سال کی تھی لیکن سال 2015 سے این سی ٹی ای (National Council for Teacher Education) کے ذریعے اس کی معیاد کو ایک سال سے بڑھا کر دو سال کر دیا ہے۔ موجودہ دور میں ہندوستان کی تقریباً یونیورسٹیاں یہ یا اس کے مساوی ڈگری فراہم کرتی ہیں۔

اگر ہم ٹیچر ایجوکیشن کے سلسلے میں حکومتی کاوشوں کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ تمام کوششیں 1854 کے ووڈس ڈسپیچ (Wood's Dispatch) کے نتیجے میں کی گئی ہیں۔ ووڈس ڈسپیچ میں اساتذہ کی تربیتی سہولیات کی کمی کو تسلیم کیا گیا اور اس کے بلا تاخیر قیام کی خواہش ظاہر کی گئی۔ تعلیمی نظام میں آئے اس وسیع تنوع کے پیش نظر انڈین ایجوکیشن کمیشن 1882 نے ہندوستان میں ٹیچر ایجوکیشن میں پیش رفت کے لیے حتمی ہدایات بھی فراہم کیا۔ کمیشن نے نہ صرف یہ کہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے لیے اساتذہ کے تربیتی پروگرام کی منظوری دی بلکہ ثانوی اسکولوں کے لیے علیحدہ پروگرام کی بھی سفارش کی جو اعلیٰ معیار، ساخت اور طریقہ کار پر مشتمل ہوں۔

ٹیچر ایجوکیشن کی تاریخ اور اس میں ہونے والی ترقی پر نظر ڈالیں تو اسے تین شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

1۔ قبل از ملازمت تعلیم برائے اساتذہ (Pre-Service Teacher Education) میں توسیع۔

2۔ غیر تربیت یافتہ اساتذہ (Untrained Teachers) کے مسئلے کے حل کے لیے اضافی راہیں ہموار کرنا۔ اور

3۔ دوران ملازمت تعلیم برائے اساتذہ (In-Service Teacher Education) میں توسیع۔

اگر غیر تربیت یافتہ اساتذہ کی موجودگی اور ان کے مخصوص گروپ کے لیے تربیت کی فراہمی جو کسی خاص شعبے اور ضرورت کی نمائندگی کرتے ہیں تو مراسلاتی کورس یا فاصلاتی تعلیم کے پروگرام ان اقدام کی نمائندگی کرتے ہیں جو ٹیچر ایجوکیشن کو مخصوص شعبوں کے لیے مزید بہتر بنا رہے ہیں۔

عام طور پر ملک میں ٹیچر ایجوکیشن کے دو طریقے ہیں جو دوران ملازمت اور قبل از ملازمت ہیں:

قبل از ملازمت تربیت: ان نوواردوں کو دی جاتی ہیں جنھوں نے عمومی تعلیم حاصل کی ہے اور استاذ کے طور پر درس وتدریس کے پیشے میں شامل ہونے سے پہلے تدریسی تربیت حاصل کرنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔

دوران ملازمت تربیت: ان اساتذہ کو فراہم کی جاتی ہے جو باقاعدہ درس وتدریس کے پیشے سے وابستہ ہوتے ہیں تاکہ وہ اپنے مضمون اور تدریسی تکنیک، طریقوں اور مہارتوں میں ہونے والی تازہ ترین ترقی کے ساتھ خود کو ہم آہنگ کر سکیں۔

ٹیچر ایجوکیشن کی بڑھتی مانگ اور پہلے سے موجود غیر تربیت یافتہ اور کم تعلیم یافتہ اساتذہ جو ملک کے تعلیمی شعبے سے کسی نہ کسی سطح پر جڑے ہیں، یہ ملک میں چلنے والے قبل از ملازمت تعلیم برائے اساتذہ (Pre-Service Teacher Education) کی تکمیل میں بڑی رکاوٹ ہے۔

غیر تربیت یافتہ اساتذہ کو ان کی پیشہ ورانہ صلاحیت کی بہتری کے مواقع فراہم کرنے کی ضرورت ہمیشہ محسوس کی جا رہی تھی جس میں معیار کے ساتھ کوئی سمجھوتہ بھی نہ کرنا پڑے۔ معیاری تعلیم کا انحصار پوری طرح سے مدرسین کی معیاری تربیت پر منحصر ہے۔ مدرسین کی کارکردگی کی بنیاد ان کی ماقبل ملازمت تربیت اور برسرخدمت تربیت پر ہوتی ہے۔ فاصلاتی تعلیم نے اسے ایک نئی زندگی اور مقبولیت عطا کی ہے۔ وقت کی اس ضرورت کا ادراک کرتے ہوئے یو جی سی (University Grants Commission) نے 1993 میں پروفیسر رام لعل پاریکھ کی صدارت میں ایک کمیٹی بنائی۔ کمیٹی نے فاصلاتی نظام کے تحت B.Ed کورس کے لیے خصوصی سفارشات کیں اور درج ذیل تفصیلات فراہم کیں:

- کورس کی معیاد
- داخلہ کیے جانے والے طلبہ کی تعداد
- اہلیت
- اسٹاف

- تدریسی طریقہ کار
- انٹرن شپ

یو جی سی (University Grants Commission) نے فاصلاتی B.Ed کورس کے تجزیہ کے لیے 1994 میں پروفیسر کھیر مالگنڈوہ کی سربراہی میں ایک دوسری کمیٹی قائم کی۔ اس کمیٹی نے بھی اپنی رپورٹ میں کورس کی معیاد، طلبہ کی تعداد، اہلیت، ذاتی رابطہ پروگرام، تفویضات، تدریسی مشق اور تعلیمی مواد سے متعلق اپنی سفارشات پیش کیں۔

اس کے علاوہ متعدد کمیٹیوں اور کمیشنوں نے بھی وقت بہ وقت فاصلاتی تعلیمی نظام کے تحت B.Ed کورس شروع کرنے پر زور دیا اور معیار کو یقینی بنانے کے لیے سفارشات کیں۔

فاصلاتی تدریس اپنی ابتدائی شکل میں (جو خط و کتابت اور مطبوعہ مواد پر مبنی تھا) کئی علاقوں میں آزادی کے ابتدائی برسوں میں شروع ہوئی اور ٹیچر ایجوکیشن میں اس کی شمولیت غیر تربیت یافتہ اساتذہ کے بوجھ کو کم کرنے کے لیے ہوئی۔ دہلی یونیورسٹی کے سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن (Central Institute of Education) نے پہلا فاصلاتی بی ایڈ کورس 1966 میں شروع کیا جس کے بعد علاقائی کالجوں (Regional Institutes of Education) نے اس کی تقلید کی۔ ان تعلیمی پروگراموں نے کیندریہ ودیالیہ سنگھٹن اور دوسرے اداروں کے غیر تربیت یافتہ اساتذہ کو یہ موقع دیا کہ وہ B.Ed کی سند حاصل کر سکیں۔

کوٹھاری کمیشن (1964-66) جو ہندوستان میں تعلیمی فروغ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے اس نے بھی ٹیچر ایجوکیشن کے لیے کئی سفارشات کی تھی جو مندرجہ ذیل ہیں:

- اساتذہ کے لیے برسر ملازمت پروگرام کا اہتمام ہونا چاہیے اور ہر سطح پر یعنی پرائمری، ثانوی اور یونیورسٹیوں کی سطح پر کیا جانا چاہیے۔
- لگاتار تعلیمی سروس تحقیق کے ان پٹ پر مبنی ہونا چاہیے۔
- ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کو بارہ مہینے کی بنیاد پر برسر ملازمت پروگرام کا انتظام کرنا چاہیے۔
- ریفریشر کورس، ورکشاپ، سیمینار اور سمپوزیم کے طور پر تعلیمی عمل کی کارفرمائی کی جانی چاہیے۔

قومی تعلیمی پالیسی (1986) جو تعلیم کے لیے سنگ میل ثابت ہوا ہے، ان پالیسیوں کے بڑے دوررس نتائج برآمد ہوئے اور اسکول کے ٹیچرس کے Orientation نے بڑے پیمانے پر زور پکڑا۔ پچھلے کچھ سالوں میں ایسے اداروں کو مستحکم اور اضافہ کرنے کی کوششیں کی گئیں جہاں برسر ملازمت تربیت دی جاسکیں۔ ضلع کی تعلیم و تربیت کے ادارے DIET-District institute of IASE-Institute of Education and Training اور CTEs-Advanced Studies in Education Colleges of Teacher Education کے درمیان نیٹ ورک بنانے کی کوشش کی گئی جس کا اہم مقصد یہ تھا کہ پرائمری اور ثانوی اسکول کے ٹیچروں کو دوران ملازمت پیشہ ورانہ تربیت دینا اور انھیں درس و تدریس کے اہم تقاضوں سے واقف کرانا۔ ان کے مرکزی مقاصد میں شامل ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ آزادی کے بعد ہی سے ہندوستان اپنے محدود وسائل کے باوجود تعلیمی ترقی کی راہ پر گامزن رہا ہے اور یکے بعد دیگرے حکومتوں کی یہ کوشش رہی کہ ہندوستان کا ہر شہری زیور تعلیم سے آراستہ ہو۔ صد فیصد تعلیم کے ہدف کو حاصل کرنے کے لیے ہندوستان نے مختلف پالیسیاں وضع کی اور مختلف طریقہ کار اور نظام تعلیم سے استفادہ کیا ہے جس میں فاصلاتی تعلیم خصوصی طور پر قابل ذکر ہے۔ حالانکہ مختلف علاقوں، اداروں اور مختلف سطحوں پر ان کا تعلیمی معیار اور ذریعہ تعلیم مختلف ہونے کے سبب فاصلاتی تعلیمی نظام کے مطابق عوام الناس کی آرا مختلف ہیں مگر اپنی بیکراں وسعت و رسائی کی صلاحیت کی وجہ سے یہ نظام ملک گیر پیمانے پر پھیلتا جارہا ہے اور جدید ٹکنالوجی کے استعمال سے یہ مزید مستحکم بھی ہورہا ہے۔ فاصلاتی تعلیم کی روز افزوں مقبولیت و افادیت کے سبب جہاں مختلف کورسیز اس کے دائرے میں شامل ہوئے ہیں وہیں ٹیچر ایجوکیشن نے بھی خصوصیت سے اس میں جگہ پائی ہے اور بلاشبہ مقبول عام و خاص ہورہی ہے جو ملک کے تعلیمی نظام کے استحکام کی طرف مثبت اور نہایت کارآمد قدم تصور کیا جاتا ہے۔

References

- Aggarwal, J.C. (1998). Teacher Education- Theory and Practice, New Delhi: Doaba House.
- Chauhan, Poonam. (2001). Restructuring of Teacher Education for Quality Improvement. University News, Vol. 39, No 53, December 31.
- Garg, B.R. (2000). Issues in Teacher Education. Ambala Cantt: The Indian Publications.
- Handbook of Distance Education. (1992). Association of Indian Universities, New Delhi.
- Kachroo, K.B.(1999). Distance Education Programme at College and University Levels in Jammu.
- Khan, Riaz Shakir. (1998). NCTE Initiative for Quality Teacher Education. New Delhi: NCTE.
- Mishra, K.M. (1989). Distance Education in India; Status and Perspective for further development. Indian Journal of Distance Education.
- Rathor, H.C.S., "Pre-service Training of Teachers through Distance Education: Critical Appraisal and Suggestions."
- Study Materials of Indira Gandhi National Open University, New Delhi.

اصول تعلیم، خواجہ غلام السیدین، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

تعلیم سماج اور کلچر، اے۔ کے۔ سی۔ اوٹاوے، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

■

Dr. Md. Athar Hussain, Asst. Prof. (Education), Maulana Azad National Urdu University, Gachibowli, Hyderabad - 500032 (AP)

مصنف: ایم جے وارثی
مترجم: نسیم احمد

یونیورسٹیوں کے نصاب میں اردو کی شمولیت

ماشاء اللہ میں لکھ سکتی ہوں، پڑھ سکتی ہوں، اردو بول سکتی ہوں اور ہندی سمجھ سکتی ہوں۔ یہ الفاظ میری ایک شاگردہ عائشہ صبر کے ہیں جنھوں نے سینٹ لوئس میں واشنگٹن یونیورسٹی سے گریجویشن کیا ہے۔ زبان کسی بھی ثقافت کی روح اور اس کی شناخت اور ربط وضبط کا اہم ذریعہ ہوتی ہے۔

اپنے کلچر کی بنیاد کے تحفظ اور اس کی بقا کے لیے اپنی زبان کا علم کلیدی اہمیت کا حامل ہے۔ حالیہ برسوں میں امریکہ میں کلچر کے تئیں بیداری میں اضافہ ہوا ہے اور اسی وجہ سے ثقافتی طور پر اردو مقبول ہوئی ہے۔

میرے خیال میں اردو کی اپنی اہمیت ہے اور اس کا اپنا ایک الگ انفرادی مقام ہے۔ کیونکہ یہ وہ زبان ہے جو دنیا کے کئی ملکوں میں بولی جاتی ہے۔ ہندوستان میں بھی لگ بھگ ایک تہائی ہندو آبادی، آدھے بودھ اور 70 فیصد مسلمان اردو ہی بولتے ہیں۔ 9/11 کے سانحے کے بعد تبدیلی صرف امریکہ ہی میں نہیں آئی بلکہ دنیا بھر میں تبدیلی محسوس کی گئی ہے اور اب لوگوں میں اپنی ثقافت کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل کرنے کا ایک رواج ہو گیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اردو امریکہ میں مقبول ہو رہی ہے۔

اس صورت حال کے مدِ نظر متعدد یونیورسٹیوں نے اردو کو اپنے نصاب میں شامل کرلیا ہے۔ یونیورسٹیوں میں اردو کے اعتراف اور مختلف نوعیت کے مواقع کی پیش کش کی بدولت جنوبی ایشیا کے طلبا باہر نکل کر اردو کے جامع تجربات سے محظوظ ہو رہے ہیں۔ اسی وجہ سے اردو نہ جاننے والے افراد کو بھی اردو سیکھنے اور اس ثقافت کو سمجھنے کے لیے مواقع فراہم کیے جا رہے ہیں۔

مثال کے طور پر اردو زبان کی ایک خاصیت یہ ہے کہ اس میں ایسے الفاظ ہیں جن سے عزت اور احترام اور ادب کا اظہار ہوتا ہے۔ ان الفاظ کا استعمال عموماً معمر افراد یا ان لوگوں کے ساتھ کیا جاتا ہے جن سے آپ واقف نہ ہوں۔ اسی خاصیت کی وجہ سے دیگر نسلی طبقات کے اراکین کو جنوبی ایشیا کی ثقافت اور رواجوں کے بارے میں جاننے کا موقع ملتا ہے۔

دنیا بھر میں ویب کی مقبولیت کی بدولت کوئی بھی شخص ویب سائٹ پر اردو طرز تحریر، نسخ اور نستعلیق میں بآسانی دستیاب غالب، اقبال اور فیض کی شاعری سے محظوظ ہو سکتا ہے۔ ویب سائٹ پر اردو کی وسیع تر موجودگی کی وجہ سے امریکہ کے متعدد شہروں میں متعدد الفاظ مثلاً ہلال، عید، بریانی، رمضان، مہندی، کباب اور متعدد دیگر الفاظ مستعمل ہیں۔ بی بی سی اردو اور متعدد دیگر پورٹلوں پر اردو خبریں بآسانی دستیاب ہیں۔

اردو جنوبی ایشیا کی اسلامی ثقافت اور تاریخ کی بنیادی زبانوں میں سے ایک اہم زبان ہے۔ جنوبی ایشیا میں بیشتر اسلامی ادب اردو زبان میں ہی دستیاب ہے اور امریکہ میں اردو کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لوگوں میں جنوبی ایشیا کی اسلامی روایات کے بارے میں زیادہ جاننے کی خواہش بڑھ رہی ہے۔ اردو اپنے رومانی ادب خصوصاً اس کی شاعری، غزلوں اور مثنوی کی وجہ سے زیادہ مقبول ہے۔ اردو کی تعلیم اس وسیع طبقاتی کیمپس کا لازمی جز ہے جس کی عظیم لسانی و ثقافتی تاریخ ہے اور جوان تارکین اور ان کے بچوں کی دین ہے جو امریکہ آکر بس گئے ہیں۔ زیادہ تر طلبا اپنی لسانی ضروریات کی تکمیل کے لیے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اردو کا انتخاب کرتے ہیں۔

جنوب ایشیائی طلبا کی انجمن امریکہ میں مختلف یونیورسٹیوں میں ہر سمسٹر میں ثقافتی ہفتے کا اہتمام کرتی ہے جن کے دوران عید، دیوالی، عیدالاضحیٰ و ہولی جیسے تیوہار منائے جاتے ہیں۔ ان ثقافتی پروگراموں میں تمام لوگ چاہے وہ اپنے پس منظر سے وابستہ نہ ہوں ان کی موسیقی، زبان وادب، تفریحی کھیل کود کے پروگراموں اور سیاست وغیرہ سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

یہ ثقافتی پروگرام ان لوگوں سے دوستیاں قائم کرنے اور ربط وضبط استوار کرنے کے مواقع فراہم کرتے ہیں جن سے شاید آپ پہلے کبھی نہ ملے ہوں۔ مجھے یہ بات میرے ایک شاگرد نے بتائی ہے۔

جنوب ایشیائی لوگوں کی مجموعی تاریخ

لارا اولیور (Laura Olivier) سینٹ لوئس میں واشنگٹن یونیورسٹی کی ایک گریجویٹ ہیں جنھوں نے اسٹڈی ابروڈ پروگرام کے تحت لکھنؤ میں اردو کی تعلیم حاصل کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ''زبان محض ایک ذریعہ ترسیل نہیں ہے۔ یہ ایک طبقے کی مجموعی تاریخ اور وراثت کا خزانہ ہے۔ یہ بولنے والوں کو شناخت فراہم کرتی ہے جو اس کو ایک ایسے سماجی بندھن میں باندھتی ہے جس سے فرد کی کامیابی کی راہ زیادہ آسان ہو جاتی ہے۔''

عابدہ صادق ایک 51 سالہ فیجی۔ امریکی خاتون ہیں جو برسوں سے کیلی فورنیا کے ہورڈ میں مقیم ہیں۔ انھوں نے اردو کی اہمیت اور افادیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ''اردو زبان و ثقافت سے ان کے بچوں کو ان کی بنیاد پہچاننے میں مدد ملے گی اور ان کی یہ روایت ان کے بچوں کو مستقل مزاج بنائے گی جس سے آنے والی نسلوں کے لیے ثقافت محفوظ ہوگی۔''

مشاعرہ بھی ایک ایسی ثقافتی اور ادبی تقریب ہے جس کی مقبولیت میں امریکہ میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ ان مشاعروں میں زیادہ مقبول وہ مشاعرے ہیں جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق طلبا کی انجمن امریکہ کے مختلف شہروں میں منعقد کراتی ہے۔ ان مشاعروں کو سرسید ڈے، بینکوئٹ اور بین الاقوامی مشاعروں کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔

کمیونٹی کی خدمت کے لیے خود کو وقف کردینے والے ڈاکٹر شہیر خاں، ڈاکٹر عبداللہ اور افضال عثمانی اس عظیم روایت کے روح رواں ہیں۔ انھوں نے اس روایت کا آغاز واشنگٹن ڈی سی سے کیا تھا۔ اس کی مقبولیت نے بتدریج پورے امریکہ کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ اس مشن کے بڑے حامی شہیر خان کا خیال ہے کہ ''آج کل امریکی مشاعروں میں برصغیر سے شاعروں کو مدعو کیا جاتا ہے جو اپنی روایات کو زندہ رکھنے کی ایک کوشش ہے۔''

ایک مشاعرے میں شرکت کے بعد برکلے میں کیلی فورنیا یونیورسٹی کی ایک سابق طالبہ رابعہ صدیقی نے اطمینان بخش اور پرجوش انداز میں کہا ''ماشاء اللہ امریکہ میں اب اردو فروغ پا رہی ہے۔''

(مصنف لسانیات کے ماہر ہیں اور واشنگٹن یونیورسٹی سینٹ لوئس، امریکہ میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔)

(ترجمہ: انگریزی سے اردو)

M.J.Warsi
Naseem Ahmad
19/402 Satyam, Wasundhra
Ghaziabad - 201012 (UP)

فیروز بخت احمد

مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت

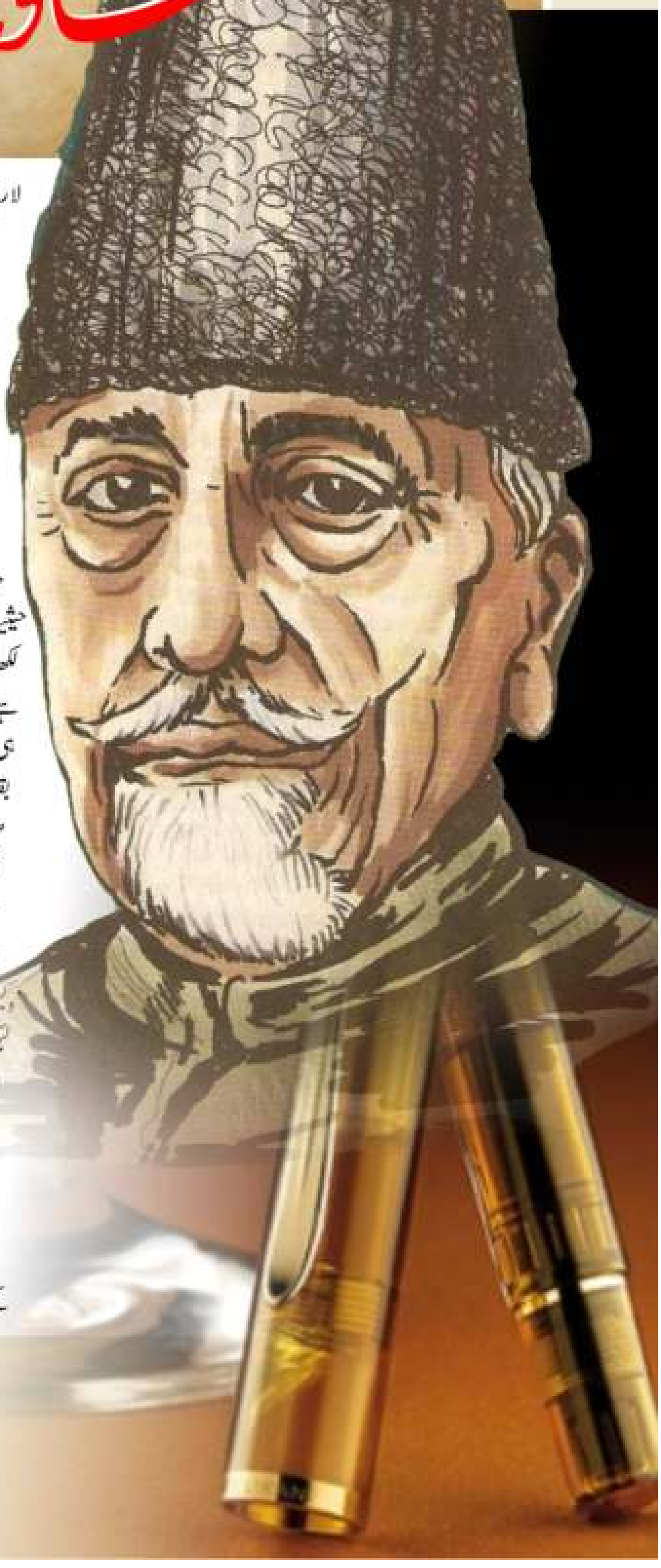

لارڈ جارج سے ایک بار کسی نے دریافت کیا کہ صحافی بننے کے لیے ایک انسان کو کیا کیا جاننا چاہیے؟ انھوں نے جواب دیا، ''سب کچھ اور کچھ نہیں یعنی کہ صحافی دراصل وہ ہے جو کہ دنیا کی تقریباً تمام باتوں کو جانے لیکن ماہر کسی کا نہ ہو!'' لیکن مولانا کی یہ عجیب و غریب خصوصیت کہ وہ بہت کچھ جانتے تھے اور جو کچھ جانتے تھے ماہرانہ حیثیت سے جانتے تھے۔ جس موضوع پر بھی لکھا، اپنا سکہ جمایا۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جس کی نظیر دنیائے صحافت میں مشکل ہی سے ملتی ہے۔

بقول نیاز فتح پوری ''مولانا کے دور صحافت کا تاریخی تعین دشوار ہے کیونکہ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اس کا آغاز کب سے سمجھا جائے۔ مولانا کی علمی و صحافتی زندگی کے سلسلے میں رسالہ 'مخزن'، اخبار 'وکیل' اور 'الندوہ' کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی ابتدا 'لسان الصدق' کے اجرا سے ہوتی ہے جسے انھوں نے جاری کیا، خود مرتب کیا اور خود ہی بند کر دیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ جس فضا و ماحول میں رہ کر اسے جاری کیا گیا تھا، وہ مولانا کے لیے بہت تنگ تھی اور وہ بہت سی باتیں جنھیں مولانا کھل کر کہنا چاہتے تھے کہہ نہیں پاتے تھے۔ یہ زمانہ مولانا کی بہت کم سنی کا تھا اور اتنی کم سنی کہ اس عمر میں لوگ اپنی تعلیم بھی ختم نہیں کر سکتے۔

حریت کے شیدائیوں، مظلوموں اور بیکسوں کی صدا کو اپنی صحافت کے ذریعے بین الاقوامی سیاسی شعور دے کر مولانا آزاد نے معاشرے میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ 1899 میں انھوں نے 'المصباح' کی ادارت کی۔ ان کا تعلق 1901 میں مولوی سید احمد حسن فتح پوری کے 'احسن الاخبار' اور 'تحفۂ احمدیہ' سے بھی رہا۔ 'احسن الاخبار' کی ادارت کی بیشتر ذمے داری مولانا ہی انجام دیتے تھے۔ وہ عربی اخباروں کے مضامین اور خبروں کے انتخاب و ترجموں کے کام بھی انجام دیتے تھے۔ پھر انھوں نے 'لسان الصدق' (1904) اور 'خدنگ نظر'، 'ایڈورڈ گزٹ'، 'مرقع عالم'، 'البصائر'، 'مخزن'، 'الندوہ'، 'وکیل'، 'دارالسلطنت'، 'الہلال'، 'البلاغ'، 'اقدام'، 'پیغام'، 'الجامعہ'، 'پیام'، 'المصباح'، 'زمیندار'، 'البشیر'، 'مسلم گزٹ'، 'مساوات'، 'ثقافت الہند' وغیرہ میں نہ صرف مضامین دیے بلکہ ان میں سے بہت سوں کی ادارت بھی کی۔

مولانا کے صحافتی سفر کے شروعاتی دور کا ایک واقعہ نیاز فتح پوری کچھ اس طرح سے بیان کرتے ہیں۔ 'علامہ رشید رضا، ایڈیٹر 'المنار' ایک عظیم الشان اجتماع میں تقریر کرنے جا رہے تھے جو بڑے بڑے علما پر مشتمل تھا۔ ضرورت ایک ایسے شخص کی پڑی کہ جو عربی اور اردو دونوں کا ماہر ہو اور ان کی عربی تقریر کا برمحل ترجمہ کرتا جائے۔ مولانا شبلی کے منصب سے یہ بات فروتر تھی کہ وہ خود اس خدمت کو انجام دیں۔ لہٰذا وہ بڑے متفکر تھے۔ آخر ''جز قیس کوئی اور نہ آیا بروئے کار'' مولانا ابوالکلام بے تکلفانہ

سامنے آجاتے ہیں اور اس خدمت کو اتنی خوبی و دلکشی سے انجام دیتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ترجمہ نہیں بلکہ خود تقریر کر رہے ہیں۔

یہ تھا مولانا کی ذہانت و قابلیت کا پہلا عملی مظاہرہ جسے کھلے اسٹیج پر سیکڑوں مدعیانِ فضل و کمال نے دیکھا۔

مولانا نے 'لسان الصدق' جاری کیا 'لسان الصدق' کی ادارت کے زمانے میں مولانا آزاد کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی تھی اور بہت سے لوگ ان کے مداح بن گئے تھے۔ انھیں میں ایک صاحب شیخ غلام محمد امرتسر کے رہنے والے تھے۔ وہ اس زمانے کے مشہور سہ روزہ اخبار 'وکیل' کے مالک تھے جو امرتسر سے شائع ہوتا تھا۔ جب مولانا آزاد نے اکتوبر 1905 سے مارچ 1905 تک 6 مہینے 'الندوہ' سے وابستہ رہنے کے بعد کسی وجہ سے خود بخود تعلق قطع کر لیا تو شیخ غلام محمد نے انھیں امرتسر آنے اور 'وکیل' کی ادارت سنبھالنے کی دعوت دی۔ اس پر مولانا امرتسر چلے گئے اور انھوں نے اپنے زمانۂ ادارت میں 'وکیل' میں بہت خوش گوار تبدیلیاں کیں جس سے پرچے کی مقبولیت میں اضافہ ہوا لیکن ایک نجی حادثہ ایسا پیش آگیا کہ انھیں بادلِ نخواستہ جلد ہی امرتسر سے واپس جانا پڑا۔

مولانا آزاد کے ایک بڑے بھائی مولانا ابو النصر غلام یٰسین آہ یعنی اس ناچیز کے دادا تھے دونوں بھائیوں کی تعلیم ایک نہج اور معیار پر ہوئی تھی۔ ان کے والد مولانا خیر الدین کا پیری مریدی کا سلسلہ بھی تھا۔ کلکتہ اور بمبئی کے اطراف میں ان کے مریدوں کی خاصی تعداد تھی۔ وہ بڑے بیٹے غلام یٰسین آہ کو اپنی جانشینی کے لیے تیار کر رہے تھے۔ آہ بھی ہُو بَہُو میں اپنے والد کے نقشِ قدم پر تھے لیکن خدا کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے۔ آہ عراق کے سفر پر گئے اور وہاں بیمار ہو گئے۔ حالت خراب سے خراب تر ہو گئی۔ وہ بمبئی واپس آئے تا کہ وہاں علاج ہو سکے۔ والد کلکتہ سے بمبئی پہنچے اور انھیں ساتھ لے گئے لیکن ان کا وقتِ اخیر آ پہنچا تھا۔ کلکتہ پہنچنے کے بعد وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اپنے پیچھے وہ اپنی واحد اولاد نور الدین احمد صاحب یعنی راقم کے والد کو چھوڑ گئے تھے جن کی پرورش کی ذمے داری کا بوجھ مولانا پر بھی آ گیا تھا۔ یہ وسط 1906 کی بات ہے جب مولانا آزاد امرتسر میں وکیل سے وابستہ تھے۔ مولانا خیر الدین نے انھیں لکھا کہ اب تم گھر آ جاؤ اور کام کاج میں ہاتھ بٹاؤ۔ یہ ابھی جانے کی سوچ ہی رہے تھے کہ نومبر 1906 کو والد نے ایک آدمی امرتسر بھیج دیا تا کہ انھیں اپنے ساتھ لے آئے۔ اب کوئی چارۂ کار نہیں رہ گیا تھا۔ یہ کلکتہ چلے گئے۔ امرتسر کا زمانۂ قیام اپریل 1906 سے نومبر 1907 یعنی صرف آٹھ مہینے رہا۔ وہ والد کے حکم کی تعمیل میں مجبوراً کلکتہ چلے گئے لیکن سچ یہ ہے کہ وہاں جو کام ان کو سپرد کیا گیا، وہ کسی عنوان ان کی پسند کا نہیں تھا۔ مریدوں کی تعلیم و تربیت اور وعظ وغیرہ سے وہ کوسوں دور تھے۔ ادھر اخبار نویسی کا مشغلہ ان کا دل پسند و مرغوب کام تھا۔ شیخ غلام محمد بھی ان کے کام سے ہر طرح مطمئن اور خوش تھے۔ قصہ کوتاہ چند دن بعد انھوں نے اپنے والد سے کھل کر کہہ دیا کہ وہ اس پیری مریدی کے سلسلے کو جاری نہیں رکھ سکتے۔ نہ انھیں یہ پسند ہے کہ لوگ آئیں اور ان کے ہاتھ پاؤں کو فرطِ عقیدت سے بوسہ دیں۔ والد آدمی سمجھدار تھے۔ انھوں نے دیکھ لیا کہ یہ بیل منڈھے چڑھنے کی نہیں۔ ان کی مرضی کے خلاف انھیں کسی کام پر مجبور کرنے سے کیا فائدہ۔ انھوں نے اجازت دے دی کہ اچھا اگر یوں ہے تو وہ واپس امرتسر جا سکتے ہیں۔ اس پر

> **جب جب جدوجہد آزادی ہند کی بات کی جائے گی تو مولانا ابو الکلام آزاد کے پرچہ 'الہلال' کا ضرور ذکر ہوگا. مولانا اپنے جن کمالات، خصوصیات و امتیازات کے توسط سے تمام ملک پر چھائے ہوئے تھے اور جن کی نابغۂ روزگار شخصیت، غیر معمولی ذہنی و دماغی قابلیت نے لوگوں کے دل و جان پر اپنے گہرے نقش چھوڑے تھے. اس کی وجہ ان کی صحافت تھی۔**

وہ اگست 1907 میں امرتسر چلے گئے اور دوبارہ 'وکیل' کی ادارت کی باگ ڈور ان کے سپرد کر دی گئی۔ لیکن اب ان کی صحت جواب دے گئی اور وہ بیمار رہنے لگے۔ سال بھر ہی مشکل سے وہاں رہے اور اگست 1908 میں 'وکیل' سے الگ ہو گئے۔

مولانا کی عمر اس وقت 20 سال کے لگ بھگ تھی اس دوران انھوں نے کئی پرچوں میں کام کیا۔ ان میں سے بعض ان کی ذاتی ملکیت تھے۔ بعض دوسروں کے کہ جہاں وہ تنخواہ پر ملازم کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ وہ کہیں بھی رہے ہوں، ان کا نصب العین ہمیشہ بلند رہا۔ ان کی یہی خواہش اور کوشش رہی کہ صحافت کو ملک و ملت کی بہتری اور بہبودی، خدمت گزاری اور خیر خواہی کا وسیلہ بنایا جائے۔

'وکیل'، 'زمیندار'، 'مسلم گزٹ'، 'پیسہ اخبار'، 'مشرق'، 'حبل المتین'، 'مسلمان'، 'الحکم'، 'الحق'، 'ہمدرد' اور انگریزی کا 'کامریڈ'، سب کے سب پان اسلامی (Pan Islamic) رنگ میں ڈوبے ہوتے تھے اور اسلام و مسلمانوں کے بارے میں لکھتے وقت 'الہلال' کا نام ان اخباروں سے بالکل مختلف نہ تھا۔ 'الہلال' کی اصل خصوصیت مولانا کا مخصوص انداز تحریر تھا، جذباتی قسم کا اسلوب بیان جس میں تحریروں میں خطابت کی شان نظر آتی تھی۔ جملوں اور لفظوں کے تو وہ بادشاہ تھے۔ محض ترتیب کے الٹ پھیر سے اپنی تحریروں میں گرمی پیدا کر دیتے تھے جس کی آنچ مدھم ہوتے ہوتے بھی پڑھنے والے کے شعور کو بے بس کر جاتی تھی۔

اور سب باتوں کو چھوڑ کر 'الہلال' کے صرف ادارۂ تحریر کو لیجیے تو حیرت ہوتی ہے۔ مولانا آزاد کے علاوہ اس میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبداللہ عمادی، مولانا عبد السلام ندوی اور بعض دوسرے اصحاب کام کرتے تھے۔ ان سب کو باقاعدہ تنخواہ ملتی تھی۔ شاید ہی کسی ہفتہ وار، پندرہ روزہ یا ماہنامہ کو ایسا ادارۂ تحریر نصیب ہوا ہو۔ پھر اس کے مضمون نگاروں میں ملک کے صف اول کے ادیب اور انشا پرداز شامل تھے۔

مولانا ابو الکلام آزاد شروع سے ہی ہندوستان کی آزادی اور باہمی ہم آہنگی و یگانگی کے علمبردار رہے۔ ان کے صحافتی سفر کا باقاعدہ آغاز 13 جولائی 1912 میں ہوا جب انھوں نے کلکتہ سے 'الہلال' جاری کیا۔ یہ ایک ایسا اخبار تھا کہ جس نے قومی جذبات اور سیاسی شعور کو بیدار کر کے ملک میں تہلکہ مچا دیا اور ہندوستان پر قابض انگریزی ایوانِ حکومت میں زلزلہ پیدا کر دیا۔

مولانا ابو الکلا م آزاد شروع سے ہی ہندوستان کی آزادی اور باہمی ہم آہنگی ویگانگی کے علمبردار رہے۔ ان کے صحافتی سفر کا باقاعدہ آغاز 13جولائی1912 میں ہوا جب انہوں نے کلکتہ سے 'الہلال' جاری کیا۔ یہ ایک ایسا اخبار تھا کہ جس نے قومی جذبات اور سیاسی شعور کو بیدار کرکے ملک میں تہلکہ مچادیا اور ہندوستان پر قابض انگریزی ایوانِ حکومت میں زلزلہ پیدا کر دیا۔

'الہلال' صرف اخبار ہی نہ تھا بلکہ انگریزی حکومت کے خلاف تحریک بھی تھی جس نے ملت کے سرد و منجمد لہو کو گرم اور رواں دواں کر دیا۔ مردہ دلوں میں نئی جان ڈال دی، مظلوموں اور مغلوبوں کو آزادی کا شیدائی و فدائی بنا دیا۔ اس کی للکار اور پکار نے غلاموں کو زنجیرِ غلامی توڑنے کی توفیق دی اور شعلہ حیات بھڑکا دیا۔

جب جب جدوجہد آزادی ہند کی بات کی جائے گی تو مولانا ابوالکلام آزاد کے پرچہ 'الہلال' کا ضرور ذکر ہوگا۔ مولانا اپنے جن کمالات، خصوصیات و امتیازات کے توسط سے تمام ملک پر چھائے ہوئے تھے اور جن کی نابغۂ روزگار شخصیت، غیر معمولی ذہنی و دماغی قابلیت نے لوگوں کے دل و جان پر اپنے گہرے نقش چھوڑے تھے، اس کی ایک وجہ ان کی صحافت تھی۔

صحافت کا مقصد ان کے نزدیک اخلاص اور بے لوثی سے ملک و ملت کی خدمت کرنا تھا۔ یہ بات صاف ہے کہ انھوں نے اسے کمائی کا ذریعہ کبھی نہیں سمجھا، ہاں مشن ضرور مانا۔ مولانا آزاد نے صحافت کو جو عزت و وقار عطا کیا، اس کے لیے اردو زبان آج بھی ان کی مشکور ہے۔

جناب احمد سعید ملیح آبادی، مدیر روزنامہ 'آزاد ہند' کلکتہ بیان کرتے ہیں: ''جس اخبار اور رسالے کو ہاتھ لگا

دیا، اسے چار چاند لگا دیے۔ ایڈٹ کرنے کا گر مولانا نے خود اپنے لیے وضع کیا، ان کے سامنے اور اگر کوئی نمونہ تھا تو یہاں تو مصر اور ترکی کے اخبارات اور رسالے تھے جو مولانا کے پاس آتے تھے۔ مضامین کے انتخاب، موضوعات کے تعین، مسائل و مباحث کے بیان حتی کہ الفاظ و اصطلاحات کی ترجیحات اور املے کی پابندی پر بھی مولانا کی نظر اور گرفت رہتی تھی۔'' (رشید الدین خاں: ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت ص 280 مضمون: احمد سعید ملیح آبادی)

'الہلال' مولانا آزاد کی علمی، ادبی، دینی و سیاسی بصیرت کا نچوڑ تھا۔ وہ ہر اعتبار سے ایک عہد آفریں جریدہ تھا کیوں کہ اس کے مقابلے کا کوئی بھی ہفتہ وار پرچہ اب تک نہیں نکلا تھا۔ 'الہلال' کی تعریف میں ضیاء الدین اصلاحی صاحب لکھتے ہیں:

کانك شمس والملوك كواكب
اذا طلعت لم يبد منهن كواكب

(اے بادشاہ تو سورج ہے اور دوسرے سب بادشاہ ستارے ہیں/ جب سورج نکلتا ہے تو سارے ستارے غائب ہو جاتے ہیں۔)

'الہلال' اردو کا پہلا باتصویر ہفت روزہ اخبار تھا جو ترکی سے منگوائے ہوئے ٹائپ پر چھپتا تھا۔ 'الہلال' کی مقبولیت اور لوگوں کی اس کے لیے بے چینی اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ اس کے ایک پرچے کو لوگ حلقہ بنا کر سنتے اور مولانا کے ایک ایک لفظ اور فقروں پر سر دھنتے تھے۔

'الہلال' کا جادو سر چڑھ کر بولتا تھا کیونکہ یہ لوگوں کے قلوب پر چھا گیا تھا اور اس نے فکر و نظر کے زاویے بدل دیے، نئی راہیں کھولیں اور نئے اسلوب میں نیا پیام دیا۔ مسلمانوں کی حمیتِ ایمانی کو للکارا اور انگریزوں کی نفرت کا نقش ان کے دلوں پر بٹھا دیا۔ بقول ممتاز اردو ادیب مالک رام 'الہلال' کا اصلی کارنامہ اس کا اسلوب تحریر تھا جس میں رنگینی، شگفتگی اور ابداع و اختراع کی جلوہ گری تھی۔'' ڈاکٹر عابد رضا نے لکھا ہے کہ 'الہلال' کی اصل خصوصیت مولانا کا مخصوص انداز تحریر تھا۔ اس میں جذباتی قسم کا اسلوب تھا جس کی تحریر میں خطابت کی شان نظر آتی تھی۔ لفظوں کے تو وہ بادشاہ تھے اور محض ترتیب کے الٹ پھیر سے اپنی تحریروں میں وہ گرمی پیدا کر دیتے تھے۔ 'الہلال' میں مولانا نے قرآنی آیتوں اور عربی عبارتوں کو نگینے کی طرح جڑ دیا ہے۔ فارسی اشعار نے بھی ان کی تحریروں کو نکھارنے اور سنوارنے میں بڑا حصہ لیا ہے۔

'الہلال' اردو صحافت کا اہم ترین سنگ میل ہے۔ یہ جریدہ تمام تر سیاست کے لیے وقف تھا۔ پھر تفسیر کلام پاک میں اور سیاسی تعبیروں میں تاریخی عوامل و محرکات کا پورا پورا احساس تھا۔ لہٰذا صحیح معنوں میں 'الہلال' پہلا اخبار تھا جس نے اسلامی سیاست میں ایک ترقی پسندانہ اور آفاقی انداز اپنایا اور اس کی ترویج میں غیر معمولی کردار اپنایا۔

اس وقت کسی بھی رسالے کا حکومت پر تنقید کرنا آسان نہ تھا۔ یہ تو خوش قسمتی تھی کہ بنگال حکومت میں ایسے کارکنوں کی کمی تھی جو 'الہلال' کی فارسی اور عربی آمیز اردو سمجھ پاتے۔ پھر بھی لکھنؤ کے انگریزی اخبار 'پائنیر' نے حکومت کو آگاہ کیا کہ وہ پرچہ کس قدر زہر بھرا پروپیگنڈہ کر رہا ہے۔ اس بات کے لیے مولانا پہلے سے تیار تھے کہ جس طرح کا مواد وہ چھاپ رہے ہیں، اس کے پیش نظر ظالم اور جابر حکومت ان سے ایک دن ضمانت طلب کرے گی۔ چنانچہ حکومت نے ان سے پہلی مرتبہ دو ہزار روپے کی ضمانت طلب کی۔ مگر حکومت بنگال نے اس پہلی ضمانت کو ضبط کر لیا۔

'الہلال' جاری ہونے کے بعد مولانا آزاد نے 'البلاغ' نام سے نیا پریس قائم کیا اور اسی نام پر ایک اخبار نکالنے لگے۔ یہ اخبار 12 نومبر 1915 کو منظر عام پر آیا اور اس وقت تک جاری رہا جب تک انگریزوں نے اس کو بھی ضبط نہیں کر لیا۔ 'البلاغ' میں جو روح کارفرما تھی، وہ 'الہلال' سے کسی طور مختلف نہیں تھی لیکن اس میں اسلام کے اخلاقی فلسفے پر زیادہ زور تھا۔ 'البلاغ' کی تلقین تھی کہ مسلمان مطلق العنانی کے خلاف سینہ سپر ہو جائیں۔

معروف ادیب و ناقد مالک رام کا خیال ہے کہ 'الہلال' ان کے عہد شباب کی یادگار ہے اور 'غبار خاطر' بڑھاپے کی مگر کوئی بھی شخص اسے پڑھ کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کسی تھکے ہوئے دماغ یا قلم کی تخلیق ہے۔ یہاں بھی ان کے ذہن کی گرم جولانی اور قلم کی گل افشانی میں وہی دلکشی ہے جو روز اول سے ان سے منسوب رہی۔ اگر تمام مشغولیتوں سے قطع نظر کر کے اپنے آپ کو علم و ادب ہی کے لیے وہ وقف رکھتے تو نہ معلوم آج اردو کے خزانے میں کیسے کیسے قیمتی جواہر کا اضافہ ہو گیا ہوتا۔

■

Feeroz Ahmad Bakht,A-202, Adeeba Market &Apts Near Rahmani Masjid, Main Road, Zakir Nagar, New Delhi - 110025
Mob,:9810933050

معین الدین

عبدالغفور نساخ اور ان کی تصانیف

عبدالغفور نساخ نہ دہلوی تھے، نہ لکھنوی، نہ دکنی اور نہ لاہوری، بلکہ وہ مستند اور خاندانی بنگالی تھے اور اردو کے اہم ستونوں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ شاعر ہیں، خودنوشت سوانح کے مصنف بھی، تذکرہ نویس بھی، نقاد بھی اور نصابی کتب لکھنے والے بھی۔ نساخ اٹھائیس کتابوں کے مصنف ومولف ہوتے ہیں۔

نساخ کا پورا نام ابومحمد عبدالغفور خاں خالدی تھا۔ ان کی پیدائش منگل کے دن قبل از نماز عید الفطر 1249 ہجری مطابق 11 فروری 1834 محلہ کلنگا موجودہ عبدالرحمن اسٹریٹ کلکتہ میں اپنے والد جناب قاضی فقیر محمد کے گھر ہوئی۔ نساخ فقیر محمد کی تیسری بیوی کے بطن سے تھے اور تمام سگے اور سوتیلے بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ جب ان کی عمر ساڑھے چار سال کی ہوئی تو پڑھانے کے لیے مولوی رمیض الدین چٹگامی مقرر ہوئے اور نساخ کے کہنے کے مطابق مکتب گھر ہی پر تھا۔ چالیس پچاس طالب علم وہیں رہتے تھے۔

عبدالغفور نساخ کی عمر جب سات سال کی ہوئی تو مدرسہ عالیہ کلکتہ میں داخل ہوئے۔ لیکن یہ تعلیم بھی زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکی۔ کیونکہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد یعنی 1844 میں ان کے والد اور پھر والدہ یکے بعد دیگرے انتقال کر گئے۔ اس کے بعد نساخ اپنے آبائی گاؤں فرید پور میں رہے۔ کیونکہ اس وقت تک ان کے بڑے بھائی نواب عبداللطیف برسر روزگار نہ ہوئے تھے۔ 1946 میں جلاوطن امیران سندھ کے مترجم مقرر ہوئے اور اس طرح ذریعہ معاش پیدا ہوا تو نساخ بھی کلکتہ چلے آئے اور پھر مدرسہ عالیہ میں داخل ہوئے۔ ان کی تعلیم جاری ہوئی اور گھر پر پڑھانے کے لیے ایک مولوی ازبر علی سلہٹی مقرر ہوئے۔ پھر ازبر علی کے بعد مولوی رضوان علی سلہٹی پڑھانے لگے۔

1947 کو جب ان کی عمر تیرہ سال کی ہوئی تو بزرگوں کی رائے سے ہگلی کالج میں پڑھنے کے لیے بھیجے گئے۔ ان کے ساتھ ان کے سوتیلے بھائی مولوی عبدالباری بھی تھے اور بقول رضا علی وحشت کلکتوی "نساخ کی عربی کی استعداد بہت اچھی تھی۔ فارسی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے اور زبان اردو میں انھوں نے بڑی قدرت پیدا کی تھی۔ 1853 میں تعلیم سے فراغت حاصل کر کے تلاش معیشت کے لیے تگ و دو کی۔ چنانچہ اپنے بڑے بھائی نواب عبداللطیف کے ایما سے اپنے وطن راجہ پور سے روانہ ہوئے اور 15 نومبر 1853 کو ڈھاکہ پہنچے۔ ڈھاکہ میں ان کا قیام منشی امین الدین محرر سیشن جج کے یہاں ہوا، جہاں ان کو بیلی صاحب کی مہربانی سے محرر اور پھر بعد میں مترجم ہوئے ای۔ بی ناول صاحب پروفیسر ہندو کالج کے یہاں معلم مقرر ہوئے۔ یہاں وہ پڑھانے کے ساتھ ساتھ کتابوں کی نقل کا کام بھی کرتے تھے۔ پھر اس کے بعد دیوانی عدالت میں کام کرتے ہوئے خوشی کے دن گزرتے گئے۔ پھر بھائی نواب صاحب کے کہنے پر ڈپٹی مجسٹریٹ کے لیے درخواست دی جو 18 نومبر 1860 میں نساخ ڈپٹی مجسٹریٹ کے عہدہ جلیلہ پر مقرر ہوئے اور مشرقی بنگال کے ضلع برسیال میں جا کر اپنے عہدے کا چارج لیا۔

نساخ ڈپٹی مجسٹریٹ کے عہدے پر عارضی طور قائم کیے گئے کیونکہ مستقل ملازمت کے لیے امتحان پاس کرنے کی شرط ضروری تھی۔ یہ امتحان سال میں دو بار ہوتا تھا۔ ایک اپریل مہینے میں اور دوسرا اکتوبر میں۔ لیکن اکتوبر کے امتحان میں یہ شامل نہ ہو سکے۔ ملازمت کے دوسرے سال 1861 کو اکتوبر والے امتحان میں شریک ہوئے مگر کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ اسی طرح نساخ موقع کھو بیٹھے۔ چنانچہ تیسرے موقعے سے فائدہ اٹھانا ضروری تھا۔ موقع نازک تھا اور منزل کٹھن تھی۔ نساخ نے امتحان دیا اور کامیاب ہو گئے۔ غرض کہ اس طرح نازک مرحلے سے

گزرے اور اپنی ملازمت کے سلسلے میں بنگال و بہار کے مختلف علاقوں میں قیام پذیر ہوئے۔

پہلے پہل ان کا تقرر بریسال ہوا۔ یہ بریسال میں اکتوبر 1860 سے لے کر فروری 1863 تک رہے۔ پھر ان کا تبادلہ مارچ 1863 میں ہوڑہ ہوا۔ پھر جنوری 1864 میں راجشاہی تبدیل کر دیے گئے اور اگست 1866 تک وہاں ان کا قیام رہا۔

راجشاہی میں قیام کے دوران ان کی شادی مرزا ہمایوں بخت خلف مرزا خرم بخت کی دختر نیک اختر سے ہوئی اور پھر وہیں دسویں مہینے میں ان کے یہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی لیکن اسی دن انتقال کر گئی۔ پھر اگست 1866 میں بھاگل پور کمشنری کے ضلع بانکا میں تبدیل ہو کر گئے۔ یہاں ان کا قیام فروری 1869 تک رہا۔ بانکا ہی کے قیام میں ان کے بیٹے ابوالقاسم محمد کی پیدائش ہوئی جن کا خاندانی نام ابوالقاسم اور تاریخی نام مظہر الحق تھا اور عرفیت محمد۔ ابوالقاسم نساخ کی واحد اولاد نرینہ تھے چنانچہ انھوں نے فراخدلی سے لوگوں کی دعوت کی اور جشن ولادت کے موقعے پر بانکا کے قریب و جوار کے مسلمانوں اور ہندوؤں کو بھی بلایا اور خوشیاں منائیں۔

بانکا میں قیام کے دوران نساخ کے گلے سے خون آیا۔ حالانکہ اس مرض میں وہ سولہ برس کی عمر سے گرفتار تھے مگر اس مرتبہ خون کی مقدار زیادہ تھی۔ چنانچہ وہ بہت گھبرائے اور سول سرجن سے سرٹیفکیٹ لے کر دو ماہ کی رخصت لے کر ماہ رمضان میں علاج کے لیے دہلی پہنچے۔ راستے میں پٹنہ، الہ آباد اور علی گڑھ وغیرہ ٹھہرتے ہوئے دہلی پہنچے اور حکیم مرتضیٰ خان کے زیر علاج رہے۔ جس سے خاطر خواہ فائدہ ہوا اور مرض کا ازالہ ہو گیا۔ دہلی میں ان کی یہ پہلی آمد تھی۔ لہٰذا یہاں اکثر شعرا و ادبا سے صحبتیں رہیں۔ جن میں آزردہ، مرزا غالب، شیفتہ اور حالی وغیرہ شامل تھے۔ غرض کہ دہلی کی سیر سے لطف اندوز ہو کر آگرہ اور کانپور ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے اور یہاں کا محرم دیکھا۔ لوگوں سے ملاقاتیں کیں اور پھر بانکا لوٹ گئے۔

مارچ 1869 کو بانکا سے ان کا تبادلہ چھپرہ ضلع سارن ہو گیا۔ لیکن یہاں چین سے نہیں گزری۔ اس لیے کہ ایک بار تو گنگا کے سیلاب نے پریشان کیا اور پھر کچھ دن بعد اپنے استاد مکرم حضرت ضیغم کے انتقال پر ملال کی خبر ملی اور سال کے آخری ماہ میں خود بھی بیمار پڑ گئے۔ لہٰذا جنوری 1870 میں علاج کی خاطر پھر دوسری بار دہلی تشریف لے گئے اور علاج سے فارغ ہو کر چھپرہ واپس آئے یہاں سے اپریل 1870 میں چھپرہ سے تبدیل ہو کر بھاگل پور آ گئے لیکن یہاں کا قیام بہت مختصر رہا اور ان کا تبادلہ مونگیر کر دیا گیا۔ مونگیر کے دوران ملازمت میں ان کے ساتھ ایک خاص واقعہ پیش آیا جس کی پاداش میں ان کا تبادلہ سلہٹ ہو گیا۔ سلہٹ میں ان کا قیام طویل رہا۔ یہاں سے 6 جولائی 1874 میں ان کا تبادلہ ڈھاکہ ہوا۔ لیکن ابھی مہینہ بھی نہیں ہوا تھا کہ مانک گنج بھیج دیے گئے اور پھر اپریل 1875 میں ڈھاکہ چلے آئے۔ یہاں وہ 10 اپریل 1879 تک کام کرتے رہے۔ ڈھاکہ کے زمانہ ملازمت ہی نساخ نے ایک مقدمے میں نواب احسن اللہ بہادر پر پانچ روپے جرمانہ کیا تھا۔ یہیں کے قیام کے دوران نساخ کی تنخواہ میں اضافہ ہوا۔

ڈھاکہ کے قیام کے دوران ہی انھوں نے دہلی کا تیسرا سفر کیا اور اس کے بعد واپس آ کر بیر بھوم میں چارج لیا۔ یہاں صرف سولہ مہینے رہے اور اس کے بعد ہگلی میں اپنا عہدہ سنبھالا، یہیں کچھ دن بعد وبائی تپ کا شکار ہوئے اور جب ڈاکٹروں نے انھیں بتایا کہ مرض تپ کے دور ہونے میں تقریباً چار مہینے لگ جائیں گے، تو نساخ چھ ماہ کی چھٹی لے کر کلکتہ چلے گئے اور وہاں غلام نبی خان صاحب کے زیر علاج رہے، حکیم غلام صاحب کی تندہی اور علاج سے ان کا مرض دور ہو گیا۔

صحت یاب ہونے پر انھوں نے ڈھاکہ جا کر چارج لیا اور قیام تقریباً تین سال تک رہا۔ اس کے بعد پھر میدنی پور میں چارج سنبھالا اور یہیں کے قیام کے دوران مولوی عبیداللہ العبیدی، حکیم اشرف علی ملت، نواب ضیاء الدین خان دہلوی اور حافظ نعمت اللہ واعظ کے انتقال کی خبر نساخ کو ملی جس سے ان کو بہت رنج اور صدمہ ہوا۔ میدنی پور میں نساخ صرف چودہ مہینے ٹھہرے تھے کہ یہاں پھر تپ وبائی کا شکار ہوئے لہٰذا تین ماہ کی چھٹی لے کر دہلی چلے گئے۔ وہاں سے اچھے ہو کر واپس آئے تو معلوم ہوا کہ ان کو پھر ڈھاکہ تبدیل کر دیا گیا ہے۔ ڈھاکہ میں چارج لینے کے بعد بھوپال سے ان کے بھائی نواب عبداللطیف کا تار موصول ہوا کہ وہ قائم مقام وزیر ریاست بھوپال مقرر ہوئے ہیں، نساخ کو اس خبر سے بڑی خوشی اور مسرت ہوئی لیکن تین مہینے کے لیے نساخ نے منشی گنج میں چارج لیا اور کچھ دنوں بعد 14 جون 1889 کو ان کا انتقال کلکتے میں ہو گیا۔

عبدالغفور نساخ بحیثیت ادیب جتنے مشہور تھے، بحیثیت شاعر اس سے بھی زیادہ شہرت یافتہ تھے۔ وہ فطری شاعر تھے اور اکتساب فن کے لیے بہت کچھ ریاض بھی کیا تھا۔ شعر گوئی کے ابتدائی دور میں مجبور تخلص کرتے تھے، لیکن ناسخ لکھنوی کے حریف بننے کے خیال سے اپنا تخلص بدل کر نساخ رکھا۔ نساخ اکثر ناسخ لکھنوی کی غزل کا جواب لکھا کرتے تھے اور ساحرانہ تعلی سے بھی کام لیتے تھے۔ جیسے:

ناسخ کی اس غزل پہ غزل کون کہہ سکے
کیوں کر جواب ہو سخن لا جواب کا

اپنی شاعری کی ابتدا سے متعلق نساخ نے باضابطہ کوئی تاریخ یا وقت نہیں بتایا لیکن ان کی سوانح عمری میں ایک دو واقعات ایسے ہیں جن سے ان کے بیان کے مطابق اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے صغر سنی سے شعر گوئی کی ابتدا کی تھی اور مرزا غالب سے ملاقات کے دوران ان کی شعر گوئی کا ذکر بھی چھڑا تھا جس کا ذکر نساخ اس طرح کرتے ہیں ”مرزا غالب نے ایک دن مجھ سے کہا کہ مولوی صاحب معلوم ہوتا ہے کہ تم بھی میری طرح سے سات آٹھ سال...... سے شعر کہتے ہوگے، میں نے کہا ہاں۔“

نساخ نے جب شعر گوئی شروع کی تو نظر انتخاب رشید النبی وحشت پر پڑی اور ان کے شاگرد ہو گئے۔ پھر کچھ دنوں بعد وحشت کی مصروفیت کی بنا پر حضرت اکرام احمد ضیغم سے تلمذ اختیار کیا اور ان کی بڑی تعریف کی بلکہ نساخ کہتے ہیں کہ ”ایسا جامع کمالات آدمی نظر نہیں آیا۔ کوئی فن ایسا نہیں جس میں ان کو دخل نہ ہو۔“

کامل فن سخن ماہر اصناف کلام
کوئی ضیغم سا نظر مجھ کو نہ استاد آیا

تصانیف نساخ کی تعداد خاصی بڑی ہے۔ لیکن تذکرہ سخن شعرا ان کا شاہکار ہے جس میں تقریباً پونے تین ہزار شعرا کا مختصر حال اور ان کے کلام کے نمونے بہت غنیمت ہیں اس لیے کہ یہ مواد اس کتاب کے علاوہ کہیں اور نہیں ملتا۔ اس تصنیف سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آج سے تقریباً سو

عبدالغفور نساخ بحیثیت ادیب جتنے مشہور تھے، بحیثیت شاعر اس سے بھی زیادہ شہرت یافتہ تھے۔ وہ فطری شاعر تھے اور اکتساب فن کے لیے بہت کچھ ریاض بھی کیا تھا۔ شعر گوئی کے ابتدائی دور میں مجبور تخلص کرتے تھے، لیکن ناسخ لکھنوی کے حریف بننے کے خیال سے اپنا تخلص بدل کر نساخ رکھا۔ نساخ اکثر ناسخ لکھنوی کی غزل کا جواب لکھا کرتے تھے اور ساحرانہ تعلی سے بھی کام لیتے تھے۔

برس پہلے مشرقی بنگال میں اردو شعر گوئی کو قبول عام وخاص تھا اور یہاں اردو میں شعر کہنے والوں کی تعداد کم نہ تھی۔

اب آیئے ان کی تصانیف کی طرف جو مندرجہ ذیل ہیں:

(1) **دفتر بے مثال:** یہ ناسخ کا پہلا دیوان ہے اور اس کا سال ترتیب 1206 ہجری مطابق 1860 اور سال طباعت 1863 ہے۔ یہ مظہر العجائب پریس کلکتہ میں طبع ہوا اس میں ابتدائی دس صفحوں پر مشتمل مولوی نجم الدین حسین نادر میمن سنگھی، مولوی عبید اللہ العبیدی میدنی پوری، مولوی ریاضت اللہ اوج وغیرہ کی غزلیں، قطعات اور متفرقات ہیں اور آخر میں مصنف کے تین صفحوں پر مشتمل فارسی میں اپنے حالات زندگی اختصار کے ساتھ اسباب شعر گوئی اور ترتیب دیوان کے متعلق لکھا ہے اور اس کے ایک ایڈیشن کا نسخہ مرزا غالب کو بھیجا ہے۔

دفتر بے مثال ناسخ کے کلام کا پہلا مجموعہ ہے اور اس میں جو غزلیں وغیرہ شامل ہیں وہ ان کی ابتدائی مشق کا نتیجہ ہیں۔ اس کی تکمیل کے وقت ناسخ کی عمر چھبیس سال کی تھی اور اس میں چودہ ہزار اشعار کہہ چکے تھے۔

(2) **اشعار نساخ:** یہ نساخ کے دوسرے دیوان کا تاریخی نام ہے۔ یہ دیوان منشی نولکشور لکھنؤ میں رمضان المبارک کو 1291 ہجری مطابق 1874 میں طبع ہوا۔ اس میں ایک ہزار چھ سو بیاسی اشعار ہیں۔ غزلوں کے علاوہ انیس قطعات، ایک قصیدہ ناتمام، آٹھ رباعیاں اور متفرق اشعار خواجہ آتش کی غزل پر موجود ہیں۔

(3) **ارمغان:** نساخ کا یہ تیسرا دیوان ہے اور نام ارمغان تاریخی ہے۔ یہ دیوان 1294 ہجری مطابق 1877 میں مطبع نظامی کانپور سے شائع ہوا اور جیسا کہ اس دیوان سے متعلق عبدالرحمٰن شاکر نے یہ دو شعر کہے:

بہ صحت چھپا جب یہ دیواں نیا
لکھا شعر شاکر نے تاریخ کا
چھپا کیا ہے دیوان نساخ کا
کسی نے نہیں ایسا دیواں کیا

(4) **ارمغانی:** ارمغانی نساخ کا چوتھا اور آخری دیوان ہے۔ جو مطبع نامی لکھنؤ 3 صفر 1304 ہجری مطابق ماہ نومبر 1886 میں طبع ہوا تھا۔ اس دیوان کا سال ترتیب 1302 ہجری ہے اور اس کا ارمغانی نام بھی تاریخی ہے اور اس میں غزلیں، ابیات اور اپنے معاصرین اور بعض دواوین کی ترتیب سے متعلق تاریخی قطعات وغیرہ ہیں۔

(5) **چشمہ فیض:** یہ جناب فریدالدین عطار کے پند نامہ کا منظوم ترجمہ ہے۔ فرانسیسی نقاد گارسان دتاسی نے چشمہ فیض کا تذکرہ اپنے خطبے میں کیا ہے۔

(6) **شاهد عشرت:** شاہد عشرت کا سال ترتیب 1280 ہجری ہے اور منشی نول کشور لکھنؤ میں طبع ہوئی اور اس میں اشعار کی مجموعی تعداد 177 ہے۔ اور نجف علی خاں کی فارسی تقریظ موجود ہے۔ اس کتاب میں ابتدائی نظم 'ساقی نامہ' ہے۔

(7) **مرغوب دل:** مرغوب دل نساخ کی فارسی رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ نساخ نے جس سال شاہد عشرت کو ترتیب دیا، اسی سال انھوں نے اپنے اس فارسی رباعیوں کے مجموعے مرغوب دل کو بھی مرتب کیا تھا۔

(8) **گنج تواریخ:** گنج تواریخ نساخ کے تاریخی قطعات کا مجموعہ ہے جو ستاسی صفحوں پر مشتمل ہے اور اس میں ضمیمہ گنج تواریخ بھی شامل ہے۔ اس کا سال ترتیب 1290 ہجری ہے۔ گنج تواریخ میں تاریخی قطعات اور فردیات دونوں ہی ہیں۔ یعنی پیغمبر اسلام سے لے کر صحابہ کرامؓ اور ائمہ دین، صوفیائے کرام مشائخ اور علمائے دین، سلاطین شعرا، ادبا اور مشاہیر اسلام کی وفات تک کے تواریخ، قطعہ اور فرد کی صورت میں درج ہیں۔

(9) **کنز تواریخ:** یہ ایک پچاس صفحوں کا رسالہ ہے جس میں گنج تواریخ ہی کی طرح تاریخی قطعے اور شعر ہیں اور اس کا اصلی ضمیمہ گنج تواریخ ہے۔ یہ رسالہ مطبع نظامی کانپور سے طبع ہوا لیکن معلوماتی نقطۂ نگاہ سے کنز تواریخ اہم ہے کہ اس میں نساخ نے اپنے آبا و اجداد کی وفات کی تاریخ لکھی ہے۔

(10) **مظہر معما:** یہ رسالہ پندرہ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کا تاریخی نام مظہر معما ہے۔ یہ مطبع بحر العلوم لکھنؤ سے اشاعت پذیر ہوا۔

(11) **ترانہ خامہ** : یہ نساخ کی اردو رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ ترانہ خامہ تاریخی نام ہے اور عرفیت مرغوب جان ہے۔ اس کی ضخامت بتیس صفحات ہے اور سال ترتیب 1302 ہجری ہے۔ یہ بھی مطبع بحر العلوم لکھنؤ سے شائع ہوئی۔

(12) **نصرۃ المسلمین:** نصرۃ المسلمین پورا نام رسالہ ردِ وہابی مسمّٰی بہ نصرۃ المسلمین فی الرد علی غیر مقلدین ہے اور عرفیت قرع الضالین ہے۔ یہ چالیس صفحے کا رسالہ ہے اور مطبع جامی الاسلام دہلی میں طبع ہوا۔

(13) **باغ فکر:** باغ فکر تاریخی نام ہے اور سال ترتیب 1303 ہجری ہے۔ مطابق 1887 اور اس کی اشاعت مطبع نامی لکھنؤ بہ اہتمام ابوالحسنات قطب الدین احمد ہوئی تھی۔ یہ رسالہ نساخ کے قطعات کا مجموعہ ہے۔ اس میں ایک سو اکتیس قطعات ہیں اور زیادہ تر عشقیہ ہیں۔

(14) **نصاب زبان اردو:** یہ کتاب جس کا نام نصاب اردو زبان ہے۔ نساخ کا ترتیب دیا ہوا ہے بلکہ اس کتاب کے سرورق پر انگریزی و اردو مرقوم ہے۔ اردو زبان کے امتحان کا نصاب جو کلکتہ یونیورسٹی کے سینٹ 1864 کے ایل اے امتحان کے لیے مقرر فرمایا ہے۔

اس کتاب کے دوسرے حصے میں صرف غزلوں اور قصیدوں کا انتخاب شامل ہے۔ غزلیں، سودا، ذوق، مومن، ظفر، رند، قبول اور گویا کی منتخب کی گئی ہیں۔

(15) **منتخبات دواوین شعرائے ہند:** یہ تالیف چند شعرائے اردو کی غزلوں اور قصیدوں کا مجموعہ ہے جسے نساخ نے ترتیب دیا ہے اور یہ کلکتہ سے 1864 میں طبع کرایا۔ اس میں اردو کے مشہور شعرا کی غزلوں اور قصائد کے علاوہ سودا کے شہر آشوب بھی شامل ہیں۔ اس کتاب میں کیپٹن ولیم ناسولیس کا انگریزی میں چار صفحوں پر دیباچہ بھی ہے۔

(16) **سفینۂ منتخب:** سفینۂ منتخب تاریخی نام ہے اور میرزا وصال شیرازی کے فارسی کلام کا انتخاب ہے۔ یہ انتخاب نامی پریس لکھنؤ سے اپریل 1888 میں شائع ہوا۔ لیکن خلاف معمول اس کتاب میں نساخ کا کوئی قطعہ نہیں۔ اس کے مادہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اشاعت نساخ کی وفات سے قبل ہوئی تھی۔ محمود آزاد کے دیباچے کے علاوہ اور کوئی مواد سفینۂ منتخب کے متعلق دستیاب نہیں ہوتا جس کی بنیاد پر کوئی رائے قائم کی جاسکے۔

(17) **سخن شعرا:** عبدالغفور نساخ کی یہ کتاب اردو شاعروں کا تذکرہ ہے۔ اور یہ نام تاریخی ہے۔ اس تذکرے کا سال ترتیب ماہ رمضان 1381 ہجری مطابق اکتوبر 1874 ہے۔ یہ تذکرہ منشی نولکشور پریس لکھنؤ میں طبع ہوا تھا۔ یہ اردو میں ہے۔ اور اس میں قدما سے لے کر انیسویں صدی کے اواخر کے تقریباً سارے شعرا کا ذکر کیا گیا ہے اور آخر میں دس صفحات شاعرات کے لیے مخصوص کردیے گئے ہیں۔ یہ فرانسیسی مصنف گارساں دتاسی کے تذکرے 'تاریخ ادب ہندوستان' کے بعد سب سے زیادہ شعرا کا تذکرہ ہے جبکہ گارساں کے تذکرے میں دو ہزار آٹھ سو آٹھ مصنفین و شعرائے اردو کا ذکر ہے۔ اور نساخ کے سخن شعرا میں مجموعی تعداد دو ہزار چار سو پچاس ہے اور رضا علی وحشت کلکتوی نے یہ تعداد دو ہزار چار سو تیراسی اور لطیف الرحمٰن نے اپنی کتاب 'نساخ سے وحشت تک' میں دو ہزار چار سو بیاسی اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے دو ہزار چار سو نو بتائی ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شمار

کرتے وقت بعض ان حضرات سے چھوٹ گئے۔

کتاب 'سخن شعرا' عبدالغفور نساخ کی سب سے مشہور کتاب ہے اور اس میں نساخ نے ابتدا سے لے کر اپنے دور تک کے تمام اہم اور بعض غیر اہم شعرا کو جگہ دی ہے لیکن شعرا کے حالات زندگی کی چھان بین نہیں کی ہے بلکہ جن کے حالات زندگی یا کوائف معلوم ہو سکے یا جس شاعر کا نام اور نمونہ کلام دستیاب ہو سکا، نساخ نے اس کو اپنے تذکرے میں شامل کرلیا۔ بہرحال! کتاب سخن شعرا کی اہمیت نہ شعرا کے حالات زندگی یا کلام پر رائے سے ہے بلکہ اس کی اہمیت صرف اس بنا پر ہے کہ اس میں کثیر تعداد شعرا کا ذکر ہے اور مزید یہ کہ بنگال کے شعرا کے متعلق جو تھوڑا بہت مواد ملتا ہے وہ اسی میں ملتا ہے۔ اس کے علاوہ نساخ نے اپنے اس وقت کے شاگردوں، اپنے معاصرین اور معاصرین کے شاگردوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ آج اگر سخن شعرا کا وجود نہ ہوتا تو ہم شاید بنگال کے ان شعرا کے متعلق کچھ بھی واقفیت نہ رکھتے اور نہ اس بات کا اندازہ لگا سکتے تھے کہ دہلی اور لکھنؤ سے دور افتادہ بنگال اور بہار ایسی سرزمین کے ہر خطے میں اردو شعرا و ادبا بیٹھے داد سخن دے رہے تھے۔

بہرکیف سابق ڈپٹی کلکتہ نساخ کے تذکرے اردو ادب میں بہت اہمیت رکھتے ہیں اور اگر وہ شاعر نہ بھی ہوتے تو ان تذکروں کی بدولت ہی زندہ جاوید ہوتے۔ ان کا یہ کارنامہ اپنی جگہ بہت اہم ہے۔ خواہ ان کے تذکروں اور کتابوں پر کتنے ہی اعتراض کیے جائیں اور اعتراض سے کسی انسان کی تخلیق کب خالی رہتی ہے، مگر جب تک میر، قائم، قاسم اور آشفتہ وغیرہ کے تذکروں کی اہمیت رہے گی، نساخ کے تذکرے بھی اہم رہیں گے۔ بلکہ دوسرے تذکرہ نویسوں کی طرح نساخ بھی اردو ادب کے محسنوں میں شمار کیے جائیں گے۔ لہٰذا صاحب موصوف کی مصروفیتوں اور ذمے داریوں کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان کا یہ کارنامہ نہایت اہم اور ممتاز ہے۔

(18) **انتخاب نقص:** انتخاب نقص تیس صفحات کا ایک رسالہ ہے جو مطبع نظامی کانپور سے محرم 1296 ہجری میں چھپا ہے۔ رسالے کی ابتدا میں حمد اور نعت کے بعد نساخ نے اپنا نسب نامہ بھی لکھا ہے اور اس کے بعد غرض و غایت بھی لکھی ہے۔ اس رسالے میں لکھنؤ کے مشہور شاعر میر ببر علی انیس اور مرزا سلامت علی دبیر کے کلام کی زبان، عروض، محاورے، معانی اور قواعد کی غلطیاں اور بعض دوسرے فنی نقائص دکھائے گئے ہیں۔ اس رسالے کو ان کا انتقادی کارنامہ سمجھنا چاہیے اور اعلیٰ ظرفی یہ کہ نساخ نے ان بزرگوں کی ذاتیات پر کسی قسم کا حملہ نہیں کیا ہے۔ اس لیے کہ نساخ نیک باطن تھے اور انھوں نے جو اعتراضات اہل لکھنؤ کے کلام پر کیے، حصول شہرت کی غرض سے یا بدنفسی سے نہیں کیے ہیں، بلکہ کچھ اہل لکھنؤ کی چھیڑ چھاڑ سے تنگ آ کر اور کچھ طبع تحقیق پسند کی ولولہ انگیزیوں سے کیے تھے۔

انتخاب نقص رسالے کی تصنیف عبدالغفور نساخ اور شعرائے لکھنؤ کے درمیان ایک بڑے معرکے کا سبب بن گئی بلکہ لکھنؤ میں زلزلہ آ گیا۔ اور اس ایک رسالے کے بدلے انتخاب نقص کی مخالفت میں بہت سے رسالے اور کتابیں لکھی گئیں، اس سلسلے میں ادب کو فائدہ پہنچا۔ نساخ کے اعتراضات اکثر و بیشتر صحیح ہیں اور ان کے اعتراضات نے لکھنوی شعرا کے ایوان شاعری میں ایک بھونچال پیدا کر دیا تھا۔ لکھنوی شعرا اردو کو اپنی ملکیت سمجھتے تھے اور ان کے نزدیک پورب کے باشندے زبان اردو سے نا آشنا تسلیم کیے جاتے تھے۔ بنابریں انتخاب نقص کیا اشاعت ہوئی۔ لکھنؤ میں لوگ اس میں شامل اعتراضات سے کافی متاثر ہوئے۔ جہاں تہاں بیٹھکوں اور گلی کوچوں میں اس کا چرچا ہونے لگا اور کافی لوگوں نے اس کے جوابات لکھ کر شائع کرائے۔ نساخ کے رسالے کے جواب میں پہلا رسالہ 'تطہیر الاوساخ تسبیح النساخ' تھا۔ اس رسالے کے مصنف محمد رضا معجز ناسخ کے شاگرد تھے۔ معجز کا یہ رسالہ شعلہ طور پریس کانپور سے ماہ رمضان میں 1296 ہجری کو شائع ہوا اور یہ رسالہ ایک سو اکاون صفحوں پر مشتمل ہے۔ پھر دوسرا رسالہ منشی مظفر علی ہنر نے 'رد نساخ و جواب انتخاب نقص' کے نام سے کیا اور بقول نظم طباطبائی یہ انتخاب نقص کا بہت ہی دندان شکن جواب تھا۔"

بہرکیف سابق ڈپٹی کلکتہ نساخ کے تذکرے اردو ادب میں بہت اہمیت رکھتے ہیں اور اگر وہ شاعر نہ بھی ہوتے تو ان تذکروں کی بدولت ہی زندہ جاوید ہوتے۔ ان کا یہ کارنامہ اپنی جگہ بہت اہم ہے۔ خواہ ان کے تذکروں اور کتابوں پر کتنے ہی اعتراض کیے جائیں اور اعتراض سے کسی انسان کی تخلیق کب خالی رہتی ہے، مگر جب تک میر، قائم، قاسم اور آشفتہ وغیرہ کے تذکروں کی اہمیت رہے گی، نساخ کے تذکرے بھی اہم رہیں گے۔ بلکہ دوسرے تذکرہ نویسوں کی طرح نساخ بھی اردو ادب کے محسنوں میں شمار کیے جائیں گے۔

پھر جواب میں تیسری کتاب 'سنان دل خراش' لکھی گئی لیکن نساخ کے کلام پہ سب سے پہلے اعتراضات 'گستاخی معاف در ایرادات نساخ' میں کیے گئے۔ اس کتاب کے مصنف سید مرتضیٰ ابن سید علی صاحب امروہوی ہیں۔ اس کے بعد دوسری کتاب 'تفضیح' ہے اور اس کے مصنف آغا علی ساکن لکھنؤ مدرس مدرسہ عالیہ محمود آباد ہیں۔ نساخ کے کلام پر لکھنوی ادبا کے اعتراضات کے جواب میں نساخ کے شاگرد ارشد مولوی عصمت اللہ انجم نے 'طومار اغلاط' لکھا جو میڈیکل پریس آگرہ میں طبع ہوا۔ یہ چونسٹھ صفحات کا رسالہ ہے اور ایک صفحہ غلط نامہ کا الگ شامل ہے۔ انجم کا بیان ہے کہ "لکھنؤ کے چھ نامی شاعر یعنی جناب شیخ امام بخش ناسخ، خواجہ حیدر علی آتش، خواجہ محمد وزیر، وزیر علی صبا، مفتی اسمٰعیل منیر، منشی امیر احمد امیر کے کلام میں بادی النظر میں جہاں جو نقص نظر آئے اس کو اس رسالے میں جمع کیا اور نام تاریخی اس کا طومار اغلاط رکھا۔ یہ سلسلہ کچھ دنوں تک چلتا رہا۔ اس طرح انتخاب نقص کے طفیل میں ایک اچھا خاصا تنقیدی مواد ادب اردو میں داخل ہوا جو مستقبل کے تنقیدی ارتقا کی اہم کڑی کی حیثیت رکھتا ہے اور انیسویں صدی کے شعرا و ادبا کے تنقیدی شعور اور انداز نظر کے سمجھنے میں مدد و معاون ہوتا ہے۔

الغرض عبدالغفور نساخ بنگال کی ادبی و علمی دنیا میں ایک معتبر اور باوقار نام ہے۔ ان کے ادبی کارناموں کی فہرست طویل ہے۔ وہ بیک وقت خوش فکر شاعر، اچھے نثار، سوانح نگار اور تذکرہ نویس تھے۔ حالی، شیفتہ، داغ اور امیر وغیرہ کے ہم عصر تھے:

سچ سچ جو مجھ سے پوچھیے تو فن شعر میں
نساخ اپنے وقت کے تم بھی امام ہو

استفادے کی کتابیں

1. بنگال میں اردو: وفا راشدی
2. مشرقی بنگال میں اردو: پروفیسر اقبال عظیم
3. بنگال کا اردو ادب: پروفیسر نہال اختر
4. نساخ سے وحشت تک: لطیف الرحمٰن اور
5. سہ ماہی رسالہ 'نقوش' کا آپ بیتی نمبر

■

Moyeenuddin, Naya Babu Para, Sayyed Pur, Nilfa Mari (Bengaladesh)

نقد و نگاہ

اردو میں جامعاتی تحقیق

مسائل اور ان کا حل

محمد اسلم فاروقی

تحقیق حقائق کی کھوج کا کام ہے اور ادبی اصطلاح میں جامعاتی تحقیق وہ کام ہے جس میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے مقالے لکھے جاتے ہیں اور کسی یونیورسٹی سے مقالہ نگار کو اس کام کی منظوری پر کامیابی کی سند ملتی ہے۔ گذشتہ چند سال سے مرکزی یونیورسٹیوں میں محققین یا ریسرچ اسکالرس کے لیے خاطر خواہ ماہانہ اسکالرشپ ملنے لگی ہے اس وقت سے طلبا ان جامعات میں داخلہ لینے اور ریسرچ کرنے کی طرف راغب ہوئے ہیں۔ ورنہ ایک زمانے تک اردو کے نامور محقق پروفیسر گیان چند جین کی کہی ہوئی یہ بات سچ ہی لگتی تھی کہ اردو ریسرچ میں لڑکی شادی کے انتظار میں اور لڑکا ملازمت کی تلاش کے دوران داخلہ لیتا تھا تب نگراں بلا بلا کر مسلسل رہبری کرتے ہوئے کسی کا ریسرچ مکمل کرواتے تاکہ ریسرچ گائیڈ کے کھاتے میں بھی کچھ اسکالرس کا حساب آجائے۔ لیکن آج ریسرچ اسکالرس کے ساتھ وہ صورتِ حال نہیں ہے۔ اسی طرح JRF اور MANF اسکالرشپ تو ایک لیکچرر یا ریسرچ ایسوی ایٹ کے برابر ہے۔ مالی آسودگی فراہم کرنے کا یہی مقصد ہے کہ ریسرچ اسکالر توجہ کے ساتھ ریسرچ کرے۔ دوسری طرف ریاستی یونیورسٹیاں ماہانہ اسکالرشپ دینے سے قاصر ہیں اس لیے وہاں ان دنوں دوسرے درجے کے محقق اور اسکالر یا پارٹ ٹائم اسکالرس ہی داخلہ لیتے ہیں ورنہ ایک زمانہ تھا جامعہ عثمانیہ سے اردو میں پی ایچ ڈی کرنا لوہے کے چنے چبانے سے بھی مشکل کام تھا۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنی پی ایچ ڈی کے تاثرات میں لکھا ہے کہ ان کے نگراں پروفیسر مغنی تبسم ان سے لکھی ہوئی تحریر کو دس دس مرتبہ دہراتے تھے کہ ابھی درست نہیں ابھی درست نہیں۔ جبکہ آج کا محقق اس طرح کی مشق کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ ویسے ان دنوں جو تحقیقی کام ہورہا ہے وہ تکنیکی اعتبار سے بہتر ہورہا ہے لیکن اطمینان بخش نہیں۔ اس لیے اردو تحقیق والوں سے اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ مقالہ چھپنے والا نہیں بلکہ چھپنے والا ہونا چاہیے۔ اس طرح اردو میں اب جامعاتی تحقیق کا ہی تصور رہ گیا ہے۔ ورنہ ماضی میں انفرادی تحقیق کی بھی مثالیں ملتی ہیں رشید حسن خان، مالک رام اور دیگر محققین نے اپنا کام غیر جامعاتی تحقیق کے تحت ہی کیا ہے۔

زندہ قوموں کی نشانی ہوتی ہے کہ وہ اپنے دور میں اپنے مسائل کو تلاش کرتے ہیں اور ان مسائل کے حل کی جستجو میں لگے رہتے ہیں۔ اردو تحقیق کے مسائل کو جاننا اور ان کا حل پیش کرنا بھی موجودہ دور کے محققین اور اساتذہ اردو کی ذمے داری ہے۔ آیئے اس ضمن میں اردو تحقیق کو فی زمانہ پیش آنے والے مسائل کی طرف نظر ڈالتے ہیں۔ مسائل تو ہر کام میں ہوتے ہیں لیکن انھیں حل کرنے کی سنجیدہ کوشش کی جائے تو مسائل خود بہ خود حل ہوتے ہیں۔

1. **اردو تحقیق کی طرف طلباء کی عمومی عدم دلچسپی:** اردو تحقیق کا ایک اہم مسئلہ اردو داں طبقے کی اس جانب عمومی عدم دلچسپی ہے۔ اس کے بہت سے سماجی اور لسانی عوامل ہیں۔ جیسے اردو والوں کو خود اپنی زبان کو زوال پذیر سمجھنا، اردو ذریعے تعلیم سے پڑھنے والے طالب علم کو حقیر سمجھنا اور اردو کے مستقبل سے مایوس رہنا۔ اس لیے اگر سروے کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ اردو سے ریسرچ کرنے والے بیشتر طالب علم غریب گھرانوں کا پس منظر رکھتے ہیں۔ اور اپنے علمی سفر میں بہت کم روپیہ خرچ کرتے ہوئے پی ایچ ڈی تک پہنچ پاتے ہیں۔ اسی طرح اردو کے مستقبل سے مایوسی بھی اردو تحقیق سے عدم دلچسپی کا سبب ہے۔ جب کہ دیکھا جائے تو آج اردو کی جو حوصلہ افزا صورتِ حال ہے وہ آزادی کے وقت نہیں تھی۔ آج اردو دنیا کی ایک مقبول زبان ہے۔ اردو کے نام پر جامعات ہیں۔ اردو کے سرکاری مدارس، کالجز ہیں۔ اردو تدریس کے شعبے میں ملازمتیں ہیں۔ اور پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا میں اردو جاننے والوں کے لیے اچھے مواقع ہیں۔ اس لیے اردو تحقیق سے وابستہ اساتذہ اور اردو کی سرکاری ملازمت کرنے والوں کی ذمے داری ہے کہ وہ معاشرے میں شعور بیدار کریں۔ اردو کے طالب علم کو اپنے قریب آنے دیں اور اس کی مناسب رہبری کریں۔ اس کے لیے ایک مشورہ ہے کہ یونیورسٹی کے شعبہ جات کی جانب سے جونیر اور ڈگری سطح پر بھی ادبی مقابلوں کا انعقاد یا اردو فیسٹول منعقد ہو جس کی ماضی میں مثالیں ملتی ہیں تاکہ آنے والی نسل کو پتہ چلے کہ اردو کے شعبے کیا ہیں اور ان میں پڑھنے کے کیا فوائد ہیں۔ اخبارات اور رسائل میں تعارفی مضامین اور شعبہ جات کی کارکردگی رپورٹ کی اشاعت سے بھی صورت حال بہتر ہوسکتی ہے۔ ریاستی اردو اکادمیوں اور یو جی سی سے اردو کے فروغ کے لیے خصوصی اسکیموں کا آغاز کیا جاسکتا ہے۔ آج کل تکنیکی شعبے میں ملازمتوں کی فراہمی Placement کی سہولت فراہم کی جاتی ہے۔ اسی طرح اردو کے شعبے بھی اردو والوں کے لیے ملازمتوں کی فراہمی کے انٹرویو کروائیں۔ خانگی شعبے کی ملازمتوں جیسے اخبار کے سب ایڈیٹر کے انٹرویو یا کسی ٹیلی ویژن چینل کے اینکر یا نیوز ریڈر کے انتخاب کے انٹرویو شعبے کے تحت کروائے جاسکتے ہیں۔ اس کے لیے اضافی جستجو کی ضرورت ہے۔ اس طرح امید ہے کہ اردو طلبا اجتماعی کوشش سے جامعات میں اردو پڑھنے اور ریسرچ کرنے کی طرف راغب ہوں گے۔

2. **داخلوں میں دشواری:** پہلے یہ دور تھا کہ ریسرچ اسکالر تحقیق کی طرف راغب ہی نہیں ہوتے تھے۔ اب یہ شکوہ ہے کہ جب سے مرکزی جامعات میں اسکالرشپ کا چلن عام ہوگیا ہے داخلوں کی جانب رغبت دکھائی جارہی ہے۔ شاید یہ بات اوپر کہی گئی بات کے منافی لگے

لیکن اسکالرشپ کے حصول کی خاطر کئی طلبا اردو ریسرچ کی طرف آنے کے لیے تیار لگتے ہیں۔ لیکن محدود نشستوں کی وجہ سے انھیں اسکالرشپ والی جامعات میں داخلہ نہیں مل پاتا۔ اور یو جی سی بھی تحقیق کے معیار سے سمجھوتہ نہیں کرسکتی اور وہ فی گائیڈ اسکالرس کی تعداد کو نہیں بڑھا سکتی۔ چنانچہ یو جی سی سے طلبا تنظیموں کی جانب سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ ریاستی یونیورسٹیوں میں بھی ماہانہ اسکالرشپ جاری کرے۔ یا اسکالر کو کالج یا یونیورسٹی میں دوران تحقیق ریسرچ ایسوسی ایٹ کی طرح عارضی ملازمت دے۔ اور مشاہرہ کی ادائیگی کے ساتھ ریسرچ کا کام کرنے کی سہولت دے۔ تمام یونیورسٹیوں میں اسکالرشپ کے نظام میں یکسانیت سے طلبا کا مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔

3. **ریسرچ کے لیے مناسب موضوع کی تلاش:** ایم فل اور پی ایچ ڈی میں داخلے کے بعد ریسرچ اسکالر کے سامنے ایک اہم مسئلہ ریسرچ کے لیے مناسب موضوع کی تلاش ہوتا ہے۔ انٹرویو میں اور فارم بھرنے کے وقت ہی اسکالر سے پوچھا جاتا ہے کہ وہ اپنے پسند کے موضوع پر Synopsis داخل کرے اور جب وہ اپنی قابلیت سے کوئی عمومی سے موضوع پر Synopsis تیار کرکے پیش کرتا ہے تو اس سے کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ موضوع نہیں چلے گا اور اس پر تو کام ہوچکا ہے۔ جب طالب علم عاجزی سے درخواست کرتا ہے کہ سر آپ ہی کوئی موضوع تلاش کردیں تو اکثر اساتذہ یہی کہتے ہیں موضوعات کہاں سے لائیں موضوعات کی تو قلت ہے۔ آندھرا پردیش، تلنگانہ اور دیگر ریاستوں میں شروع ہونے والی نئی جامعات کے شعبہ جات اردو میں یہی سنا گیا کہ ہم کچھ مدد نہیں کرسکتے آپ ہی کسی سینئر پروفیسر سے مل کر اپنا موضوع طے کیجیے اور یہ دیکھا گیا ہے کہ ہر سال داخلوں کے موقع پر طلبا اور اساتذہ باضابطہ طور پر ریسرچ موضوعات کی تلاش میں لگ جاتے ہیں۔ یہ اردو ریسرچ کا اہم مسئلہ ہے۔ اس جانب فوری توجہ کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلا یہ کام کیا جائے کہ موضوعات کی تکرار سے بچنے کے لیے ہندوستان اور پاکستان کی جامعات میں اردو تحقیق پر کیے جانے والے تمام موضوعات کی فہرست سازی کی جائے۔ جس کے لیے ایم فل یا پی ایچ ڈی میں ببلیو گرافی کا کام کروایا جاسکتا ہے۔ یونیورسٹی آف حیدرآباد سے شاہانہ مریم نے اس طرح کا کام کیا ہے جس میں ہندوستان کی جامعات میں اردو تحقیقی موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس موضوع کو پاکستان تک بھی وسعت دینے کی ضرورت ہے کیونکہ اردو تحقیق کا معیاری کام وہاں بھی ہوا۔ اس کے ساتھ ہی یو جی سی سے کہہ کر کوئی ایسا انتظام کیا جائے کہ ہر سال ملک کی تمام جامعات میں رجسٹرڈ ہونے والے موضوعات کی اطلاع ملک بھر کی یونیورسٹیوں کو کردی جائے تاکہ موضوعات کی تکرار سے بچا جاسکے۔ جہاں تک موضوعات کی قلت کی بات ہے یہ نظر کی کمی ہے۔ ہمیں اپنے سرمائے کا علم ہونا چاہیے اور اس میں پوشیدہ موتیوں کو کھوجنے کی لگن۔ تحقیق کی دیگر اقسام اجتماعی تحقیق۔ بین العلومی تحقیق۔ لسانیات۔ تدوین متن۔ دبستان، تحریک وغیرہ موضوعات سے نئے موضوعات تلاش کیے جائیں۔ فرد پر تحقیق کے رجحان کو کم کیا جائے۔ تحقیق سے سماج اور زبان و ادب کو فائدہ ہونا چاہیے۔ اگر آپ کوئی قدیم کتاب کا مطالعہ کریں جیسے دکن میں اردو از نصیر الدین ہاشمی۔ مدراس میں اردو از افضل الدین اقبال یا بیسویں صدی میں اردو ناول تو ان کتابوں کے مطالعے کے دوران کئی تحقیقی موضوعات مل سکتے ہیں۔ اردو کے نامور ادیبوں سے متعلق بھی موضوعات مل سکتے ہیں۔ آل احمد سرور کے کارناموں کا مطالعہ کیجیے۔ ان کی آپ بیتی 'خواب باقی ہیں' کا ذکر ملے گا جس پر تحقیقی کام کروایا گیا۔ اس طرح دیگر ادیبوں کی آپ بیتیوں پر کام کروایا جاسکتا ہے۔ کرشن چندر کے کارناموں کو دیکھیے ان کے رپورتاژ 'پودے' کا ذکر ملے گا جس پر کام کروایا گیا۔ منٹو کے افسانے مختصر ہیں۔ لیکن اس میں تحقیق کے نئے گوشے تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ جیسے منٹو کے کرداروں کا نفسیاتی جائزہ۔ منٹو کی لفظیات۔ منٹو کی عصری بازیافت وغیرہ۔ اسی طرح قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں تاریخی شعور۔ انتظار حسین کے ناولوں میں اساطیر وغیرہ موضوعات بن سکتے ہیں۔ اس طرح ہمارے اردو ادب کے سرمایے سے مزید کئی موضوعات تیار کیے جاسکتے ہیں۔ اردو کے ادبی رسائل میں ادب کا ایک خزانہ پوشیدہ ہے۔ اب آنے والی نسل اردو کے نامور رسائل شب خون، ساقی، ہمایوں، نگار وغیرہ کے صرف نام سے واقف ہے۔ دھول میں پڑے ان رسائل کو کوئی ہاتھ نہیں لگانا چاہتا۔ ایسے موضوعات دیے جاتے ہیں جس میں مواد آسانی سے دستیاب ہو اور کام ہوجائے آج اردو تحقیق کو یہ کہہ کر بدنام کیا جاتا ہے کہ دس بیس کتابیں سامنے رکھو ان میں سے حوالے لو اور اپنا مقالہ تیار کرلو۔ گائیڈ کے دوسرے گائیڈ سے آپسی مراسم کے سبب بھی اس طرح کے مقالے کامیابی کی سند حاصل کر لیتے ہیں۔ قدیم مخطوطات میں آج بھی تدوین متن کا کام باقی ہے لیکن کوئی کرنے والا تیار نہیں۔ اس لیے اس کام سے مناسبت رکھنے والے بزرگ اساتذہ کی ذمے داری ہے کہ وہ اپنی نیابت سنبھالنے والی نئی نسل کو تیار کریں۔ حیدرآباد میں ڈاکٹر زور۔ پروفیسر سیدہ جعفر۔ ڈاکٹر محمد علی اثر ماہر دکنیات مانے جاتے ہیں۔ اب آنے والی نسل میں ڈاکٹر نسیم الدین فریس ماہر دکنیات کے طور پر مشہور ہیں لیکن مزید طلبا کو اس جانب آگے آنے کی ضرورت ہے۔ تحقیق کے موضوعات کے ضمن میں یونیورسٹیوں میں خصوصی ورکشاپ ہونے چاہئیں۔ اور سینئر اور ریٹائرڈ اساتذہ سے بھی مشاورت کی جاسکتی ہے۔ حیدرآباد میں پروفیسر مغنی تبسم صاحب مرحوم استاذ الاساتذہ کا رتبہ رکھتے تھے اور اکثر یونیورسٹی کے پروفیسر اور طلبا ان سے ریسرچ موضوعات کے بارے میں مشاورت کیا کرتے تھے۔ ان کے جانے کے بعد جو خلا پیدا ہوا ہے وہ کوئی سینئر پروفیسر کرسکتا ہے۔ پروفیسر بیگ احساس، پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، ڈاکٹر عقیل ہاشمی اور ہندوستان کے دیگر علاقوں سے سینئر اساتذہ کی خدمات اچھے موضوعات کے لیے لی جانی چاہئیں اور معیاری اور دلچسپ موضوعات پر کام کروانا چاہیے۔ ریسرچ اسکالر کی پسند کا لحاظ بھی رکھا جائے اور زبردستی اسے کوئی موضوع الاٹ نہ کیا جائے ورنہ بھرتی کا کام ہوگا۔ ریسرچ اسکالرس بھی ایم اے اور ایم فل تک آتے آتے اس قدر ادب کا مطالعہ رکھیں کہ انہیں بھی موضوعات کے دائرہ کار کا اندازہ ہو صرف ایم اے کے نوٹس پڑھ کر اور معروضی سوالات یاد کرکے اردو کا معیار نہیں بڑھایا جاسکتا۔ اس کے لیے بہت ساری کتابوں کے مطالعے کی ضرورت ہے۔

4. **مواد کی فراهمی:** ریسرچ میں داخلے اور موضوع کے انتخاب کے بعد مواد کی فراہمی بھی اسکالر کے لیے ایک اہم مسئلہ ہے۔ اور اردو میں کوئی ترقی یافتہ میکانزم نہ ہونے کے سبب معلوم ہونے کے باوجود مواد تک رسائی نہیں ہو پارہی ہے۔ اس کے لیے اردو کتابوں کو اسکین کرکے پی ڈی ایف کی شکل میں انٹرنیٹ پر محفوظ کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اب کوئی اسکالر خدا بخش لائبریری تک سفر کرنے اور وہاں کی کتابیں کھنگالنے کا حوصلہ اور ہمت نہیں رکھتا۔ جبکہ پہلے لوگ پاکستان اور لندن تک بھی مواد کی تلاش میں جایا کرتے تھے۔ اسی طرح تمام شعبہ جات میں موجود اردو مقالوں کو کمپیوٹر پر یونیکوڈ میں منتقل کرکے انھیں انٹرنیٹ پر ویب سائٹ کے ذریعے محفوظ کردیا جائے تو گوگل سرچ میں یہ مقالے نظر آئیں گے۔ اس کے لیے ایک تجویز ہے کہ جس طرح اب یونیورسٹیوں میں مقالے کی سی ڈی لی جارہی ہے۔ اس میں پی ڈی ایف کے ساتھ ان پیج فائل بھی لی جائے اور اسے یونیکوڈ کنورٹر سے یونیکوڈ میں منتقل کرکے شعبہ اردو کی ویب سائٹ پر محفوظ کردیا جائے۔ اور جو مقالے بغیر سی ڈی کے قدیم ہیں انھیں ایک پروجیکٹ کے ذریعے یونیکوڈ میں ٹائپ کرواکر اپ لوڈ کیا جائے تو اچھی مثال

قائم ہوگی۔ اس کے لیے یو جی سی سے خصوصی فنڈ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ مواد کی فراہمی میں آسانی کے لیے دیگر یونیورسٹیوں سے مفاہمت۔ انٹرنیشنل ڈیجیٹل لائبریری میں اردو کتابوں کی شمولیت۔INFLIBNET سہولت سے استفادہ اور انفرادی طور پر روابط کے ذریعے مواد کی فراہمی کو آسان بنایا جاسکتا ہے۔ مواد کی موجودگی کا پتہ تو اسکالر سے زیادہ اس کا گائیڈ ہی دے سکتا ہے۔ اسی طرح قدیم دور کی کتابوں کے لیے اضلاع کے قدیم کتب خانے بھی اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ دیکھا گیا ہے کہ شہر کے کتب خانوں کے مقابلے میں اضلاع کے کتب خانوں میں بعض قیمتی و نادر کتابیں بھی ملی ہیں۔ کتابوں کے کیٹلاگ کی اشاعت سے بھی مواد کی موجودگی کا پتہ چل سکتا ہے۔ اس کے لیے تمام کتب خانوں کے کیٹلاگ کی اشاعت پر زور دیا جائے۔ ببلیو گرافی کے کاموں سے بھی مواد کی پہچان ممکن ہے۔

5. **مقالے کی تسوید کے مسائل:** تحقیق میں کھرے اور کھوٹے کی پہچان اور مفروضات کو حل کرنے کے لیے درکار حوالوں کے ساتھ جب محقق اپنا مقالہ لکھنے لگتا ہے تب بھی اسے اپنی بات روانی سے اور قابل قبول بنانے کے لیے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور نگراں سخت ہو تو اس کے مقالے کی تسوید کا مرحلہ بھی دشوار طلب ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ محقق کو اردو زبان میں روانی کے ساتھ لکھنے کا فن آجائے۔ ایم اے میں ٹرم پیپر اور سمینار پیپر لکھائے جاتے ہیں۔ ایم فل کا مقالہ لکھا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ریسرچ اسکالر کی ذمے داری ہے کہ وہ دوران تحقیق مختلف ادبی رسائل اور اخبارات میں مختلف ادبی موضوعات پر تحقیقی مضامین شائع کرواتا رہے۔ آج کل اسسٹنٹ پروفیسر کے انٹرویو کے دوران پوچھا جارہا ہے کہ کتنی تحقیقی کتابیں اور کتنے ریسرچ پیپر ISBN-ISSN-NO کے ساتھ شائع ہوئے ہیں۔ اس لیے ریسرچ اسکالر اپنی تحریر میں پختگی لانے کے لیے ریسرچ پیپر لکھے۔ اس کے لیے طے شدہ موضوع پر سیر حاصل موا د پیش کرے اور اپنے مضمون کی اپنے گائیڈ یا کسی سینئر استاد سے اصلاح کرالے۔ اساتذہ کی بھی ذمے داری ہے کہ وہ اپنے اسکالرس کو ریسرچ پیپر لکھنے اور ان کی اشاعت کے لیے حوصلہ افزائی کرتے رہیں۔ اس سے اصل مقالہ لکھتے وقت آسانی ہوتی ہے۔ مقالہ نگاری بھی ایک فن ہے۔ اور اس کے لیے اچھے اور مثالی مقالے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اردو میں ایک مثالی مقالہ پروفیسر یوسف سرمست کا 'بیسویں صدی میں اردو ناول' ہے۔ اس میں مقالہ نگار نے انگریزی اور اردو کتابوں کے بیشتر حوالے دیے اور اپنی کسی بات کی دلیل یا تردید میں حوالوں کا فن کاری کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ اس طرح محقق مقالے میں اپنی کوشش سے جان ڈال سکتا ہے۔ اور اس کا مقالہ ڈگری ایوارڈ ہونے کے فوری بعد چھپنے کے لائق ہوجاتا ہے۔

6. **اردو ریسرچ اسکالر کی شناخت کا مسئلہ:** اردو تحقیق میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ ریسرچ اسکالر ایک عرصے تک ادب، تحقیق اور تنقید کی دنیا میں اپنی شناخت کے مسئلے سے دوچار رہتا ہے۔ قومی و بین الاقوامی سمیناروں میں اس سے انتظامی امور میں کام لیا جاتا ہے لیکن پیپر پیش کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ بڑے سمیناروں میں بھی ایک سیشن ریسرچ اسکالرس کا رکھا جائے تاکہ انھیں اپنی خامیاں دور کرنے کا موقع مل سکے۔ اس ضمن میں ایک تجویز یہ بھی ہے کہ شہر میں ایک ریسرچ اسکالرس فورم قائم کیا جائے، جہاں مہینہ دو مہینہ میں ایک مرتبہ منتخبہ ریسرچ اسکالرس اپنے مقالے پیش کریں اور ان پر کسی مدعو سینئر استاد کے ذریعے بحث ہوں۔ اس طرح کی کوشش سے بھی نئے اسکالرس کو آگے بڑھنے کا موقع ملے گا اور ان کی شناخت کا مسئلہ کم ہوگا۔ ضلع نظام آباد میں حالیہ عرصے میں اردو اسکالرس ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا ہے، جس کے حوصلہ افزا نتائج سامنے آرہے ہیں۔ اسکالرس کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ انٹرنیٹ بھی استعمال کریں اور دنیا بھر کی مختلف اہم اردو ویب سائٹس پر اپنے مضامین اشاعت کے لیے روانہ کریں۔

7. **شعبہ اردو کے ترجمان رسالہ یا ای میگزین اور فیس بک گروپ کی ضرورت:** جامعاتی تحقیق میں نصابی اور زائد از نصاب سرگرمیوں کا ایک حصہ شعبہ اردو کے ترجمان رسالے کی اشاعت ہے۔ جو سہ ماہی، ششماہی یا سالانہ ہوسکتا ہے۔ اس کے لیے ریسرچ اسکالرس میں سے ہی ایک میگزین کمیٹی بنائی جائے اور اپنی جامعہ کے علاوہ دیگر جامعات کے اسکالر سے بھی تخلیقات حاصل کی جائیں۔ میگزین کی اشاعت کے لیے مالیہ ضروری ہے۔ اس کے لیے اردو تنظیموں اردو اکیڈیمی اور اردو دوست احباب سے اشتہارات کی شکل میں رقم حاصل کی جائے۔ یا اساتذہ اور اسکالرس اپنی جانب سے ڈونیشن کے ذریعے میگزین کی اشاعت عمل میں لائیں۔ میگزین کا ISSN نمبر حاصل کیا جائے اور اس کا ای میگزین بھی جاری کیا جائے اس کے لیے اسکالرس میں سے کسی کمپیوٹر کے ماہر کی خدمات حاصل کی جائیں۔ اسی طرح فیس بک پر بھی شعبہ اردو کا گروپ بنایا جاسکتا ہے۔ جس پر ریسرچ اسکالرس ادبی مباحث اور دیگر باتیں شیئر کرسکتے ہیں اور دنیا بھر میں اردو کے ماہرین سے رابطے میں رہ کر اپنے مسائل حل کرسکتے ہیں۔ فیس بک پر آج بھی کئی ایسے اردو کے مقبول گروپ ہیں جن میں اردو میں تحریر کرنا لازمی ہے۔ اور ان گروپوں میں شعرا کی تاریخ پیدائش کے اعتبار سے مضامین پیش ہوتے ہیں۔ موضوعاتی اشعار پیش ہوتے ہیں اور افسانہ نویسی اور مضمون نویسی کے مقابلے ہوتے ہیں۔

8. **فارسی اور دکنی سے عدم واقفیت:** اردو تحقیق کا ایک مسئلہ جو بہ طور خاص دکنی میں کام کرنے والوں کا ہے وہ دکنی زبان سے عدم واقفیت ہے اور دکنی میں کام کرنے والوں کی صحیح رہنمائی نہی ں ہوتی ہے۔ حالیہ عرصے میں دکنی لغت کا کام ہوا ہے اور اب یہ دستیاب ہے۔ دکن کی جامعات کے اردو شعبہ جات کی ذمے داری ہے کہ وہ دکنی میں تحقیق کی حوصلہ افزائی کریں اور طلبا کو اس جانب راغب کریں۔ اس کے لیے دکنی کے ماہر اساتذہ کا انتخاب کیا جائے۔ یا بیرونی نگراں کی سہولت کے ساتھ تحقیق کی اجازت دی جائے۔ اسی طرح فارسی سے عدم واقفیت کی بنا پر بہت سے ریسرچ اسکالر فارسی سے متعلق کوئی کام کرنے کے لیے آگے نہیں آرہے ہیں اس لیے اس جانب بھی توجہ کی ضرورت ہے۔ اردو یونیورسٹی کے شعبہ فارسی سے استفادہ کیا جائے اور دیگر جامعات میں فارسی کے سرٹیفکیٹ کورسز شروع کیے جائیں۔

9. **ریسرچ کے اخراجات:** اردو ریسرچ کے بعض موضوعات میں اسکالر کو بیرون ملک سفر کی ضرورت پڑسکتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ موضوع کی نوعیت کی مناسبت سے اس کے سفر خرچ اور دیگر اخراجات کی ادائیگی کا انتظام کیا جائے۔ موجودہ اسکالر شپ اسکالر کے ماہانہ اخراجات کے لیے ناکافی ہے اس کی حد میں اضافہ کیا جائے۔ اس جانب یونیورسٹی انتظامیہ توجہ دے۔

10. **اردو تحقیق کے دیگر مسائل:** اردو تحقیق کے انفرادی اور اجتماعی مسائل ہیں۔ کچھ مسائل ریسرچ اسکالرس سے متعلق ہیں تو کچھ مسائل اساتذہ اور یونیورسٹیوں کے ہیں۔ جیسے رہائش کے مسائل۔ مناسب غذا نہ ملنے کے مسائل، ہاسٹلوں کے مسائل، خاتون ریسرچ اسکالرس کے مسائل، اساتذہ کو ریسرچ پروگریس دکھانے کے مسائل وغیرہ اکیسویں صدی انفارمیشن ٹیکنالوجی اور علوم کی ترقی کی صدی ہے اس میں کسی زبان میں ریسرچ کی اہمیت گھٹتی جارہی ہے۔ ایسے میں آنے والے اسکالرس اور اساتذہ کی ذمے داری ہے کہ وہ اپنی زبان و ادب کی اہمیت برقرار رکھیں۔ اور اس میں اعلیٰ پائے کی معیاری تحقیق کرتے رہیں۔

■

Dr. Mohd Aslam Farooqui Asst. Prof. & Head
Dept of Urdu, Giriraj Govt. College
Nizamabad - 503001 (Telangana)

دکنی پر ملیالم اور ملیالم پر دکنی کے اثرات

سید سجاد حسین

کیرل ایک قدیم خطۂ زمین ہے جو اپنے اندر صدیوں کی تاریخ رکھتا ہے۔ 'رامائن' اور 'مہابھارت' میں بھی اس کا ذکر آیا ہے اور یونانی سفیر میگا ستھنیز جو چوتھی صدی قبل مسیح میں ہندوستان آیا تھا اُس نے بھی اس خطۂ زمین اور یہاں کے راجا کا تذکرہ کیا ہے۔ جزیرہ نما کی اولین سلطنت ہونے کی حیثیت سے اشوک کے کتبوں میں اس کی اہمیت نمایاں کی گئی ہے۔

تاریخ کے ابتدائی ایام ہی سے کیرل کو غیرملکی تجارت کے میدان میں ایک خاص مقام حاصل تھا۔ دنیائے قدیم کی تمام اہم تہذیبوں مثلاً مصر، عرب، بابل، روم اور چین کے تجارتی تعلقات کیرل کے بحری ساحل سے استوار تھے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ قدیم انجیل میں حضرت سلیمان کے جہازوں کا، ہاتھی دانت، مورچھل اور بندر وغیرہ غیرممالک سے مصر کی بندرگاہوں میں لے آنا دراصل ملابار کے تجارتی تعلقات کو ظاہر کرتا ہے جو اُس وقت دنیا کے دیگر ممالک سے استوار تھے۔ مورخین نے اس بات کی نشان دہی بھی کی ہے کہ اُس وقت دنیا کے کسی بھی حصے میں ہاتھی دانت اور مورچھل کی تجارت کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔

(ملیالم ادب کی تاریخ، مطبوعہ ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، ص 6)

1498 میں پرتگالی، واسکوڈی گاما کی قیادت میں کالی کٹ کے ساحل پر اتر آئے۔ ان کے فوراً بعد یہاں جرمن قوم نمودار ہوئی۔ ان غیرملکیوں کا مقصد اول تو تجارت تھا لیکن وہ اپنی شاطرانہ چالوں سے مقامی معاملات میں دخل دینے لگے۔ ایک راجا کو دوسرے راجا سے لڑایا اور اس طرح ایک مختصر مدت میں غیرملکیوں کے اثرات اور مشورے بھی ملک کے دیگر علاقوں کے اندرونی معاملات میں ناگزیر سمجھے گئے۔ 17ویں صدی کے اختتام تک کیرل کا سیاسی نقشہ تین مرکزی سلطنتوں پر مشتمل ہوگیا۔ جنوب میں وینا ڈ و یا ٹراونکور، شمال میں کالی کٹ اور وسط میں کوچین، انگریزوں کی آمد کے سبب یہاں کی سیاسی تنظیم میں مزید تبدیلیاں آئیں۔ شمالی علاقوں پر جو آزاد حکومتیں تھیں وہ مشمول کالی کٹ انگریزوں کے قبضے میں چلی گئیں اور ٹراونکور اور کوچین کو دیسی ریاستوں کی حیثیت سے آزاد چھوڑ دیا گیا۔

نومبر 1956 میں جب ریاستوں کی ازسرنو تشکیل ہوئی تو ریاست کیرل کا وجود عمل میں آیا جو سابق ٹراونکور کوچین، قدیم ملابار، جنوبی کینرا اور کاسرکوڈ پر مشتمل تھی اور تشکیل شدہ اس ریاست کی سرکاری زبان ملیالم قرار پائی۔

ملیالم کا تعلق دراوڑی زبانوں کے خاندان سے ہے اور یہ تمل، تلگو، اور کنڑ کے مقابلے میں نسبتاً کم عمر ہے۔ ماہرین لسانیات کا خیال ہے کہ ملیالم زبان تمل ہی کا ایک حصہ تھی، جو زمانے کے ساتھ ساتھ اپنی شناخت و انفرادیت قائم کرتے ہوئے ایک علاحدہ زبان کا درجہ حاصل کرگئی۔

لفظ 'ملیالم' زبان کے معنوں میں بہت بعد میں استعمال ہونا شروع ہوا۔ ابتدا میں اس سے ریاست مراد لی جاتی تھی۔ یہ ایک مرکب لفظ ہے جو دو لفظوں کے اشتراک سے تشکیل پایا ہے۔ 'ملیے' اور 'آلم'۔ ملیے کے معنی پہاڑ اور 'آلم' کے معنی خطہ یا علاقے کے ہیں اس زبان کا علاقہ چونکہ پہاڑوں کے دامن میں واقع ہے اس لیے غالباً اس نام سے اسے موسوم کیا گیا اور آگے چل کر یہاں

کی زبان کے لیے بھی یہی لفظ استعمال کیا جانے لگا۔

موجودہ کیرل کی حد بندی ٹراونکور، کوچین، قدیم ملابار، جنوبی کینرا اور کاسرکوڈ علاقوں پر مشتمل ہے۔ پڑوسی ریاستوں میں اس کی سرحدیں تمل ناڈو اور کرناٹک سے ملتی ہیں اور دوسری طرف مغربی گھاٹ کا ایک طویل سلسلہ ہے جو اس ریاست کے لیے قدرتی طور پر حد بندی کا کام کرتا ہے۔ اس صوبے میں تقریباً 95 فیصد عوام کی زبان ملیالم ہے اور بقیہ پانچ فیصد دوسری زبانیں بولی جاتی ہیں۔

صوبۂ کیرل کے بیشتر علاقوں میں مستقل طور پر بولی اور سمجھی جانے والی زبان صرف ملیالم ہی رہی ہے۔ البتہ اُن علاقوں میں عوام کچھ حد تک تمل اور کنڑ زبانوں سے واقف ہیں۔ جہاں کیرل تمل ناڈو اور کرناٹک کی سرحدیں آپس میں ملتی ہیں۔ اس سے ہٹ کر پڑوسی ریاستوں کے سیاسی، سماجی، تہذیبی، معاشرتی اور مذہبی اثرات یا تو ان علاقوں پر بہت کم پڑے ہیں یا پڑے بھی ہیں تو ان کی نوعیت عارضی ہے۔ مثلاً حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے عہد میں (1761-1799) ان علاقوں میں جو فتوحات ہوئیں ان سے فارسی کے ساتھ دکنی زبان بھی اس علاقے میں پہنچی لیکن چونکہ یہ علاقہ مذکورہ سلاطین کے قبضے میں بہت کم مدت کے لیے رہا اور واضح رہے کہ یہ مدت بھی انتشار کا شکار رہی اس لیے قرین قیاس ہے کہ دکنی زبان اس علاقے پر کماحقہٗ اپنا اثر نہیں ڈال سکی۔ ورنہ اس عہد میں یا

آزادی سے کچھ پہلے بعض تاجر پیشہ سیٹھ خاندان ان علاقوں میں جابسے تھے۔ ان کی وجہ سے دکنی زبان اور شعر و شاعری کا ذوق اس سرزمین میں پیدا تو ہوا لیکن اتنا مقبول نہ ہوپایا جس سے کوئی بڑی تہذیبی یا لسانی تبدیلی آئی ہو البتہ یہ ہوا کہ ملیالم زبان اردو سے متاثر ہوتی چلی گئی۔ ملیالم کے اثرات جو دکنی زبان پر دیکھے جاسکتے ہیں وہ نہ تو قابل قدر ہیں اور نہ ان کا ردعمل دیرپا ہے۔ ملیالم کے کچھ الفاظ جن کا بدل اردو یا قدیم دکنی میں نہیں ملتا وہ البتہ دکنی بول چال میں مل جاتے ہیں۔

اس کے فوراً بعد کے دور میں دکنی زبان کے اثرات اس زبان پر ضرور ظاہر ہوتے۔ خود نوابین آرکاٹ کی نگاہ ملابار کے علاقوں پر رہی لیکن سیاسی طور پر وہ ان علاقوں کا استحصال نہیں کر پائے۔ البتہ انگریز یہاں اپنا اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے اور ان کے زیر اقتدار فارسی کے توسط سے فوج داری، تجارتی، مالی و شہری نظم و نسق میں استعمال ہونے والی اردو اصطلاحات اور الفاظ ملیالم زبان میں داخل ہو گئے اور جن کی تعداد بقول پی ایم جوسف (مصنف پر گیا پڈنگل) سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔ لیکن دکنی زبان پر ملیالم کے اثرات تلاش کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ دکنی بولنے والی آبادی اس علاقے میں پھیل نہ پائی۔ ٹیپو سلطان یا اس سے پہلے دکنی بولنے والوں کے قدم اس سرزمین پر پڑے تو ضرور تھے لیکن انتشار اور افراتفری کے سبب سیاسی اثرات کوئی لسانی تبدیلی نہ لا سکے۔ انگریز بھی انتظامی امور کے تحت اردو اصطلاحات تو داخل کردیے لیکن ملیالم سے وہ بھی کچھ نہ لے پائے۔ آزادی سے کچھ پہلے بعض تاجر پیشہ سیٹھ خاندان ان علاقوں میں جابسے تھے۔ ان کی وجہ سے دکنی زبان اور شعر و شاعری کا ذوق اس سرزمین میں پیدا تو ہوا لیکن اتنا مقبول نہ ہو پایا جس سے کوئی بڑی تہذیبی یا لسانی تبدیلی آئی ہو البتہ یہ ہوا کہ ملیالم زبان اردو سے متاثر ہوتی چلی گئی۔ ملیالم کے اثرات جو دکنی زبان پر دیکھے جاسکتے ہیں وہ نہ تو قابل قدر ہیں اور نہ ان کا ردعمل دیرپا ہے۔ ملیالم کے کچھ الفاظ جن کا بدل اردو یا قدیم دکنی میں نہیں ملتا وہ البتہ دکنی بول چال میں مل جاتے ہیں۔

مثلاً 'کاکا' یہ لفظ خاص طور پر شمالی آرکاٹ تنجاور اور ترچل ویلی کے دکنی بولنے والوں کے یہاں ملتا ہے۔ 'کاکا' بنیادی طور پر ملیالم کا لفظ ہے۔ 'کاکا' کے معنی بھائی کے ہیں۔ یہ لفظ اتنا عام ہو گیا ہے کہ بعض دکنی خاندان جو کیرل سے ہجرت کر کے تمل ناڈو کے مختلف علاقوں میں بس گئے ہیں وہ اپنے نام کے ساتھ 'کاکا' کا لفظ شامل کر کے اپنی شناخت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر آمبور کے قریب دارالسلام عمرآباد عربک کالج کے بانی کاکا محمد عمر تھے۔ اسی طرح کاکا محمد زبیر اور کاکا عبدالمجید وانمباڑی کے معزز لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔

دوسرا لفظ جو ملیالم سے دکنی اردو میں رائج ہوا وہ 'گرامم' ہے۔ آج بھی مدورائی۔ ترچنا پلی اور پانڈیچری کے دکنی بولنے والوں کے یہاں 'گرامم' بول چال میں استعمال ہوتا ہے۔ گرامم بمعنی گاؤں کے۔ لطف کی بات یہ

ٹیپو سلطان یا اس سے پہلے دکنی بولنے والوں کے قدم اس سرزمین پر پڑے تو ضرور تھے لیکن انتشار اور افراتفری کے سبب سیاسی اثرات کوئی لسانی تبدیلی نہ لاسکے۔ انگریز بھی انتظامی امور کے تحت اردو اصطلاحات تو داخل کردیے لیکن ملیالم سے وہ بھی کچھ نہ لے پائے۔ آزادی سے کچھ پہلے بعض تاجر پیشہ سیٹھ خاندان ان علاقوں میں جابسے تھے۔ ان کی وجہ سے دکنی زبان اور شعر و شاعری کا ذوق اس سرزمین میں پیدا تو ہوا لیکن اتنا مقبول نہ ہوپایا جس سے کوئی بڑی تہذیبی یا لسانی تبدیلی آئی ہو البتہ یہ ہوا کہ ملیالم زبان اردو سے متاثر ہوتی چلی گئی۔

ہے کہ شہروں میں دکنی بولنے والوں کے یہاں لفظ 'گرامم' کا رواج قدرے کم ہے۔

کیرل میں ناشتے کا تصور 'کوڑاپٹو' اور 'ایندرم پڑھم' کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ کوڑاپٹو چاول کا موٹا پسا ہوا آٹا جسے گول اور لمبے سانچے میں ڈال کر ابال دیتے ہیں۔ اس میں تراشا ہوا کھوپرا بھی ملا ہوتا ہے۔ یہ جب پک کر تیار ہوجاتا ہے تو ایک خاص اسطوانی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ اسی مناسبت سے ملیالم میں اسے 'کوڑولپٹو' کہتے ہیں چونکہ ملیالی صبح میں عموماً نرم و ہلکی پھلکی غذا کھانے کے عادی ہیں اس لیے کوڑاپٹو کو بطور غذا ناشتے میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ اصطلاح دکنی بولنے والوں میں رائج ہے۔ کلی کٹ، تلیچیری اور ملاپورم میں جو دکنی خاندان بستے ہیں۔ ان کے یہاں بھی کوڑاپٹو بطور غذا کے ناشتے میں استعمال ہوتا ہے اور روزمرہ میں بھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مدراس میں بھی 'کوڑاپٹو' کی اصطلاح عام ہوچلی ہے۔ یہاں کے دکنی بولنے والے ملیالی ہوٹلوں سے 'کوڑاپٹو' خرید کر کھاتے ہیں اور اس نام سے وہ اسے روزمرہ میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ یہاں ایک بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ مدراس کے دکنی بولنے والے کوڑاپٹو کو ناشتے میں بطور غذا کے نہیں بلکہ علی الصبح شوقیہ استعمال کرتے ہیں۔

'ایندرم پڑھم' کیرل کا ایک خاص کیلا ہے۔ ملیالم میں اسے ایندرم پڑھم کہتے ہیں۔ دکنی بولنے والے بھی اس کو اسی نام سے جانتے ہیں۔ اس کیلے کی خاص

خصوصیت یہ ہے کہ یہ ابلا ہوا کھانے میں مزہ دیتا ہے۔ اس لیے ملیالی ناشتے میں ہر دن کم از کم ایک اُبلا ہوا کیلا ایندرم پڑھم کا استعمال ضروری سمجھتے ہیں۔ 'ایندرم پڑھم' کی اصطلاح مدراس کے دکنی بولنے والوں میں بھی عام ہے۔

'ماپلئی' یا 'مہاپلئی' اگرچہ ملیالم کا لفظ ہے لیکن یہ تمل اور دکنی میں زیادہ مروج ہے۔ 'مہا' بمعنی اعلیٰ اور عظیم کے ہیں اور 'پلئی' سے مراد لڑکا ہے۔ مگر اصطلاحی معنوں میں نوشہ یا دولھا مراد ہے۔ یہ لفظ ملیالم میں مسلمانوں کے ایک مخصوص خاندان کی نشان دہی کرتا ہے۔ لیکن تمل اور دکنی زبان میں منتقل ہوکر یہ لفظ اپنے اصطلاحی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ تمل ناڈو کے تقریباً تمام علاقوں میں دکنی بولنے والے 'ماپلئی' کا لفظ کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ جب دو دوست ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو ایک دوسرے کو ماپلئی سے خطاب کرتے ہیں۔ مثلاً ماپلئی کیسے ہیں، ماپلئی میرا یہ کام کردیجیے۔ ماپلئی میں جلدی میں ہوں کل ملیں گے وغیرہ وغیرہ۔

زبانوں کے درمیان لین دین کے وقت بعض ایسے الفاظ بھی درآتے ہیں جن کے استعمال سے تضحیک کا پہلو ظاہر ہوتا ہے۔ ملیالم میں ایک ایسا ہی لفظ ہے 'گنجی ولم' یہ دو لفظوں پر مشتمل مرکب لفظ ہے۔ گنجی بمعنی چاول کی پتلی غذا۔ ولم کے معنی پانی۔ ایسی غذا جس میں صرف چاول اور پانی ملا ہوا ہو۔ گنجی ولم سے مراد ملیالی ہے۔ یہ لفظ ملیالیوں کے لیے بطور استعارہ استعمال ہوتا ہے۔ چونکہ ملیالیوں میں قوت برداشت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ وہ صرف گنجی ولم پر مہینوں گزارا کرسکتے ہیں۔ اس لیے یہ لفظ بطور تضحیک کے ملیالیوں سے منسوب ہے۔ دکنی روزمرہ میں بھی اسی معنوں میں یہ لفظ مروج ہے۔ اگر کسی ملیالی کو چھیڑنا مقصود ہو تو اسے صرف گنجی ولم کہہ دینا کافی ہوگا۔

اس طرح ملیالم زبان کے اکا دکا کچھ اور الفاظ ممکن ہیں مل جائیں لیکن یہ فہرست طویل نہیں ہوسکتی۔ البتہ دکنی کے ایسے الفاظ جو ملیالم میں مستعمل ہیں بہت زیادہ ہیں جن کا ذکر یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

ملیالم میں سب سے زیادہ اردو الفاظ انتظامیہ سے تعلق رکھتے ہیں اس کی سب سے بڑی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ٹیپو اور حیدرعلی کے زمانے میں ملابار کے بہت سے علاقے مسلم حکمرانوں کے ماتحت آگئے تھے۔ حیدرعلی اور ٹیپو سلطان کی دفتری زبان فارسی تھی اور اسی زبان میں احکامات، فرامین اور فیصلے سنائے جاتے تھے۔ لیکن یہ فارسی الفاظ جو دکنی میں پہلے ہی رائج ہوگئے تھے دکنی کے راستے سے ملیالم زبان میں بھی منتقل ہونے لگے۔ یہ الفاظ

دکنی پر ملیالم کے خاطر خواہ اثرات نہ پڑنے کی ایک وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ملیالی اپنی زبان و تہذیب کا اثر دوسروں پر چھوڑنے کی بجائے دوسروں کے اثرات قبول کرنے کے زیادہ شائق ہیں۔ یہ ان کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ جہاں جاتے ہیں وہاں کے حالات میں خود کو ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ ان کی کمزوری نہیں بلکہ کامیابی کا راز ہے۔

انگریزوں کے عہد میں بھی من وعن برقرار رکھے گئے اور آج بھی یہ الفاظ ملیالم میں بڑے شد و مد کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں:

دیوان Diwan	امین Amin
نذر Najar	جمعدار Jamedar
تحصیل دار Tahsildar	جاگیر Jagir
ضلع Jilla	فریاد Parati
بے نامی Binami	سفارش Siparsa
کمی Kammi	رسید Rasitu
سامان Samanam	ترازو Trasu
درخواست Darkkas	بخشش Baksis
پنچایت Panchayattu	دربار Darbar
سرکار Sarkar	حولدار Havildar
گماشتہ Gumasthan	

فوج، اسلحہ اور دفاع سے تعلق رکھنے والے الفاظ جو ملیالم میں رائج ہیں۔ یہ الفاظ حیدرعلی اور ٹیپو سلطان کے عہد میں فوجی فرمانوں اور دستاویزات کے تحت داخل ہوئے تھے:

پہرہ Parave	تیار Tayar
خونی Khuni	خندق Kandak
جنگی Jengi	تیر Tir
توپ Toup	بندوق Banduku
سپاہی Sipai	کمان Kaman
شمار Sumar	

عدل وعدالت میں رائج الفاظ کی فہرست:

عرضی Haraji	وصیت Osyathu
ضامن Jamyam	مختار Muktyar
راضی Raji	رد Raddu
وکیل Vakkil	انصاف Insaapu
نقد Nikuti	طلاق Talaqu

دریافت Daryapti	وصول Vasul
ترجمہ Tarjama	قرار Karar
معمول Mamul	تکرار Takarar

روزمرہ میں استعمال ہونے والے الفاظ کی فہرست:

مولوی Maulvi	
خالی Kali	برکت Varkkatu
شیطان Cekuttan	زکوٰۃ Cakkatu
خط Kattu	شربت Carvattu
حلوہ Aluva	فانوس Panusu
مکان Makkani	باقی Bakki
اچار Accar	پلاؤ Pulavu
میدہ Maida	رومال Urumal
فرنگی Paranki	سواری Savari
تماشا Tamasa	مہتاب Mattappu
بانگ Vanjku	شکار Sikkar
بڑائی Badayi	سراسر Sarasari
صاحب Sahibbu	میت Mayyattu
کھوپرا Kopra	کوزہ Kuja

دکنی پر ملیالم کے خاطر خواہ اثرات نہ پڑنے کی ایک وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ملیالی اپنی زبان وتہذیب کا اثر دوسروں پر چھوڑنے کی بجائے دوسروں کے اثرات قبول کرنے کے زیادہ شائق ہیں۔ یہ ان کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ جہاں جاتے ہیں وہاں کے حالات میں خود کو ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ ان کی کمزوری نہیں بلکہ کامیابی کا راز ہے۔

کتابیات:

1. ملیالم ادب کی تاریخ مطبوعہ ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی 1995
2. Foreign Loan words in Kannada by Shankar Kediiaya, Madras University, publication 1970
3. Comparative grammar of the Dravidian Languages by cald well - Madras University, 1956
4. Language and Languages by Graff Williams New York 1952
5. Arab - Geographers Knowledge of South India by Md. Hussain Nainar Madras University, 1942
66. History of Tipu Sultan by hasan Khan, Calcutta 1951

■

Dr. Syed Sajjad Husain Prof & Head Dept. of Arabic persian & Urdu, University of Madras, Marina Campus, Chennai - 600005 (Tamil Nadu)

محمد توقیر عالم

مولانا مظہرالحق اور ان کے کارنامے

جنگ آزادی کے عظیم رہنما، قومی یک جہتی کے علم بردار، قومی صحافت کے اہم رکن، مادر ہند کے ہونہار سپوت بیرسٹری چھوڑ کر فقیر بننے والے مولانا مظہرالحق کی تاریخ پیدائش 22 دسمبر 1866 اور جائے پیدائش مقام بہپورا ضلع پٹنہ ہے یہ جگہ پٹنہ شہر سے تقریباً پچیس کلومیٹر پچھم ہے۔ مولانا کی یادگار ایک مڈل اسکول اور ایک مسجد آج بھی بہپورا میں موجود ہے۔ والد کا نام احمد اللہ تھا۔ مظہرالحق بھائی میں اکیلے تھے۔ ان کی صرف ایک بہن تھی غفورالنساء۔

آبائی مقام بہپورا ضلع پٹنہ کے علاوہ ان کی زندگی کا کافی وقت فرید پور، آندر (موجودہ سیوان ضلع) میں گزرا جہاں ان کے والد احمد اللہ کی ننہال تھی۔ یہ گھرانا عقیدتاً وہابی تھا۔

مولانا کی سیاسی زندگی کو تین سطح پر دیکھنے کی ضرورت ہے۔ مقامی سطح، ریاستی سطح اور قومی سطح پر ان کی خدمات قابل ذکر ہیں۔ مولانا کی قریبی رشتہ داری سیوان شہر سے سولہ کلومیٹر جنوب آندر گاؤں میں تھی۔ مولانا نے وہاں اپنے لیے رہائش گاہ 1900 میں بنائی اور اس کا نام آشیانہ رکھا۔ اس آشیانہ میں وہ بہت دنوں تک رہے۔ بیرسٹری کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد مولانا نے پٹنہ پھر چھپرہ کچہری میں وکالت شروع کی۔ اس زمانے میں وہ بالکل کلین شیو کے خوبصورت سے نوجوان تھے۔ انگریزی سوٹ اور ٹائی میں ان کی شخصیت پروقار نظر آتی تھی۔ چھپرہ ضلع سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر راجندر پرساد بھی سیوان سے تقریباً پندرہ بیس کلومیٹر پچھم کے رہنے والے تھے اور انھوں نے بھی وکالت کا پیشہ اختیار کیا تھا۔

1903 میں مولانا کو سارن میونسپلٹی کا وائس چیرمین بنایا گیا۔ وہ اس عہدے پر 1906 تک رہے۔ اس مدت میں میونسپلٹی کی مالی حیثیت کافی مضبوط ہوگئی۔ ایک مدت کے بعد پھر وہ سارن میونسپلٹی میں آئے 1924 سے 1927 تک چیرمین رہے۔ ترہت ڈویزن کے کمشنر انگریز افسر ڈی۔ واٹسن D. Watson نے ان کے کاموں کی خوب تعریف کی۔

ریاستی سطح پر مولانا کی خدمات انتہائی قابل قدر ہیں۔ سچیدانند سنہا نے اپنی کتاب Some Eminent Behar Contemporaries میں لکھا ہے۔

"We are led to form a new alliance in which the Biharee Musalman was to play as prominent and as honorable part as his Hindu compatriets has done in the year gone by"

مولانا مظہرالحق، سچیدانند سنہا، دہلی دربار میں سر علی امام جیسے حضرات کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ شہنشاہ جارج پنجم نے 12 دسمبر 1911 کو بہار اور اڑیسہ کو ملا کر ایک الگ ریاست بنانے کا اعلان کیا ساتھ ہی یہ بھی اعلان کیا گیا کہ اس نوتشکیل شدہ ریاست کا صدر مقام پٹنہ ہوگا اس طرح 22 مارچ 1912 کو اس نئی ریاست کا قیام ہوگیا اور یکم اپریل 1913 سے سارے کام پٹنہ میں ہونے لگے۔ اس سے قبل یہ کلکتہ کے زیرنگیں تھا۔ اس تاریخ کو Royal Darbar of Delhi میں یہ اعلان کیا گیا کہ ہندوستان کا دارالخلافہ اب کلکتہ کی بجائے دہلی میں ہوگا۔ ایک دن قبل تک ریاست پنجاب کے زیر اثر دہلی کا شمار ایک تحصیل کے طور پر ہوتا تھا۔ دہلی دربار 1911 کی وجہ سے کلکتہ کی مرکزیت ختم ہوگئی۔

مسلم لیگ کے فاؤنڈر ممبر میں مولانا کا بھی نام آتا ہے اس تنظیم کو مضبوط اور پر اثر بنانے کی خاطر وہ حسن امام کے ساتھ ڈھاکہ اور بنگال کے دوسرے علاقوں میں گئے۔ بہار میں اس کے دفتر کی باضابطہ ابتدا 1908 سے ہوئی، تب سے مولانا اس کے سکریٹری رہے۔ انھوں نے 1915 میں اس کے بمبئی اجلاس کی صدارت بھی کی تھی۔ اس سلسلے میں سچیدانند سنہا کا بیان قابل ذکر ہے:

"Haque nursed the infant league on Nationalist Line"

یہاں ہم سچیدانند سنہا کے حوالے سے کہہ سکتے ہیں کہ Communal Harmony اور Nationalist Line کی بنیاد پر ہی مولانا نے مسلم لیگ کی پرورش کی۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مسلم لیگ سے تعلق رکھنے کے بعد بھی وہ انڈین نیشنل کانگریس سے دور نہیں رہے اور ساتھ مل کر چلنے کی کوشش کرتے رہے یعنی کانگریس اور مسلم لیگ ایک دوسرے کے رقیب یا حریف کے طور پر نہیں بلکہ ایک دوسرے کے معاون کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

انڈین نیشنل کانگریس کی ستائیسویں کانفرنس 1912 میں بانکی پور پٹنہ کے مقام پر منعقد ہوئی۔ اس (Reception) ری سپشن کمیٹی کے چیرمین مولانا ہی تھے۔ کچھ لوگوں نے مسلم لیگ کو مسلم تنظیم اور کانگریس کو ہندو تنظیم کہا۔ مولانا ایسی سوچ کے مخالف تھے۔

مولانا نے ہندوستانی صنعت کے تحفظ کی خاطر آواز اٹھائی اور یہاں کی انڈسٹری کے پچھڑے پن کا ذمے دار انگریزی حکومت کو بتایا۔ انھوں نے واضح طور پر کہا کہ حکومت برطانیہ برمنگھم اور لنکا شائر کی انڈسٹری کو دھیان میں رکھ کر ساری پالیسی بناتی ہے۔ جو ہندوستان کے ساتھ ناانصافی ہے، بہار کے ساتھ ناانصافی ہے۔ مولانا کے ان نظریات کی تائید دادا بھائی نوروجی نے بھی کی۔

پرائمری تعلیم کی فیس ختم کرنے کے لیے مولانا نے بہت کوشش کی اس زمانے میں بال کرشن گوکھلے نے بھی پرائمری تعلیم سے متعلق اس طرح کے مطالبات پیش کیے۔ ان دونوں رہنماؤں نے لڑکیوں کی تعلیم پر بھی خاص زور

دیا۔ ان کے زمانے میں تو یہ کوششیں پوری طرح بار آور نہیں ہو پائی لیکن ان باتوں کا اثر اب دیکھنے کو مل رہا ہے۔

انگریزی سرکار کی شروعات میں آئی سی اس (ICS) ایک عہدہ تھا اس کا امتحان لندن میں ہوتا تھا اور آج بھی ہوتا ہے۔ ہندوستان کے کسی بھی شہر میں اس امتحان کے لیے کوئی مرکز نہیں ہوتا تھا۔ مولانا نے انڈین نیشنل کانگریس کے 1912 والے پٹنہ اجلاس میں پرزور مطالبہ کیا کہ ہندوستان میں بھی امتحان کا مرکز بنایا جائے اور یہ بات مان لی گئی۔ کانگریس کے اسی اجلاس میں مولانا نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ افسران کو Executive اور Judiciary الگ الگ خانوں میں واضح طور پر رکھا جائے۔ مولانا کا یہ بھی مطالبہ تھا کہ وکیلوں کے بیچ سے ہی جیوڈیشری کے افسران کا انتخاب ہو۔ 1912 میں کانگریس پلیٹ فارم سے مولانا نے جو مطالبہ کیا تھا اسے مان لیا گیا۔

اسی زمانے میں ایک نئی اصطلاح ہوم رول کی آئی تھی۔ اردو کے مشہور شاعر اور لکھنؤ کے وکیل پنڈت برج نرائن چکبست نے کہا تھا:

برطانیہ کا سایہ سر پہ قبول ہوگا
ہم ہوں گے عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا

مظہرالحق نے ہوم رول کو قبول کیا لیکن برطانیہ کا سایہ قبول نہیں کیا۔ ان کے اس نظریے سے سوفی صد متفق لوگوں میں بال گنگا دھر تلک اور مسز اینی بسنت کا نام لیا جاسکتا ہے۔ اسی نظریے کی بنیاد پر مختلف علاقوں میں ہوم رول کے دفتر بنائے گئے۔ بہار میں 16 دسمبر 1916 کو بہار ہوم لیگ کی شروعات ہوئی اور مظہرالحق اس کے پہلے صدر بنائے گئے۔

اس وقت تک مولانا مظہرالحق کا شمار ہم انگریز دوست کی حیثیت سے کرتے ہیں۔ اس کے چند سال بعد ہی ان کے نظریات میں تبدیلی ہوئی ہے۔ جلیانوالا باغ سانحہ سے انھیں کافی دکھ ہوا، مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال جیسے لوگوں کی وجہ سے ان کی سوچ بدلی۔ طرابلس اور بلقان کی جنگ کے بعد ترکی خلافت کے زوال نے مظہرالحق کو بھی مولانا ابوالکلام آزاد اور گاندھی جی کی طرح انگریز مخالف کردیا۔

1920 میں صداقت آشرم اور 1921 میں بہار ودیاپیٹھ کی شروعات مولانا ہی کی کوششوں کا ثمرہ ہے اس کے بعد مولانا کی زندگی کا رخ ہی بدل گیا۔ اخبار The Independent لکھتا ہے:

Mazharul Haque returned from Calcutta after the speical congress, gave up his huge practice, changed his method of dress, grew a beard and retired in to TAPOVAN on Gangas, Called the Sadaqat Ashram. Since then he became a FAQEER.

اس طرح انھوں نے مغربی طرز زندگی اور بڑے عہدے سے کنارہ کشی اختیار کی اور بالکل فقیر بن گئے۔ اب انھیں اپنی سوچ کے مطابق کام کرنے کا زیادہ موقع ملا۔

اس طرح مولانا تن من دھن سے ملک وقوم کی خدمت میں لگ گئے۔ مزاج میں فقیری جو آئی تو ہر طرح کی رکاوٹیں ختم ہوگئیں۔

اب مولانا کے سامنے صرف تین کام رہ گئے:

- ہندوستانیوں میں تعلیم کا فروغ
- ہندوستانیوں میں بھائی چارے کو بڑھاوا دینا
- برطانوی سامراج کی مخالفت، اسی ضمن میں انگریزی عہدے اور انگریزی سامان کی مخالفت بھی شامل ہے۔

ہندوستانی قوم، ہندوستانی زبان اور ہندوستانی اشیا کی قدر و قیمت کا اندازہ صداقت آشرم سے ہوسکتا ہے۔ زمین خیر دمیاں کی اور کالج طلبا کی مدد سے مولانا نے جھونپڑی بنائی۔ وہ خود بڑے انگریزی داں تھے اس مکان کا کوئی انگریزی نام دے سکتے تھے۔ خود مسلمان تھے اور عربی فارسی کے ماہر بھی تھے۔ اس لیے عربی فارسی نام بھی دے سکتے تھے یا پھر خالص سنسکرت ہندی قسم کا نام بھی دے سکتے تھے لیکن ان کو ہندوستان کی مختلف برادری سے لے کر ہندوستان کی مختلف زبان سے پیار ہے اس لیے اس کا نام عربی فارسی اور سنسکرت کی بنیاد پر صداقت آشرم رکھا۔

مسلم لیگ میں قیام پاکستان کی مانگ زور پکڑنے لگی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح مولانا مظہرالحق نے بھی اس مطالبے کی مخالت کی۔ مولانا آزاد کانگریس میں تھے۔ مظہرالحق نے مسلم لیگ میں رہتے ہوئے واضح طور پر کہا۔

"315 million with one ideal, one aim, where 70 million detatch themselves"

ساڑھے اکتیس کروڑ ایک نظریہ کے حامی ہیں۔
اس میں سات کروڑ لوگ خود کو الگ کیوں کریں۔

کاش اس نظریے پر عمل درآمد ہوتا تو ہندوستان کو بٹوارہ، فرقہ وارانہ فساد، دہشت پسندی، علاحدگی پسندی جیسے کرب سے نہیں گزرنا پڑتا۔

صحافت میں مولانا کا اہم نام ہے۔ انھوں نے The Mother Land نام کا اخبار نکالا۔ اس زمانے کا مشہور اخبار، The Searchlight تو کاروبار اور منافع کے اصول پر کام کرتا تھا لیکن مظہرالحق کا اخبار آزادی کے متوالوں کی آواز بن گیا۔ اس کے لہجے میں کہیں بھی تندی یا تلخی نہیں تھی۔ پروقار زبان میں اپنی بات کہہ دینا اس اخبار کا شیوہ رہا۔ افریقی نسلی امتیاز کے خلاف یہ اخبار ہمیشہ لکھتا رہا۔ ہندو مسلم اتحاد کی ہمیشہ تدبیر سجھتا رہا، ہندوستانیوں میں تعلیم کے فروغ کی مسلسل کوشش کرتا رہا، انگریزوں کی مخالفت کرتا رہا اسی اخبار کی وجہ سے Non Co-operation Movement زور پکڑنے لگا۔

دیگر مذہب میں شادی کو مولانا نے فروغ دینا چاہا۔ ان باتوں کی کافی مخالفت کی گئی لیکن مولانا نے اپنے نظریے میں تبدیلی نہیں کی۔ یہ اور بات ہے کہ مولانا کی اس بات پر ہندو یا مسلم یا کسی بھی طبقے نے دھیان نہیں دیا۔

مولانا کی پہلی شادی خوشیہ بیگم سے ہوئی۔ 1902 میں ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ بچی کی ولادت کے دن ہی ماں کا انتقال ہوگیا۔ یہ لڑکی کم عمری ہی میں فوت کرگئی۔

پہلی بیوی کے انتقال کے بعد دوسری شادی کشور جہاں بیگم سے ہوئی۔ اس بیوی سے ایک بیٹا حسن مظہر کی پیدائش 1908 میں ہوئی۔ سترہ سال کی عمر یعنی 1925 میں یہ لڑکا داہاندی کے سیلاب میں ڈوب کر مرگیا۔ کشور جہاں بیگم ہی سے ایک بچی ثریا جبین پیدا ہوئی تھی تقریباً تین سال کی عمر میں وہ بچی اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔ کشور جہاں نے 7 ستمبر 1914 کو ایک بیٹا حسین مظہر کو جنم دیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد کشور جہاں بھی اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔

دوسری بیوی کے انتقال کے بعد مولانا نے 1917 میں تیسری شادی منیرہ طیب جی سے کی جو مشہور کانگریسی رہنما اور مہاراشٹر کے عظیم صنعت کار بدرالدین طیب جی کی بھتیجی تھیں۔ مولانا کے انتقال کے 40-35 سال بعد تک وہ زندہ رہیں۔ منیرہ سے کسی بچے کی پیدائش نہیں ہوئی۔

مظہرالحق کی اولاد میں صرف حسین مظہر ہی زندہ رہے وہ اردو کے ایک اچھے شاعر تھے اور مظہر تخلص کرتے تھے۔ ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو

جو سچ کہو تو عجب شے ہیں حضرت واعظ
زمین پہ جیتے ہیں مرتے ہیں آسماں کے لیے

■

Prof.(Dr.)Md.Tauquir Alam
Pro-Vice Chanceller
Maulana Mazharul Haque Arabic & Persian University
34, Ali Imam Path, Harding Road,
Near Haj Bhawan, Patna-800001
Mobile No.09934688879

امرتسر میں اردو صحافت
19ویں صدی میں

اوم پرکاش سونی

مستند فرانسیسی مستشرق و محقق گارساں دتاسی نے اپنے خطبات میں 'باغ نور' کو امرتسر کا پہلا اردو کا اخبار بتایا۔ لیکن اس کی تفصیل نہیں بتائی۔ گارساں دتاسی کے علاوہ دوسرے مؤرخین بھی 'باغ نور' کی صراحت پر روشنی نہیں ڈال سکے— حقائق عرفان نامی اردو اخبار 1867 اور 1869 میں 'شمس الاخبار' وجود میں آئے۔

مغل شہنشاہ اکبر اعظم کے دو درباری ابوالفضل اور فیضی آگرہ کے شیخ مبارک کے صاحب زادے تھے۔ اسی جلیل القدر خاندان کے نور چشم رجب علی تھے جنھوں نے دہلی کے انگریز ریزیڈنٹ کے ہاں ملازمت اختیار کرلی۔ اور جاہ و حشمت اعلیٰ مناصب حاصل کرنے کی حرص میں ترک اسلام کرکے عیسائیت اختیار کرلی۔ انھوں نے عیسائی مذہب کو صرف اپنایا ہی نہیں بلکہ گہرا فکر و مطالعہ کیا اور پادری بن گئے— امرتسر کے میتھوڈسٹ چرچ کا انصرام و انتظام سنبھالنے کے بعد تبلیغی کام شروع کیے۔ کئی کتابیں لکھیں اور اخبار 'شمس الاخبار' سے وابستہ ہوگئے۔

1973 میں انھوں نے دھرم سبھا امرتسر کے اعزازی سکریٹری لالہ مکند رائے کے ہفتہ وار اخبار 'ہندو پرکاش' امرتسر کی عنان ادارت سنبھال لی۔ سولہ صفحات کے ہندو پرکاش کا سالانہ چندہ سات روپے آٹھ آنے تھا۔ اخبار ہندو دھرم سبھا کا ترجمان و نقیب تھا۔ اخبار میں ایک کالم گورمکھی رسم الخط کے لیے مختص تھا۔ یہ خالص مذہبی اخبار تھا۔

پادری رجب علی نے نظریاتی اختلافات کی بنا پر ہندو پرکاش سے الگ ہوکر اپنا اخبار 1874 میں کوکب عیسوی امرتسر جاری کیا جس میں عیسائیت کے بارے میں مضامین اور خبریں شائع ہوتی تھیں۔ اس کے بعد 1878 میں انھوں نے سفیر ہند اخبار شروع کیا جس کا پہلا شمارہ یکم جنوری 1875 کو شائع ہوا تھا۔ سالانہ چندہ تیرہ روپے تھا۔ اخبار سولہ صفحات پر چھپتا تھا۔ پادری رجب علی اسلام کے خلاف تھے۔ انھوں نے اپنے اخبار میں اسلامیات کو اپنا ہدف بنایا اور دعویٰ کیا کہ اسلام میں 172 فرقے ہیں جبکہ عیسائی مذہب میں کوئی فرقہ نہیں۔ ان کی کتاب آئینہ اسلام 1870 میں امریکن مشن پریس لکھنؤ میں چھپی تھی۔ کیونکہ پادری صاحب کا تعلق امریکن میتھوڈسٹ مشن یوپی سے تھا۔

یکم جنوری 1878 میں بشن دت رام سکریٹری مجلس اخلاقیہ نے ہفت روزہ 'مجلس اخلاقیہ' جاری کیا جس کا سالانہ چندہ دو روپے تیرہ آنے تھا۔ اس کے ایڈیٹر مولوی ولایت شاہ تھے۔ اخبار ہذا مطبع 'چشمۂ نور' میں چھپتا تھا جیسا کہ اختر شہنشاہی اور محمد دین فوق کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پادری رجب علی نے 1874 میں اخبار وکیل ہند بھی جاری کیا تھا اور طب یونانی کے فروغ کے لیے 'مراۃ الطبابت' جاری کیا۔ جنوری 1887 میں انھوں نے ماہنامہ 'پنجاب ریویو' کا اجرا کیا۔ اس کا سالانہ چندہ بارہ روپے تھا۔ کتابت و طباعت بے حد نفیس اور مضامین معیاری ہوتے تھے۔ ماہ فروری 1887 کے پنجاب ریویو میں آنریری مجسٹریٹ کے بارے میں تفصیلی مضمون ہے۔ فاضل ایڈیٹر نے لکھا ہے کہ جب سے یہ عہدے ہرکس و ناکس آنریری مجسٹریٹوں کو ملنے لگے ہیں تب سے ان عہدوں کا تعلق پبلک سے بہت زیادہ ہوگیا ہے۔ اس لیے قرین مصلحت ہے کہ ان عہدوں اور ان کے اعمال منصبی پر مفصل بحث کی جائے اور جو پہلے ہوئے مقدموں سے جو رزلٹ نکلے اس سے گورنمنٹ اور پبلک دونوں کو اطلاع دی جائے......الخ۔

پنجاب ریویو امرتسر ماہ مارچ 1887 کا ایک اقتباس ریاست چمبہ (ہماچل پردیش) کے متعلق ملاحظہ ہو: یہ ایک چھوٹی سی ریاست ہے جس کی آبادی کوئی سوا لاکھ ہے۔ اس پہاڑی ریاست کو انگریز ریذیڈنٹ کے متعلق کہہ دینے سے بھی راجہ صاحب راجہ شام سنگھ کی نابالغی کی وجہ ہے— ہم اس ریاست کا حساب کتاب بھی دو سالہ پیش کریں گے۔ پہلے پہل متفرق اور غیر ضروری اخراجات کم کیے گئے ہیں۔ ریاست تقریباً دو اور تین لاکھ روپے کے بابت مقروض تھی۔ سبکدوش ہوئی— الخ۔ ماہ مارچ 1857 کے پنجاب ریویو میں ایک ضمیمہ شامل ہے جو ریاست کشمیر اور انگریزی حکومت کے تعلقات پر مبنی ہے— ڈیوک آف ولنگٹن اور لارڈ لیک کی کامیابیاں مندویں دیں— لارڈ ہارڈنگ فاتح پنجاب کو روپیہ کی ضرورت ہے اور کرنل سرہنری لارنس نے مہاراجہ گلاب سنگھ سے پچھتر لاکھ روپیہ لے کر جموں و کشمیر کو انڈیپنڈنٹ کردیا۔

اب ہم اس عہد نامے کو پیش کرنا مناسب سمجھتے ہیں جو جموں کشمیر کی بابت مہاراجہ گلاب سنگھ اور کرنل سرہنری لارنس صاحب کے سی بی ریذیڈنٹ پنجاب کے مابین لارڈ ہارڈنگ صاحب جی سی بی اس زمانے کے گورنر جنرل ہند کے عہد میں 16 مارچ 1846 کو ہوا— پہلی شرط— سرکار انگریزی دوام کے لیے بلا مداخلت بخیر— مہاراجہ گلاب سنگھ اور ان کے ذکور و ورثا کو تمام ملک کوہستان مع متعلقات واقع جانب مشرقی دریائے سندھ ایک جانب جنوب دریائے راوی مع علاقہ چمبہ باستثناء علاقہ لاہول جو جزو اس کا جو دربار لاہور سے سرکار انگریزی کو حسب منشا دفعہ چہارم عہد نامۂ پنجاب مرقومہ 9 مارچ 1846 سپرد ہوا ہے دیتی ہے— دوسری ایضاً— علاقہ کی مشرقی سرحد جو مذکورہ بالا شرط کے مطابق مہاراجہ گلاب سنگھ کو دیا گیا۔ سرکار انگلشیہ اور مہاراجہ گلاب سنگھ نے ماموروہ کے کمشنران قرار دیں گے— اور اس کی تفصیل پیائش کے بعد ایک عہد نامہ میں تحریر ہوگی—

تیسری شرط— اس علاقہ کے استعمال کے عوض میں جو ان کو اور ان کے وارثان کو مذکورہ بالا شرط کے منشا کے بموجب دیا گیا ہے— مہاراجہ گلاب سنگھ سرکار انگریزی کو مبلغ پچاس لاکھ روپے اس عہد نامہ کی تصدیق کے وقت ادا کریں گے اور باقی پچیس لاکھ روپیہ یکم اکتوبر سنہ حال یا اس سے پہلے دیں گے—

چوتھی ایضاً— مہاراجہ گلاب سنگھ اور دربار لاہور یا کسی اور قرب و جوار کی ریاست کے کوئی تنازعہ پیدا ہوگا۔ تو مہاراجہ اس کو سرکار انگریزی کی ثالثی کے سپرد کریں گے— اور سرکار انگریزی جو فیصلہ دے گی اس کے مطابق تعمیل کریں گے۔

چھٹی شرط— مہاراجہ گلاب سنگھ اپنی طرف سے اور

اپنے وارثوں کی جانب سے اقرار کرتے ہیں کہ جب فوج انگریزی کسی علاقہ کوہی یا علاقہ متصل علاقہ مہاراجہ میں جنگ آور ہوگی تو وہ مع اپنی تمام فوج کے شامل فوج انگریزی ہوگی۔

ساتویں شرط— مہاراجہ گلاب سنگھ وعدہ کرتے ہیں کہ وہ کسی رعایا انگریزی یا کسی اور رعایا یورپ اور امریکہ کو انگریزی گورنمنٹ استرضا کے بغیر ملازم نہ رکھیں گے—

آٹھویں شرط— مہاراجہ گلاب سنگھ وعدہ کرتے ہیں کہ وہ متعلقہ علاقہ کے باب میں عہدنامہ جداگانہ کی پانچویں چھٹی اور ساتویں دفعات کے منشا ہے جو انگریزی سرکار اور دربار لاہور کے مابین گیارہ مارچ 1846 کو ہوا ہے لحاظ رکھیں گے۔

نویں شرط— انگریزی سرکار مہاراجہ گلاب سنگھ کی مدد سے ان کے ملک کی حفاظت کے لیے دشمن غیر سے مقابلہ کرے گی۔

دسویں شرط— مہاراجہ گلاب سنگھ انگریزی سرکار کی حکومت کو قبول کرتے ہیں اور انگریزی سرکار کی حکومت کا اقرار کرکے ایک گھوڑا اور بارہ شاخ پشمی جز (چھ نر اور چھ مادہ) اور تین جوڑے شال پشمینہ نذر کے طور پر دیا کریں گے۔

1889 میں ہفتہ وار پنجاب امرتسر کا اجرا ہوا— مولوی غلام محمد اختر کلانوری اس کے مالک و ایڈیٹر تھے جنھوں نے ہال بازار امرتسر میں اختر ہند پریس قائم کیا۔ ہفتہ وار پنجاب "12x9" تقطیع پر چھپتا تھا۔ 12 صفحات کے اخبار کا زر سالانہ بارہ روپے تھا۔ کاغذ عمدہ سفید نفیس کتابت و طباعت پر مشتمل ہوتا تھا۔ 15 اپریل 1891 کے پنجاب میں چھپی خبر ہے۔ خالصہ کالج امرتسر میں قائم کیا جائے۔ اس کے بارے میں فیصلہ لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کی رائے پر چھوڑا گیا ہے۔ مہاراجہ صاحب کپور تھلہ نے زور سے رائے دی ہے کہ خالصہ کالج امرتسر میں بنے مہاراجہ پٹیالہ نے بھی اس رائے سے اتفاق کیا ہے کہ سکھ قوم امرتسر میں کالج قائم ہونا پسند کرتی ہے۔"

12 جون 1891 کے اخبار 'پنجاب' میں مسٹر وار برٹن کے مقدمہ کی خبر ہے۔

24 جون کے اخبار میں پادری رجب علی ایڈیٹر پنجاب ریویو کی اردو زبان و ادب کی خدمت کی تعریف کی گئی ہے۔ اسی شمارے کے صفحہ 2 پر خبر ہے۔ چونکہ شرومنی گردوارہ پربندھک کمیٹی وجود میں نہیں آئی تھی، اس لیے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں سری ہرمندر صاحب کی حرمت کا کام سردار دیا سنگھ مجیٹھیہ کے حوالے تھا اور مہاراجہ دلیپ سنگھ کے عہد میں سردار بوڑ سنگھ اس کے مہتمم قرار پائے گئے تھے— بعد ازاں ان کے بھائی پردمن سنگھ گیانی کی نگرانی میں مرمت کا کام ہوتا تھا...... بھائی پردمن سنگھ وغیرہ اعزازی طور پر کام کرتے تھے— بھائی پردمن سنگھ کے وقت خاں بہادر حاجی خان محمد صاحب اور گیان چند صاحب نیز رائے قول سنگھ پر مشتمل سہ ممبری کمیٹی قائم کی گئی جس نے بھائی پورن سنگھ کے گزارہ کے لیے ایک روپیہ یومیہ مقرر کردیا— ان کی وفات کے بعد یہ تنخواہ تقسیم ہوگئی— جس میں سے ساٹھ روپے سالانہ سری دربار صاحب کے خزانہ میں جمع کیے گئے— اور باقی تین سو روپے سالانہ میں سے ایک سو روپیہ سالانہ بھائی گوربخش سنگھ، اسر بھائی پردمن سنگھ اور ایک سو روپیہ بھائی لہنا سنگھ برادر بھائی پردمن سنگھ اور ایک سو روپیہ سالانہ بھائی جواہر سنگھ برادر بھائی پردمن سنگھ کو ملا— لیکن بھائی پردمن سنگھ کی وفات کے بعد مرمت کا کام جرنیل گلاب سنگھ صاحب بھا گووالیہ کو دیا گیا— جنھوں نے سات سال تک بلا تنخواہ کام کیا—

اپریل 1895 میں امرتسر کے علم دوست وکیل شیخ غلام محمد نے ہفتہ وار وکیل جاری کیا— جس کا سالانہ چندہ چھ روپے اور ششماہی چار روپے تھا۔ بارہ صفحات پر مشتمل اخبار وکیل روز بازار پریس ہال بازار میں چھپتا تھا۔ میر جالب دہلوی، فیروز الدین طغرائی، مولوی عبداللہ منہاس محمد شجاع، مولانا انشاء اللہ خاں اور دوسرے ممتاز علماء اخبار کے عملہ ادارت میں شامل تھے۔ اخبار کی پالیسی قوم کی خدمت کرنا تھی اور وہ کانگریس کی تحریک کا ہمنوا بھی تھا۔

25 مئی 1896 کے وکیل امرتسر کی خبر کا اقتباس ہے:

"ہمیں اس خبر سے نہایت خوشی ہوئی کہ ملک کے سچے خیر خواہ اور ہمارے معزز دوست لالہ کنہیا لال پلیڈر چیف کورٹ نے اپنے لڑکوں کو دیسی ساخت کے کپڑے کی دکان کھلوانے کا ارادہ کیا ہے۔ ہمارے دوست لالہ کنہیا لال اس سے ہندوستانیوں کے لیے خود نظیر قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ تعلیم یافتہ ہندوستانی اپنے دیس کا بنا ہوا کپڑا پہنیں..... الخ

ہفتہ وار وکیل امرتسر بعدازاں سہ روزہ ہوگیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد بھی 1912 کے بعد اخبار ہذا سے وابستہ رہ چکے ہیں—

3 اگست 1895 کے وکیل امرتسر میں نواب داغ کی رحلت کی غلط خبر کی تلافی شائع ہوئی۔

صاحب عالم شہزادہ مرزا خورشید عالم برادر عالیجناب حضرت استاد داغ کے نام سے ایک تار ہمارے پاس پہنچا۔ واللہ اعلم یہ کس نااہل کی بدمذاقی تھی اور اس کو ہمارے اس طرح رنج دینے اور صدمہ پہنچانے سے کیا مقصود تھا۔ استاد کی نسبت نصیب اعدا ایسی خبر بد اڑائی کہ ہمارے ہوش وحواس عالم بالا کی خبر لانے لگے۔

طبیعت بالکل بے قابو ہوگئی۔ اس عالم بدحواسی میں خدا جانے کیا کیا ہمارے قلم سے نکل گیا جو گذشتہ اشاعت میں ناظرین نے ملاحظہ کیا ہوگا۔ ہم نے لاکھ لاکھ چاہا کہ صبر دل پر جبر کریں مگر کسی صورت ممکن نہ ہوا۔ ایڈیسن کے اس قول کی تصدیق ہوگئی کہ جس سے جس قدر زیادہ تعلق خاطر ہوتا ہے اتنا ہی دل بدگماں کو اس اخبار رنج افزا کا جلدی یقین آجاتا ہے افسوس مگر تعجب تو یہ ہے کہ ممبئی سے دہلی اور عظیم آباد وغیرہ سے بھی ہمارے پاس ہمدردی اور نعوذ باللہ تعزیت کے خطوط آئے۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس ناشنوا روح فرسا افواہ اڑ جانے کی اصلیت کیا تھی۔ کل صبح خاص استاد کا تار بدیں مضمون وصول ہوا کہ میں بالکل تندرست ہوں اور اچھی طرح ہوں۔ ہم وہ خوشی پورے طور پر اظہار کرنے کے لیے الفاظ نہیں پاتے جو تار پڑھ کر ہم کو حاصل ہوئی۔ پہلی تار برقی نے خرمن عقل وہوش پر بجلی گرائی تھی اور یہ جان رفتہ پھر بدن میں آئی اور اظہار کی ضرورت ہی کیا ہے۔

ناظرین خود اچھی طرح اندازہ کرسکتے ہیں کہ جس نے افواہ سن کر اس درجہ صدمہ اٹھایا ہو اس کو گویا دوبارہ زندہ ہوجانے پر کس قدر فرحت ہوگی۔ غنچۂ خاطر جو پژمردہ افسردہ ہوگیا تھا، ازسرنو کھل گیا مگر دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ یہ خدشہ بھی آج کے مہری دستخطی خط نے دور کردیا۔ ہم کو تو گویا ازسرنو استاد ملے۔

بدیں مژدہ گر جان فشانم رواست
کہ ایں مژدۂ آسائش جان ماست

ہندوستانیوں کے اعتقاد میں کسی کی نسبت خبر بد مشہور ہوجانا ترقی عمر کا باعث ہے اور بمصداق اس کے ہم بھی عدو شود سبب خیر اگر خدا خواہد کہے بغیر نہیں رہ سکتے۔

ایڈیٹوریل کی تردید شاید کسی نے اس خوشی سے نہ کی ہوگی۔ جس انبساط سے ہم اپنی گذشتہ غلطی کا یقین دلانا چاہتے ہیں خبر حساد بدنہاد کو داغ کی طرف سے جلتا ہی رہے۔ جو کچھ ملال ہم لوگوں کو ہوا مصفی ما مصفی خدا اس کی تلافی کرے اور جلد ان کی نسبت ترقی جاہ ومنصب کی خبر سنائے عمر میں برکت دے۔

آمین۔ ثم آمین!

Om Parkash Soni (Journalist)
H.No-151-B-s63, Vijay Nagar near Millan Palace
Batala Road, Distt.: Amritsar (Punjab)

ندیم غوری

قانونیات کی ارتقائی منزلیں

1) Administration of Justice – عدل گستری:

عدلیہ کا خصوصی اختیار: جس میں مقدمات کی سماعت اور کارروائی بھی شامل ہوتی ہے۔ ان مقدمات میں دیوانی (Civil) اور فوجداری (Criminal) ہر دو قسم کے مقدمات ہوسکتے ہیں۔ قطع نظر اس کے ان مقدمات یا کارروائی کے فریقین کون ہیں یا یہ کہ اس کا موضوع بحث کیا ہے۔ ان اختیارات میں عدالت کا دائرۂ سماعت کا تعین، توسیع، تبدیلی، ترمیم، تقلیل کے علاوہ علاقائی اور رقمی و مالیتی کمی بیشی کے اختیارات بھی شامل ہوتے ہیں۔

(آئین ہند جدول VII فہرست II مندرجہ 3) (کنسائز لاڈکشنری ص 33)

2) a Posteriori – تجربی یا استقرائی استدلال

استدلال بعد الوقوع یا معلول سے علت کی جانب استدلال۔ یعنی کسی چیز یا واقعہ کے تجزیہ کی ابتدا معلوم حقائق کی مدد سے کرنا اور پھر امکانی وجوہات کے بارے میں غور کرنا، مثلاً دیکھو گلیاں گیلی ہیں ضرور بارش ہوتی رہی ہوگی۔ (آکسفورڈ انگلش ڈکشنری، ص 60)

3) a Priori – استخراجی استدلال:

علت سے معلول کی جانب جانا۔ جو ایک قیاسی مفروضہ ہے جس میں معلوم حقائق کی مدد سے قیاس آرائی یا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ اس میں تجربہ ضروری نہیں کیونکہ یہ غیر محققانہ اور قیاسی ہوتا ہے۔ مثلاً انہوں نے تمام دن کچھ نہ کھایا اس لیے وہ بھوکے ہوں گے۔ (ایضاً، ص 64)

4) Civil Law – دیوانی قانون:

قانون یا قوانین جو نجی دیوانی حقوق سے متعلق ہوں، جن کی خلاف ورزی پر تلافی کے لیے قانونی چارہ جوئی کی جاسکتی ہے۔ (کنسائز لاڈکشنری، ص 20)

5) Emprical – تجربی:

علم جو تجربیت یا تجربہ پر مبنی ہو۔ نہ کہ تصورات اور نظریات پر۔

(فرہنگ اصطلاحات فلسفہ نفسیات ترقی اردو بیورو، ص 111)

6) Jus قانون (غیر موضوعہ)

ایک لاطینی اصطلاح۔ جو قانون کے علاوہ اور بھی معنی رکھتی ہے۔ مثلاً حق و انصاف، اقتدار و اختیار، نظام قانون، مجموعہ قوانین وغیرہ۔ (کنسائز لاڈکشنری، ص 707)

7) Judicial Activism – عدالتی سرگرمی:

عدالت کا اختراعی، حرکیاتی اور قانون ساز رول۔ جس میں ججوں کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ عوامی پالیسی اور مفاد عامہ کے مد نظر سابقہ نظائر کو نظر انداز کر کے ایک ایسا دور اندیش رویہ اختیار کریں جو سماج کے مسائل سے نمٹنے میں مُمد و معاون ثابت ہو۔ (کنسائز لا ڈکشنری، ص 699)

8) Law – قانون:

کسی باضابطہ سیاسی تنظیم (حکومت وقت) کا منظم حاکمانہ مواد۔ جس میں ہنگامی قوانین (ordinance)، احکام (orders)، دستور العمل (Regulation)، اعلانیہ (Notification)، ریت رواج (Usage and Customs) شامل ہوں۔ (کنسائز لاڈکشنری، ص 732)

9) Metaphysics – مابعد الطبیعیات:

فلسفے کی ایک شاخ۔ جو مادی یا غیر مادی چیزوں کے وجود اور بنیادی اصولوں سے تعلق رکھتی ہے جن میں مجرد تصورات جیسے وجود، علوم، مشابہت، زمان (ومکان) بھی شامل ہوتے ہیں۔ مجرد تصورات سے مراد وہ حقائق ہیں جنھیں محسوس تو کیا جاسکتا ہے لیکن ان کا کوئی مادی وجود نہیں ہوتا۔ مثلاً اوپر کی مثالوں میں علوم، مشابہت، زمان (وقت) جبکہ الٰہیات واخلاق میں نیکی، بھلائی، اصلاح وغیرہ۔

10) Natural Law – فطری قانون:

قدرتی قانون جو بالضرور انسانی فطرت سے مطابقت رکھتا ہو۔ مفکرین کے مطابق اس کی کامل پابندی کے بنا سماج میں امن وامان کا قیام وتحفظ قطعی ناممکن ہے اس کا علم وعرفان محض استدلال کی روشنی میں اور انسانی فطرت کی ترتیب سے ضروری مطابقت کے ذریعے ہی حاصل ہوسکتا ہے۔ اس فلسفے کی عہد قدیم سے ہی سیاست قانون، مذہب اور اخلاقیات میں بڑی اہمیت رہی ہے۔

(کنسائز لاڈکشنری، ص 843)

11) Norm – معیار:

اک مثال یا نمونہ۔ جو کسی گروہ پر عائد ہوتا ہو۔ تا کہ ایک معقول و مقبول کردار کے لیے ان کی رہنمائی اور ان پر قابو رکھا جاسکے۔ (کنسائز لاڈکشنری۔ ص 867)

12) Obligation – وجوب:

ذمے داری جس میں کوئی قانونی لزوم عائد ہوتا ہو۔ جس کے تحت دو یا زائد فریقین باہم کسی شرط یا شرائط کے قانوناً پابند ہوتے ہیں۔ (لاکسی کان۔ ص 1232)

13) Phenomenon –

مظہر (جمع: مظاہر – Phenomena)

کسی سماج، معاشرہ یا ماحول میں وقوع پذیر کوئی

وقوعہ یا واقعہ۔ جو مشاہدہ یا ادراک میں تو آئے لیکن جس کا سبب دریافت طلب ہو۔ جیسے عالمگیریت (Globalisation) اکیسویں صدی کا ایک مظہر ہے۔ (آکسفورڈ انگریزی ڈکشنری۔ص 1132 / آکسفورڈ اردو ڈکشنری۔ص 1231)

14) Positive Law – قانون موضوعہ

ایک وضع کردہ نظام قانون۔ جسے کسی مخصوص سماج کی سیاسی تنظیم یا مقتدر حکومت مدون کرکے نافذ کرے۔ (موضوعہ بمعنی وضع کردہ) (ایضاً)

15) Positivism – ثبوتیت:

اگست کومت کا پیش کردہ ایک کلیہ۔ جس کے مطابق مظاہر کے گہرے مشاہدے اور تجربی (Emprical) طریقے کی مدد سے اخذ شدہ کامل علم ہی ثبوتی کہلایا جاسکتا ہے۔ یہ محض قیاس آرائی یا استدلال سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ (کنسائز لاڈکشنری۔ص 971)

16) Precedent/s – نظیر (جمع: نظائر)

کوئی سابقہ مستند عدالتی فیصلہ۔ جو آئندہ مقدمات یا مسئلہ قانون (Question of Law) میں شامل مشابہ حقائق و مسائل کی بنیاد فراہم کرتا ہو۔ جس کی عدالتی کارروائی کے دوران بطور ضابطہ مثال دی جاسکتی ہے۔ یہی مثال نظیر کہلاتی ہے۔ (کنسائز لاڈکشنری۔ص 980)

17) Synthesis – ترکیب

متفرق اجزا کا متوازن امتزاج۔ مثلاً مختلف نظریے، تصورات، عقائد، اسلوب وغیرہ کی آمیزش کرکے ترتیب دینا۔ یا متعدد نظریوں کو مرتب کرکے دیگر نظام فلسفہ ترتیب دینا۔ (آکسفورڈ انگریزی ڈکشنری، ص 1556)

18) Value – قدر:

اصول و ضوابط کا تعین۔ کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط، کیا اچھا ہے اور کیا برا۔ اور یہ کہ زندگی میں کون سی چیز اہم ترین ہوتی ہے۔ یہ اصول و ضوابط، مذہب اخلاقیات سماج وغیرہ میں نہایت اہمیت رکھتے ہیں۔

(آکسفورڈ انگریزی ڈکشنری، ص 1693)

آپ بخوبی واقف ہیں کہ علم قانونیات (Jurisprudence) کی یکساں اور جامع تعریف (Definition) بیان کرنا قریباً ناممکن ہے۔ قانون کے ساتھ ساتھ قانونیات کے تصور کو ہر دور اور ہر مملکت میں مختلف معنی پہنائے جاتے رہے ہیں۔ اس کی تاریخ اپنے ارتقاء کی ایک طویل داستان رکھتی ہے جو قدیم کلاسیکی رومن اور یونانی دور سے شروع ہوکر اکیسویں صدی کے جدید علم قانونیات تک پہنچتی ہے۔

مختلف ذرائع سے یہ تو پتہ چلتا ہے کہ عہد قدیم یعنی پانچویں اور چوتھی قبل مسیح میں اس علم کی ابتدا اگرچیکہ روم اور یونان سے ہوئی تھی، مگر وہ قانون اور قانونیات میں واضح فرق نہیں کرپاتے تھے۔ یونان کے اولین مفکرین جن میں ہیراکلیٹس (530 تا 470 قبل مسیح) (Heraclitus) نمایاں ہے، کے لیے قانونیات، قانون الٰہیات (Theology) کی ہی ایک شاخ تھی اور فطری قانون (Natural Law) اس کی بنیاد تو تھی، لیکن اس بارے میں ان کا مواد اتنا منتشر تھا کہ وہ قانونیات یا قانون کی کوئی منظم سائنس ترتیب نہیں دے پائے۔ اس کے برخلاف جادو ٹونا اور کرشمہ سازی فطری قانون میں شامل کردی گئی تھی لیکن ارسطو (384 تا 322 قبل مسیح) (Aristotle) نے اس توہم پرستی سے چھٹکارا دلایا اور واضح کیا کہ ہر وقوعہ کسی عمل کا ردعمل ہوتا ہے جس کی جانچ استدلال سے لی جانی چاہیے۔ ایتھنز (یونان) کے مفکر زونو (350 تا 260 ق.م) (Zono) نے قانون رواقی (Stoic Law) کی بنا ڈالی اور اسے قانون استدلال (Law of Reason) کے مشابہ بنایا۔

ابتدا میں رومیوں کی کیفیت بھی یونانیوں سے کچھ جدا نہ تھی۔ ان کے پاس بھی قانونیات کی تفصیلات مبہم سی تھیں، لیکن بعد میں رومی مفکرین گیئس (Gaius)، الپیان (Ulpian)، پاؤلس (Paulus)، ہرموجنیانس (Hermogenianus) وغیرہ نے رومی قانون کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ (1) قانون دیوانی (Jus Civile) (2) بین الاقوامی قوانین (Jus Gentium) اور (3) قانون قدرت (Jus Naturale)

اول الذکر دونوں قوانین کو انھوں نے قانون قدرت کے تابع سمجھا۔ مزید یہ کہ الپیان نے قانونیات کو خالق و مخلوق کا مشاہدہ اور حق و ناحق کا علم و عرفان قرار دیا تھا۔ تو گویا رومیوں نے بھی یونانیوں کی طرح قانونیات کو الٰہیات میں شامل کردیا تھا۔

اسی دوران ادھر ہندوستان میں قانونیات کا ماخذ 'دھرما' کو گردانا جاسکتا ہے جس میں مذہب، فلسفہ اور اخلاق شامل تھے۔ جیمینی (Jaimini) کے مطابق 'دھرما' کی علامت حکم دینا ہے جو فرد کی مادی اور روحانی نجات کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔ 'دھرما' کے ماخذ وید مقدس ہیں جو علم الانسان کے اہم ذرائع بھی ہیں۔ ویدوں کو 'سرُوتی' بھی کہا جاتا ہے۔ یعنی رشیوں نے جو الہامی کتھن سنا، اسے حفظ کرکے ضبط تحریر میں لایا تھا۔ تقریباً ق.م میں منو نے 'منوسمرتی' مرتب کی تھی جو ہندو قانون کا حکم رکھتی ہے۔ اس کے مطابق ''دھرم کی بنیاد کردار ہے اور عدم تشدد 'دھرما' کا جوہر ہے۔''

چونکہ اہل مغرب دسویں صدی عیسوی تک کے دور کو تاریک دور (Dark age) تصور کرتے تھے، اس لیے قانون اور قانونیات دور وسطیٰ میں بھی مذہب اور اخلاقیات کے تابع رہے۔ اس دوران یورپ میں قانون کی تفہیم و تعمیل اور سماجی نظم و ضبط کے لیے قانون کو پرجوش مذہبی حمایت حاصل تھی۔ عیسائی کلیسا کے اولین یسوعی (Jesuit) پادریوں نے ایک قانونی نظریہ وضع کیا تھا جس کے مطابق شہنشاہ دنیوی معاملات کا سربراہ ہوا کرتا تھا جبکہ پاپائے اعظم (Pope) کو روحانی اور مذہبی امور کا پیشوا مانا جاتا تھا۔ دونوں کو انصاف پروری اور خدائی قانون کو بحال رکھنے میں ہم آہنگی سے کام کرنا پڑتا تھا۔ لیکن بعد ازاں دونوں میں اقتدار کی رسہ کشی شروع ہوئی، جس میں رومی پاپائے اعظم کو برتری حاصل ہوئی۔ اس طرح کلیسائی قانون (Canon Law) کو اولیت حاصل ہوگئی جس میں تین نمایاں خصوصیات پائی جاتی تھیں، یعنی (1) دینیائی (Theological) (2) اخلاقیاتی (Ethical) اور (3) قانونی (Legal) انھیں تمام انسانی قوانین سے افضل تر مانا جاتا تھا۔ یوں کلیسائی قانون کو آفاقی قانون (Universal Law) کا درجہ حاصل ہوگیا تھا جس میں کلیسا ابدی قانون (Lex aeterna) کے محافظ کی حیثیت سے اپنی مرضی کے مطابق جب چاہے رد و بدل کرسکتا تھا۔ الٰہیات یا دینیات کی بنیاد پر ہی عہد وسطیٰ کے کیتھولک فلسفیوں اور کلیسائی عالموں نے قانون فطرت یا فطری قانون (Natural Law) کا ایک نیا مگر باضابطہ نظریہ پیش کیا تھا جس میں معروف مفکر سینٹ تھامس اکویناس (1225 تا 1274) (St. Thomas Aquinas) نے بھرپور نمائندگی کی تھی کیونکہ اس دور میں یہ نظریہ کافی منطقی اور منظم محسوس ہوتا تھا۔ اکویناس نے چار قسم کے قوانین کے درمیان فرق کیا ہے۔ (1) ابدی قانون (Lex aeterna) جو کلیسا کی نگرانی میں حکومت کا کوئی منصوبہ ہوا کرتا تھا۔ (2) قانون فطرت (Lex Naturalis) اسے ابدی قانون کا ہی ایک جز تصور کیا گیا تھا۔ (3) قانون قدسی (Lex Divinia) جو مقدس کتابوں میں الہامی بیان سمجھا جاتا تھا۔ اور (4) بشری قانون (Lex Humana) جو رعایا پرور شہنشاہ کا بنایا ہوا قانون ہوا کرتا تھا۔ لیکن کلیسا کے پادری خدائی قانون کو ہی فوقیت دیتے تھے۔ اکویناس کے لیے قانونیات، الٰہیات یا دینیات کی ہی ایک شاخ تھی۔

اسی دوران یورپ میں نشاۃ الثانیہ (Renaissance)

کے طریق عمل (چودھویں تا سولہویں صدی عیسوی) کے ذریعے الٰہیات اور قانون سے علم قانونیات کی علیحدگی کے عمل کی ابتداء ہوچکی تھی۔ اس عمل کی ابتدا فلسفیاتی مکتب (Philosophical School) کے زیر اثر ہوئی جس میں دیگر مفکرین کے علاوہ ہیوگوشیس (1583 تا 1645) (Hugo Grotius) بھی شامل تھا جسے فلسفیاتی قانونیات (Philosophical Jurisprudence) کا بانی مانا جاتا ہے۔ اس نے فطری قانون کو پوری طرح ایک عقلیت پسند (Rationalist) بنیاد پر جگہ دی تھی یعنی ایک ایسا قانون جو راستبازی کا حکم دیتا ہے اور جو یہ بتاتا ہے کہ کوئی فعل اپنی اصلی کیفیت میں عقلی فطرت سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں، کہیں اس میں اخلاقی کھوٹ کی کوئی خصلت تو نہیں پائی جاتی؟ واضح رہے کہ گروشیس کو بین الاقوامی قانون (International Law) کا بھی بانی مانا جاتا ہے۔ تھامس ہابس (1588 تا 1679) (Thomas Hobbes) نے اپنے فطری قانون کی اساس پر بالواسطہ قانون عقلیت (Law of Reason) کی بنیاد رکھی تھی جو عوام کو اپنے تمام حقوق واختیارات ایک مقتدر پیکر عظمت (Leviathan) (طاقتور حاکم یا حکومت) کو سونپنے پر آمادہ کرتا ہے، تاکہ وہ ان کے فطری حقوق، سماجی امن و امان، زندگی اور ملکیت کا دفاع و تحفظ کرے۔ دراصل ہابس کے اس نظریہ میں مطلقیت (Absolutism) اور استبداد (Deposition) شامل ہیں۔

نشاۃ ثانیہ کے دوران نمودار ہونے والے سیاسی نظریوں میں مملکت کے مطلق اقتدار کی حمایت کی گئی تھی، مگر اس میں فرد کی کوئی وقعت نہ تھی۔ ان میں تھامس ہابس کا نظریہ بھی شامل تھا۔ لیکن جان لاک (1632 تا 1704) (John Locke) نے فرد کے حقوق کی حمایت کے لیے مملکت کے مطلق اختیارات کی سخت مخالفت کی اور فطری قانون کی نئی صراحت پیش کی۔ اس طرح اس نے تین اہم حقوق کے تحفظ پر زور دیا۔ (1) حق حیات (Right to Life)، (2) حق آزادی (Liberty)، اور (3) حق ملکیت (Property) جو فرد کی خیر وعافیت کے لیے لازمی ہیں اور ان ہی کے طرز پر قانون سازی بھی ہونی چاہیے۔ اٹھارھویں صدی میں اس تصور کو اس وقت مزید تقویت ملی جب جین جیکوئس روسو (1712 تا 1778) (Jean Jecques Rousseau) نے اپنا نظریہ 'سماجی معاہدہ' (Social Contract) پیش کیا جس کے مطابق شہریوں میں باہم خوشگوار برتاؤ کا ایک ایسا معاہدہ ہو کہ جس سے ہر فرد کو فیض پہنچے اور ماحول تمام رومان پرور محسوس ہو۔ ملک کے قانون سے بھی عوامی خواہشات اور سماج کے مشترکہ مفادات کا اظہار ہونا چاہیے۔

امانوئل کانٹ (1724 تا 1804) (Immanuel Kant) نے قانونی عدل (Legal Justice) کا تصور پیش کیا اور مکتب قانون فطرت (Law of Nature School) کو اس بنا پر ناقص قرار دیا کہ یہ مکتب خالص استدلال (Pure Reasoning) کے ذریعے جن قانونی مقاصد کا حصول چاہتا ہے، وہ ممکن ہی نہیں۔ اس کے برخلاف وہ سفارش کرتا ہے کہ قانون کو مابعد الطبیعیاتی (Metaphysical) ہونا چاہیے۔ مزید یہ کہ اخلاقیات اور قانون دو مختلف صورتیں ہیں۔ اخلاقیات کا تعلق جہاں انسان کے بے ساختہ افعال سے ہے وہیں قانون تمام تر جبری امور سے متعلق ہے۔ یعنی اخلاقیات انسان کی باطنی زندگی سے متعلق ہے تو قانون اس کے بیرونی اطوار پر قابو رکھتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ انصاف کو تجربیت کی مدد سے واضح نہیں کیا جاسکتا۔ بہرحال کانٹ قانونی عدل کا آخری حامی ثابت ہوا۔

پروفیسر ڈایاس کا کہنا ہے کہ اب تک آسٹن کو 'انگریزی قانونیات کا باوا آدم' سمجھا جاتا تھا مگر جرمی بنتھم (1742 تا 1832) (Jermy Bentham) کے کام پر نظر ڈالنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ دراصل اس اعزاز کا حقدار بنتھم ہی تھا۔ لارڈ لائڈ (Lord Lloyd) لکھتا ہے کہ بنتھم کی کتاب بعنوان "Of Law in General" تجزیاتی قانون (Analytical Jurisprudence) کا اہم حصہ ہے۔ ٹامس ہابس کی طرح وہ قانون کو مقتدر اعلیٰ (Sovereignty) اور افادہ (Utility) سے مربوط کرتا ہے۔ اس نے فطری قانون (Natural Law) کو محض ایک فقرہ اور بلیک اسٹون کے فطری حقوق (Natural Rights) کو احمقانہ قرار دے کر یکلخت خارج کر دیا تھا۔ پھر اس نے افادیت کا کلیہ لذتیت (Hedonistic Doctrine of Utility) پیش کیا جس کے مطابق انسان دو مقتدر قوتوں یعنی لذت (Pleasure) اور اذیت (Pain) کے زیر اثر ہوتا ہے۔ یہ قوتیں بتاتی ہیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے اور یہ تعین بھی کرتی ہیں کہ اب ہم کیا کریں گے۔ پھر یہ ہمارے تمام افعال پر اپنا دباؤ برقرار رکھتی ہیں۔ افادیت کے کلیہ لذتیت کو اہمیت دیکر بنتھم گویا قانونی واخلاقی دنیا کا نیوٹن بن گیا تھا۔ لذتیت اور اذیت کو پرکھنے کے لیے اس نے 'لذتیت کے حساب' (Hedonistic Calculus) کا استعمال کیا۔ اس سائنٹفک محاسبی مسرت (Calculus Felicity) کو قوانین کی افادیت کی جانچ اور فطری قانون کو رد کرنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ اس نے صرف ایسے قوانین کے بقا کی حمایت کی جن کے چار مقاصد تھے یعنی (1) ذریعہ معاش (Subsistence)، (2) بہتات (Abundance)، (3) مساوات (Equality) اور (4) سلامتی (Security)۔ بنتھم نے قانونیات کی دو قسموں میں فرق واضح کیا۔ (1) احتسابی قانونیات (Censorial Jurisprudence) اور (2) انکشافی قانونیات (Expository Jurisprudence) اول الذکر تعین قدر اور قانون سازی کی سائنس ہے جبکہ ثانی الذکر تجزیاتی خصوصیت سے تعلق رکھتی ہے۔ نیز بنتھم نے قانون موضوعہ (Positive Law) کا ایک انوکھا نمونہ پیش کیا جس میں فلاح عام کے مفاد میں مقتدر اعلیٰ کے قانون کی فوقیت شامل تھی۔

اگسٹ کومٹ (1798 تا 1857) (Auguste Comte) کو جدید ثبوتیت (Positivism) کا بانی مانا جاتا ہے۔ اس نے قانونیات اور نظریہ قانون میں قیاسی تفکرات کو کلیتاً مسترد کر کے اپنے تجزیہ کو محض حقائق کے مشاہدہ تک ہی محدود رکھا۔ بطور ایک ثبوتی (Positivist) اس نے ایک ایسے قانونیات کے مطالعہ پر زور دیا جس کی بنیاد حقیقی مشاہدات اور قابل تحقیق حقائق کے تجزیہ پر ہو۔ جس کا مقصد قانون کی جانچ کرنا ہو کیونکہ اسے انسان نے انسان کے لیے مدون کیا جو اس قانون سے قطعی مختلف ہے 'جیسا کہ وہ درکار ہو' (as it ought to be)۔

جان آسٹن (1790 تا 1859) (John Austin) کے مطابق قانونیات کا مناسب ترین موضوع قانون موضوعہ (Positive Law) ہے جو قانونیات کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ (1) عمومی قانونیات (General Jurisprudence) اور (2) خصوصی قانونیات (Particular Jurisprudence)۔ آسٹن کے مطابق عمومی قانونیات قانون موضوعہ کا فلسفہ ہے۔ عمومی قانونیات سے مراد وہ سائنس ہے جو دو یا زائد ممالک کے نظام قانون کے یکساں اصولوں، تحریکوں اور امتیازات یعنی فرق کی واضح تشریح کرے۔ عمومی قانونیات کے شعبہ میں حقوق وفرائض (Rights and Duties)، ملکیت (Ownership)، قبضہ (Possession)، شخصیت (Personality)، جائداد (Property) وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ آسٹن کے مطابق خصوصی قانونیات قانون موضوعہ کے کسی ایسے نظام کی سائنس ہے جو زمانہ حال یا ماضی میں کسی ملک یا قوم میں مروج ہوئی یا رہی

ہوگی۔ محض عملی قانونیات ہی خصوصی قانونیات ہوسکتی ہے۔ مثلاً ملکیت تمام نظاموں میں مشترک ہے جس کی وضاحت یا شرائط کا تعین قانونیات کے ذریعہ کیا جاسکتا ہے جیسے ملکیت کا حصول (Acquisition)، منتقلی (Transfer)، یا دست برداری (Extinguish) کیسے کی جاسکتی ہے۔ آسٹن کے مطابق قانون کی ماہیت (Nature) کے تین لازمی اجزائے ترکیبی ہیں۔ (1) حکم و ہدایت (Command)، (2) تعزیر و امتناع (Sanction) اور (3) اقتدار اعلیٰ (Sovereign) جن کے بغیر کسی قانون کا موثر نفاذ ممکن نہیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ اٹھارھویں صدی کے اختتام تک قانونیات میں قانون فطرت اور مابعد الطبیعیاتی افکار زوال پذیر ہونے لگے تھے کیونکہ انیسویں صدی کے اوائل سے ہی سائنٹفک اور تنقیدی طرز نظر میں اضافہ ہوتا رہا تھا۔ ان حالات میں قانونیات کی مزید وضاحت اس کے اُن قطعی مشمولات کے تجزیہ اور توضیح سے ہوسکتی تھی، جن پر ماہرین میں اتفاق پایا جاتا تھا جو ذیل کی طرح ہیں۔ واضح رہے کہ قانونیات میں ان پر تجریدی اور نظری لحاظ سے بحث ہوگی۔ (1) قانون کے ذرائع (Sources of Law)، جیسے رسم و رواج (Customs) قانون سازی (Legislation)، نظائر (Precedents)، تدوین قوانین کے مباحثے (Pros and Cons of Codification)، عدالتی توضیح کے طریقے اور استدلال (Methods of Judicial Interpretation and Reasoning)، عدل گستری (Administration of Justice)، وغیرہ۔ (2) قانونی تصورات (Legal Concepts) جن میں حقوق (Rights)، جائداد (Property)، ملکیت (Ownership)، قبضہ (Possession)، وجوب (Obligation)، افعال (Acts)، غفلت (Negligence)، قانونی شخصیت (Legal Personality) کے علاوہ دیگر متعلقہ مسائل کا تجریدی اور تجزیاتی مطالعہ کیا جاتا ہے اور (3) قانونی نظریہ (Legal Theory) جس کا بیان آگے آتا ہے۔

سر ٹامس ارسکائن ہالینڈ (1835 تا 1926) (Sir Thomas Erskine Holland): انیسویں صدی عیسوی میں ہالینڈ نے تجزیاتی طرز نظر کو آگے بڑھایا اور اسے بنتھم اور آسٹن سے ورثے میں ملی ہوئی روایات کے لیے ایک ایسا خاکہ (Framework) فراہم کرنے کی کوشش کی تھی جس کی بنیاد آسٹن کے تصورات اور فلسفہ پر رکھی جائے۔ چنانچہ قانونیات کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ یہ قانون موضوعہ کی ایک رسمی سائنس ہے۔

روڈلف اسٹملر (1856 تا 1938) (Rudolf Stammler) کا نظریہ بھی قانونیات کے بارے میں یہی کچھ ہے۔ ہالینڈ قانونیات کو ایک 'رسمی سائنس' (Formal Science) کہتا ہے۔ کیونکہ یہ کسی مادی وجود میں پوشیدہ بنیادی اصولوں سے تعلق رکھتی ہے۔ مثلاً ملکیت، قبضہ، معاہدہ، وغیرہ۔ وہ مزید کہتا ہے کہ قانونیات استخراجی (قیاسی) (a priori) قانونی روابط کی بجائے استقرائی (تجربی) (aposteriori) روابط کی سائنس ہے۔

اٹھارھویں صدی کے اختتام تک قانونیات میں قانون فطرت اور مابعد الطبیعیاتی افکار زوال پذیر ہونے لگے تھے کیونکہ انیسویں صدی کے اوائل سے ہی سائنٹفک اور تنقیدی طرز نظر میں اضافہ ہوتا رہا تھا۔ان حالات میں قانونیات کی مزید وضاحت اس کے اُن قطعی مشمولات کے تجزیہ اور توضیح سے ہوسکتی تھی، جن پر ماہرین میں اتفاق پایا جاتا تھا جو ذیل کی طرح ہیں۔ واضح رہے کہ قانونیات میں ان پر تجریدی اور نظری لحاظ سے بحث ہوگی۔

سر جان سلمنڈ (1862 تا 1924) (Sir John Salmond) قانونیات کو دیوانی قانون (Civil Law) کے بنیادی اصولوں کی سائنس کہتا ہے۔ دیوانی قانون ان ضوابط (Rules) پر مشتمل ہوتا ہے جنھیں عدالتیں عدل گستری (Administration of Justice) میں لاگو کرتے ہیں۔ وہ گرے (1839 تا 1915) (Gray) کے اس بیان سے متفق ہے کہ قانونیات محض قانون سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ مذہبیات (Theology) اور اخلاقیات (Morality) سے گوکہ وہ بھی انسانی کردار پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس نے قانونیات کی دو مفہوم یعنی (1) عمومی (Generic) اور (2) خصوصی (Specific) میں اصناف بندی کی ہے۔ اس نے قانونیات کی مزید تین قسمیں بتائی ہیں۔ (1) انکشافی یا منظم قانونیات (Expository or Systematic Jurisprudence)، (2) قانونی تاریخ (Legal History) اور (3) مقننہ کی سائنس (The Science of Legislation) اس کا مقصد درکار قانون (Law as Ought to be) کو پیش کرنا ہے۔

ڈین راسکو پاؤنڈ (1870 تا 1964) (Dean Roscoe Pound) لکھتا ہے کہ بنیادی طور پر قانونیات، اخلاقیات، معاشیات، سیاسیات اور سماجیات گوکہ ایک دوسرے سے کافی مختلف تو ہیں لیکن باہم سایہ فگن بھی ہیں۔ ان کے تجزیاتی امتیازات نہایت معقول اور صحیح لگتے ہیں۔ وہ مزید کہتا ہے کہ قانونیات اور دیگر سماجی علوم کے درمیان نہایت مستحکم اور ناگزیر ربط ہے۔ اس کی رائے میں ہر مسئلہ کے پس پردہ کچھ نہ کچھ سماجی وجوہات ہوتے ہیں ۔ اس لیے قانونیاتی مطالعہ کے دوران قانون اور سماجی تعلق پر خصوصی زور دینا چاہیے۔

ڈاکٹر ایم۔جے۔سیتھنا ہندوستان میں ترکیبی قانونیات کے سب سے بڑے نقیب اور شارح رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے نظریہ غفلت (Theory of Neglegence) میں یہ واضح کیا کہ غفلت ایک تقصیری (Faulty) اور منفی عمل ہے۔ یہ معروضی (Objective) اور موضوعی (Subjective) دونوں ہی طرح کا ہوسکتا ہے۔

بیسویں صدی کی ابتداسے ہی سوگنی (1779 تا 1861) (Savigny) شدید نظریہ عقلیت (Excessive Rationalistic Theory) اور پھر آسٹن کے تجزیاتی ثبوتیت (Positivism) کے خلاف شدید رد عمل دیکھنے میں آیا کیونکہ ان سے سماج کا کوئی بھی اہم مقصد پورا نہیں ہوتا تھا۔ معاشی اور سماجی عدم مساوات کی وجہ سے سماج میں ایک اکتا دینے والا خلا درآیا تھا۔ جس کی وجہ سے قانونیاتی مطالعہ کے بارے میں نئے رویوں کی ضرورت محسوس ہوئی اور نتیجتاً قانونیات کا مطالعہ سماجی نشوونما، سماجی تبدیلی اور سماجی ترقی کے طریق عمل کے طور پر کیا جانے لگا۔ اس نئے طرز مطالعہ کو 'سماجیاتی قانونیات' کے نام سے موسوم کیا گیا۔

جولیس اسٹون (1907 تا 1985) (Julius Stone) نے اضافی تاویل (Extraversion) کا نظریہ پیش کیا جس کے مطابق قانونیات کسی قانون داں کا وہ طرز تحقیق ہے جس کی مدد سے قانون میں شامل ہدایات (Precepts)، افکار (Ideals) اور عملی فنون (Techniques) کی جانچ دیگر شعبہ جات جیسے فلسفہ، نفسیات، انسانیات، معاشیات، سماجیات وغیرہ سے حاصل شدہ جدید ترین معلومات کی روشنی میں کی جاتی ہے۔ اس کی مدد سے ججز اور وکلا اس موقف میں ہوتے ہیں کہ وہ قانون کے مقصد کی توضیح کرسکیں تا کہ ''کتابی قانون'' (Law in books) اور عملی قانون (Law in action) کے درمیان فرق کو معدوم کیا جاسکے۔ ہندوستان میں

اضافی-قانونی-تاویل (Extra-Legal-Version) کے پیش رو مدراس ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ایم-راجا منار تھے اور دیگر ججز میں جسٹس چھاگلہ، جسٹس گجیندر گڈکر، جسٹس بھاگ وتی، جسٹس کرشن ایر شامل ہیں۔ جسٹس کرشن ایر نے قانونی برادری پر زور دیا کہ ''وہ عام آدمی کی آرزوؤں اور مقاصد کو قانونی طریق عمل کے ذریعے ایک زندہ حقیقت میں تبدیل کرنے کے لیے اپنے آپ کو وقف کردیں۔'' اضافی-تاویلی-ترکیب (Extra-Version-Mechanism) کے اس میکانزم کو جہاں بعض سیاستداں اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے ہیں، وہیں روشن خیال جج قانون کے اس محاس (Antenna) کو عوامی زندگی سے جوڑ دیتے ہیں۔

تجزیاتی اور تاریخی مکتب فکر کے ماہرین سماجی خدمت پر زور دیتے ہیں۔ اس طرح علم قانونیات سماجی انجینئرنگ کی سائنس (Science of Social Engineering) بن جاتا ہے جس کی مدد سے متصادم مفادات میں ہم آہنگی کے ساتھ ساتھ سماج کے محروم طبقات کے تقاضوں کی تکمیل قانونی فریم میں قانون کے مطابق سماجی ہم آہنگی سماجی انصاف اور سماجی توازن برلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

تجزیاتی اور تاریخی مکتب فکر کے ماہرین سماجی خدمت پر زور دیتے ہیں۔ اس طرح علم قانونیات سماجی انجینئرنگ کی سائنس(Science of Social Engineering) بن جاتا ہے جس کی مدد سے متصادم مفادات میں ہم آہنگی کے ساتھ ساتھ سماج کے محروم طبقات کے تقاضوں کی تکمیل قانونی فریم میں قانون کے مطابق سماجی ہم آہنگی سماجی انصاف اور سماجی توازن بر لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ڈبلیو فریڈمین (1907 تا 1972) (W. Friedmann) نے 1945 میں سب سے پہلے قانونیات کی بجائے قانونی نظریہ (Legal Theory) پیش کیا۔ اس سے قبل قانونیات کو مختلف معنوں میں استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ بعض وقت اسے 'قانون' کی اصطلاح کے مرادف استعمال کیا گیا، کبھی 'فلسفہ قانون' تو کبھی 'قانون کی سائنس' کہا گیا ہے۔ جبکہ حالیہ رجحان یہ ہے کہ اسے قانونی نظریہ کہنے پر ترجیح دی جارہی ہے۔ یہ نظریہ فلسفہ قانون پر مشتمل ہوتا ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں قانونیات کا مطالعہ ایک وسیع تر میدان کا احاطہ کرتا ہے کیونکہ اس میں قانون سے متعلق تجریدی عمومی اور نظری تحقیق شامل ہوتی ہے جبکہ نظریہ قانون میں محض ایک فلسفیاتی جواب دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ قانون کیا ہے؟ ڈاکٹر فریڈ مین نے قانونیات کے روایتی برطانوی تصور کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا جو محض منطق مقتدر (Logic of Sovereign) حکم و جبر (Command and Coercion) پر مبنی تھا۔ اور جو اخلاقی اور سماجی قدروں (Values) سے بالکل عاری تھا۔ ان کوتاہیوں کو دور کرنے کے لیے اس نے 'قانونی نظریہ' پیش کیا جسے قانون کے میدان میں بڑی پذیرائی حاصل ہوئی۔

ایچ-ایل-اے ہارٹ (1907 تا 1992) (H.L.A. Hart) کی کتاب بعنوان 'دی کنسپٹ آف لا، 1961' تجزیاتی قانونیات کے اہم ترین کتابوں میں سے ایک رہی ہے۔ ہارٹ کے قانون کا تصور بطور ایک متبادل کے سامنے آیا ہے جس نے آسٹن کے حکم-فرض (تعمیل)-تعزیر (Command-Duty-Sanction) کے سلسلہ کو مسترد کرکے برطانوی ثبوتیت کا نیا نظریہ پروان چڑھایا۔ اس نے آسٹن کے فلسفہ قانون کو نظر انداز کرکے قانون کی ایک ثبوتی روداد پیش کی۔ اس طرح انگلستان میں اس کے نظریہ سے تجزیاتی قانونیات کے بعد ان میں ایک انقلاب برپا ہوا۔ آسٹن کے حکم-تعزیر-مقتدر اعلیٰ پر مبنی ثلث (Triology) کو وہ علم قانونیات کی کلید کہتا ہے۔

لیکن ہارٹ کے پاس یہ معیار کچھ اور ہی ہے۔ اس کے مطابق قانون ایک ایسا نظام ضوابط ہے جو ابتدائی (Primary) اور ثانوی (Secondary) کا وہ اتصال ہے جس سے قانونیات کی کلید فراہم ہوتی ہے۔

ہارٹ کو بجاطور پر ایک اثباتی اور ایک فطرت پرست دونوں ہی کہا جاسکتا ہے۔ ہارٹ کو بخوبی احساس ہے کہ تمام ہی قوانین اور ضوابط میں کچھ معاملات مخفی بھی ہوتے ہیں اس وجہ سے عدلیہ کو یہ تقویت حاصل ہوتی ہے کہ وہ عوام کو درپیش نئے چیلنجوں، ردعمل اور خواہشات کو سماجی انصاف، جمہوریت، قومی یکجہتی کے کامل مفاد میں حل کرے۔

آئینی تاکیدی حکم (Mandate) کے مطابق انصاف آزادی اور مساوات کو یقینی بنانے کے لیے ہندوستانی عدالتی طریق عمل، سماجی انصاف، حقوق انسانی اور آئینی آزادی کی دفاع میں عام آدمی کا عدلیہ میں اعتماد بحال کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اگر اس راہ میں کوئی دشواری پیش آجائے تو اسے عدالتی سرگرمی (Judicial Activisim) اور اختراعیت (Creativity) کی مدد سے پوری طرح معدوم کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں عدالتوں نے عدالتی سرگرمی اور سماجی انجینئرنگ کی مدد سے نئے ضوابط کا ایک منشور تیار کیا ہے تاکہ عوامی خواہشات اور ضروریات کی تکمیل ہوسکے۔ جسے انتظام بذریعہ عدلیہ (Governance by Judiciary) کہا جاتا ہے۔ اس سے عدالتوں کو بڑی حد تک راحت ملی کہ انھیں قانونی موقف (Locus Standi) کے بے لچک اصولوں سے نجات ملی۔

حواشی:

1) فرہنگ اصطلاحات (انگریزی-اردو) قانون قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، پہلا ایڈیشن 2013
2) فرہنگ اصطلاحات (انگریزی-اردو) فلسفہ نفسیات اور تعلیم ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، پہلا ایڈیشن، 1988
3) جیورس پروڈنس اینڈ لیگل تھیوری، ڈاکٹر وی-ڈی-مہاجن، ایسٹرن بک کمپنی لکھنؤ، پانچواں ایڈیشن، ری پرنٹ 2013
4) جیورس پروڈنس (لیگل تھیوری) پروفیسر نوینا اگروال سنٹرل لا پبلیکیشن، الہ آباد، ری پرنٹ، 2005
5) اسٹڈیز ان جیورس پروڈنس اینڈ لیگل تھیوری، ڈاکٹر این-وی پرانجپے، سینٹرل لا ایجنسی، الہ آباد، ساتواں ایڈیشن، 2013
6) فنڈامینٹلس آف جیورس پروڈنس (دی انڈین اپروچ) پروفیسر ایس این دھیانی سینٹرل لا ایجنسی، تیسرا ایڈیشن، 2004
7) پی رامارتھن ایرس دی لا لکسی کان تھرڈ ایڈیشن 2012، لکسس نکسس گڑگاؤں، ہریانہ
8) پی رامارتھن ایرس کنسائز لا ڈکشنری، پانچواں ایڈیشن، 2014
9) ہم پاکٹ 20th سنچری ڈکشنری، 2003، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
10) آکسفورڈ ایڈوانسڈ لرنرس ڈکشنری، سیونتھ ایڈیشن، 2005
11) آکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری، نویں طباعت، 2013
12) فرسٹ ٹرائی لنگول لا ڈکشنری، خواجہ عبدالمنتقم، فرسٹ ایڈیشن، 2015، ایم آر پبلیکیشن، نئی دہلی
13) دی اسٹنڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری ایڈیٹڈ بائے مولوی عبدالحق، سترہواں ایڈیشن 2012، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی

■

Mustafa Nadeem Khan Gauri
Beside Supreme Global School
Nagsen Colony, Roshan Gate
Aurangabad (M.S) 431001
Mob. 9604957100

سیما صغیر

تصوف کا ایک روشن چراغ

شیو برت لال ورمن

مشرقی ایشیا کا وہ علاقہ جو برِ صغیر کے نام سے جانا جاتا ہے، ہزاروں سال سے صوفی سنتوں کی کاوشوں کا مرہونِ منّت رہا ہے۔ اس خطۂ ارض کے صوفی سنتوں کی تعلیمات کی بنیاد آپسی رواداری اور بھائی چارے پر مبنی رہی ہے۔ خصوصاً ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب اسی کی مظہر ہے۔ مہارشی شیو برت لال ورمن اس کی ایک اہم کڑی ہیں۔ روحانی خدمات کے علاوہ ان کے ادبی کارنامے آسانی سے فراموش نہیں کیے جا سکتے ہیں۔ اردو اور ہندی کے علاوہ وہ بنگالی، گجراتی، سنسکرت، فارسی اور انگریزی سے بھی بخوبی واقف تھے لیکن اردو سے خاص لگاؤ تھا۔ قدیم علمی سرمایے کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے انھوں نے غیر معمولی محنت کی۔ ترجمے ہی نہیں بلکہ ان کی شرحیں بھی لکھیں۔ اردو سے خصوصی لگاؤ کا انھوں نے ہمیشہ اعتراف کیا ہے۔ اپنے ماہ نامہ 'اُپنشد' کے ستمبر 1926 کے شمارے میں رقم طراز ہیں:

''.......میں اردو ہی میں زیادہ تر لکھتا ہوں اور میری محنت نے فلسفہ پسندوں کا دائرہ بنا لیا ہے لیکن وہ محدود ہے تاہم قدرت نے جس طبقے میں مجھے رکھا ہے اس کی خدمت لازمی ہے۔''

موتی لال مختار، ایڈیٹر سَت سنگت میں لکھتے ہیں:

''انھوں نے اپنی تحریر کے ذریعے ایک خاص زبان کی بنیاد ڈالی جس میں ہندی کے سلیس، عام فہم اور روزمرہ بول چال کے الفاظ بہ کثرت ہوتے لیکن رسم الخط وہ اردو کا ہی استعمال کرتے تھے۔''

شیو برت لال ورمن 1860 میں بھدوئی ضلع بنارس میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم قصبے میں، ثانوی بنارس میں ہوئی۔ الہ آباد کے میور سینٹرل کالج سے 1888 میں ایم اے کی سند حاصل کی۔ شکاگو، امریکہ سے ماسٹر آف آرٹس اور ڈاکٹر آف لاز کی اعلیٰ ترین ڈگریوں کے حصول کے بعد تمام مذاہب کا مطالعہ کیا۔ مولانا عبدالحنان سے تصوف کے رموز سیکھے۔ غور و فکر کے بعد 'رادھا سوامی مَت' کے بانی سالگ رام کے مرید ہوگئے۔ وہ اپنے مشہور مضمون ''توحید کا خزانہ'' میں لکھتے ہیں:

''میں بذاتِ خود نہ ہندو ہوں نہ مسلمان۔ میں خود کیا ہوں اس کا حال تم کو میری تصنیف و تالیف سے معلوم ہوگا۔ میں مسلمانوں کی خاطر مسلمان بن کر ان کو مسلمانوں کے موافق دعا دیتا ہوں اور ہندوؤں کے لیے ان کے طرزِ عمل کا پیرو ہو کر پرارتھنا اور آرادھنا سے شرادھ کرتا ہوں تاکہ انھیں بہ آسانی میری دعا اور پرارتھنا کا فیض پہنچے اور اگر خیال کی دھارا میں طاقت و لطافت اور صداقت ہے تو وہ ضرور اپنا عمل کرنے سے نہ چوکے گی۔ مسلمانوں کے لیے میں سچا مسلمان ہوں اور ہندوؤں میں سچا ہندو ہوں۔''

اپنے تعلق سے وہ مزید فرماتے ہیں:

''میرا جسم مر جائے گا۔ یہ فانی ہے۔ میرے پیچھے یہ نظر نہ آئے گا۔ مجھے اس سے پیار و محبت بھی نہیں ہے۔ میں ذاتِ باقی ہوں۔ بہت دنوں تک دنیا میں میری سمادھی اور میری تُربت رہے گی۔ وہ لوگوں کو یاد دلائے گی کہ شیو کا جسم یا جسم کی خاک اس میں دفن ہے۔ وہ نیک جذبات کو اُبھارنے میں مددگار ہوگی۔ میری کتابیں، میرے خیالوں کے نوشتے کچھ عرصے تک مادی دنیا میں میرا نشان باقی رکھیں گے۔ پھر کیا ہوگا نہ مجھے کچھ کہنے کی اور نہ تمھیں جاننے کی ضرورت ہے:

مرنے کے بعد قبر کا میری کہاں پتہ
عارف کے صاف سینے میں میرا مزار ہے''

(شیو برت لال ورمن اور ان کی علمی و ادبی خدمات، ڈاکٹر ذکیہ خاتون، ص 113)

ورمن جی کی تصانیف تین ہزار سے زائد بتائی جاتی ہیں تاہم اردو میں ان کی تقریباً چار سو تصنیفات دستیاب ہیں۔ ان میں بیس مذہبی رسالے، سولہ اخبارات، پندرہ سفرنامے، دس تذکرے، درجنوں مضامین اور ناول وغیرہ شامل ہیں۔ نثر و نظم کی تقریباً سبھی قسموں میں انھوں نے لکھا ہے۔ شاعری میں غزل، نظم، رباعی، قطعہ، مرثیہ، شبد، دوہے، کبت، پد، بھجن وغیرہ تو نثر میں ناول، کہانیاں، عوامی قصے، ناٹک، سوانحات اور تذکرے بھی لکھے ہیں۔ موضوعات کا دائرہ بے حد وسیع ہے۔ اس میں سیاسیات، فلسفہ، تاریخ، تمدن، حفظانِ صحت، خانہ داری وغیرہ سبھی کچھ شامل ہے لیکن ان کی طبیعت کا اصل میلان تصوف اور مذہب کی طرف تھا۔ رادھا سوامی مَت، سنت مَت، جین مَت، بُدھ مَت، کبیر پنتھ، ہندو مذہب، سکھ مذہب، پارسی مذہب، عیسائیت اور اسلام پر لکھی ان کی کتابیں اس کی گواہ ہیں۔

مہرشی ورمن کی پوری زندگی اتحاد و اتفاق اور میل ملاپ کے فروغ کی کوشش میں گذری۔ ان کی دلی آرزو ملک میں ہندو مسلم اتحاد قائم کرنے کی تھی، جو کبیر جوگ کے آخری صفحے کی آخری سطور سے ظاہر ہے۔ وہ اپنے گُرو سے صرف یہی مانگتے ہیں کہ حضور آشیرواد دیں کہ ہمارے پاک بھارت ورش کے لوگ برادرانہ تعلقات کے اصول

کو ذہن نشین کر کے اب از سر نو ملکی اور قومی یگانگت کی بنیاد کے قائم کرنے میں کامیاب ہوں۔ وہ اپنے ایک مضمون 'کامیابی کا راستہ' میں لکھتے ہیں:

''ہندو مسلمان اگر ایک دوسرے کے عقائد کی عزت کریں اور کسی طرح ایک دوسرے کے مذہبی خیالات کو قولاً یا فعلاً ہرگز کوئی صدمہ نہ پہنچائیں بلکہ ادائے رسوم مذہبی میں ایک دوسرے کو ہر طرح مدد دیا کریں اور جہاں تک ہو سکے کوئی دقتیں یا پیچیدگیاں پیدا نہ ہونے دیں، نہ کسی کی دل آزاری ہو اور نہ دل آزردگی، اپنی بہتری کے لیے مل کر کوشش کریں، گورنمنٹ سے حقوق طلب کرنے میں ایک رہیں اور اختلافات کا آپس میں مل جل کر فیصلہ کر لیں تو ممکن نہیں کہ وہ اپنی بہتری میں کامیاب نہ ہوں اور ہندوستانی اپنے دلی مقاصد کو حاصل نہ کر لیں۔''

'صوفی ازم' ان کی معروف تصنیف ہے۔ پروفیسر صغیر افراہیم نے ماہنامہ 'ندائے جمہور' کے خصوصی شمارے میں اس کے تعلق سے لکھا ہے:

''صوفی ازم ان کی ایسی نادر تصنیف ہے جس میں انھوں نے پیچیدہ خیالات وعقائد کو اپنے مخصوص، صاف ستھرے انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ سنت سنجوگ نامی ایک ضخیم کتابی سلسلے کی پانچویں جلد کی حیثیت سے رسالہ سنت سماگم میں چھپی تھی پھر خواہش مندوں کے شدید مطالبے پر، بعض اضافوں کے ساتھ اسے ایک الگ اور مستقل کتاب کی صورت میں ٹھاکر نند و سنگھ، سکریٹری رادھا سوامی دھام، بنارس نے ماہنامہ 'دیال' جلد 26، حیدر آباد

میں بذات خود نہ ہندو ہوں نہ مسلمان۔ میں خود کیا ہوں اس کا حال تم کو میری تصنیف و تالیف سے معلوم ہوگا۔ میں مسلمانوں کی خاطر مسلمان بن کر ان کو مسلمانوں کے موافق دعا دیتا ہوں اور ہندوؤں کے لیے ان کے طرز عمل کا پیرو ہوکر پرارتھنا اور آرادھنا سے شرانہ کرتا ہوں تاکہ انہیں بہ آسانی میری دعا اور پرارتھنا کا فیض پہنچے اور اگر خیال کی دھارا میں طاقت و لطافت اور صداقت ہے تو وہ ضرور اپنا عمل کرنے سے نہ چوکے گی۔ مسلمانوں کے لیے میں سچا مسلمان ہوں اور ہندوؤں میں سچا ہندو ہوں۔

سے چھپوا کر شائع کیا۔ تین سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب مکالماتی انداز میں ہے۔ اس میں اسلامی تصوف پر محققانہ، طالب علمانہ اور بے تعصبانہ گفتگو کو بھائی نندو اور دیال کے سوال و جواب کے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔'' (ص 20)

'صوفی ازم' کے مطالعے سے نہ صرف عام واقفیت بڑھتی ہے بلکہ دلوں سے تنگ خیالی اور مذہبی تعصب بھی دور ہوتا ہے۔ باہمی محبت اور الفت کے جذبات سے مزین اس کتاب پر مدلل بحث کرتے ہوئے صغیر افراہیم لکھتے ہیں:

''شیو برت لال کے نزدیک تصوف پسند لوگ ہر جگہ، ہر قوم اور ہر ملت میں ہوئے ہیں مگر اس کی اصل پیدائش گاہ ہندوستان ہے۔ اس فلسفے کو رشیوں نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ نشو ونما دیا۔ اُپنشدوں کے مقدس نغمے جن کی بنیاد وحدانیت پر ہے، اس کی بہترین مثال ہیں۔'' (ص 22)

شیو برت لال کا کہنا ہے کہ اس ہندوستانی فلسفے کو پارسی جو دراصل آریہ ہندو تھے، خیالی ردّو بدل کے ساتھ ایران لے گئے۔ یہودی جو پارسیوں کے ہم سایہ تھے، انھوں نے اس کو اپنے نقطۂ نظر سے قبول کیا۔ عیسائیوں نے اس میں رنگ و روغن بھرا اور مسلمانوں نے فلسفۂ تصوف کے کینوس کو وسیع کیا لیکن اب بھی اس کا تمام تر ڈھانچہ ہندوستانی فلسفے پر مبنی ہے۔ 'حمدِ باری' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

ہے صوفیوں کے لب پر یارب کلام تیرا
اور عارفوں کے دل میں بستا ہے نام تیرا
ملت کا پاس کس کو، مذہب کا ہوش کس کو
بے خود ہوا ہوں پی کر، اُلفت کا جام تیرا
ہے دَیر میں بھی تو ہی، اور کعبہ میں بھی تو ہی
یہ بھی مکان تیرا وہ بھی مقام تیرا
کونین کا ہے حاکم، دارین کا ہے مالک
کیسی یہ ٹُرک تیری، کیا احتشام تیرا
نیرنگِ دو جہاں میں، ذاتِ اَحد ہے تیری
ثابت حدوث سے ہے، یارب دوام تیرا
تو ہے نگارِ زیبا، آئینہ خانہ دنیا
وحدت میں ہو رہا ہے، کیا اژدہام تیرا
منصور کی صدا ہے، ہر اک صدا جہاں میں
یاں گوش زد ہے ہر سو، یارب پیام تیرا
دے تو اگر سہارا، چڑھ جاؤں میں بھی بے شک
گو میری دسترس سے، اونچا ہے بام تیرا

شیوبرت لال ورمن نے سوجھ بوجھ سے کام لے کر رادھا سوامی مت میں ایک الگ راہ نکالی جس نے شدت پسندی کو کم کیا، محبت اور مساوات کو تقویت پہنچائی۔ انسانی فلاح و بہبود پر مبنی اپنے اس مثبت طریق کی اشاعت بین الاقوامی سطح پر کی۔ تصنیف، تالیف اور ترجمے سے کام لیتے ہوئے مشترکہ تہذیب و تمدن کو فروغ دینے والی اس عظیم الشان شخصیت کے علمی کارناموں کا اجاگر کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

پروفیسر محمد انصار اللہ نے بہت سے حقائق کو یکجا کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ شیو برت لال ورمن نے سنت مت کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے اپنے مسلک کی ترویج و اشاعت کے لیے مختلف منصوبے بنائے۔ لاہور، امرتسر اور الہ آباد سے میگزین، اخبار اور رسالے نکالے۔ شمالی ہند میں اپنا وسیع حلقہ قائم کرنے کے بعد روحانی تعلیم کے فروغ کے لیے جنوبی ہند کی طرف توجہ کی۔ حیدر آباد، مدراس اور سری لنکا میں مراکز قائم کیے۔ جس طرح ان کے عقیدت مندوں کی تعداد لاکھوں لاکھ ہے جو دنیا کے بیشتر ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں اسی طرح ورمن جی کی حیات میں ان کے دوستوں کا دائرہ بھی بہت وسیع تھا۔ سورج نارائن مہران کے معاصر بزرگ اور علامہ اقبال معاصر خُرد تھے۔ اکبر الہ آبادی، حامد حسن قادری اور جگت موہن لال رواں کے ساتھ ان کی مراسلت تھی۔ دیا نرائن نگم اور پریم چند نیاز مندوں میں تھے۔

شیوبرت لال ورمن نے سوجھ بوجھ سے کام لے کر رادھا سوامی مت میں ایک الگ راہ نکالی جس نے شدت پسندی کو کم کیا، محبت اور مساوات کو تقویت پہنچائی۔ انسانی فلاح و بہبود پر مبنی اپنے اس مثبت طریق کی اشاعت بین الاقوامی سطح پر کی۔ تصنیف، تالیف اور ترجمے سے کام لیتے ہوئے مشترکہ تہذیب وتمدن کو فروغ دینے والی اس عظیم الشان شخصیت کے علمی کارناموں کا اجاگر کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

■

Dr. Seema Sagheer, Dept. of Urdu, Aligarh Muslim University, Aligarh - 202002
Email.: seemasaghir@gmail.com

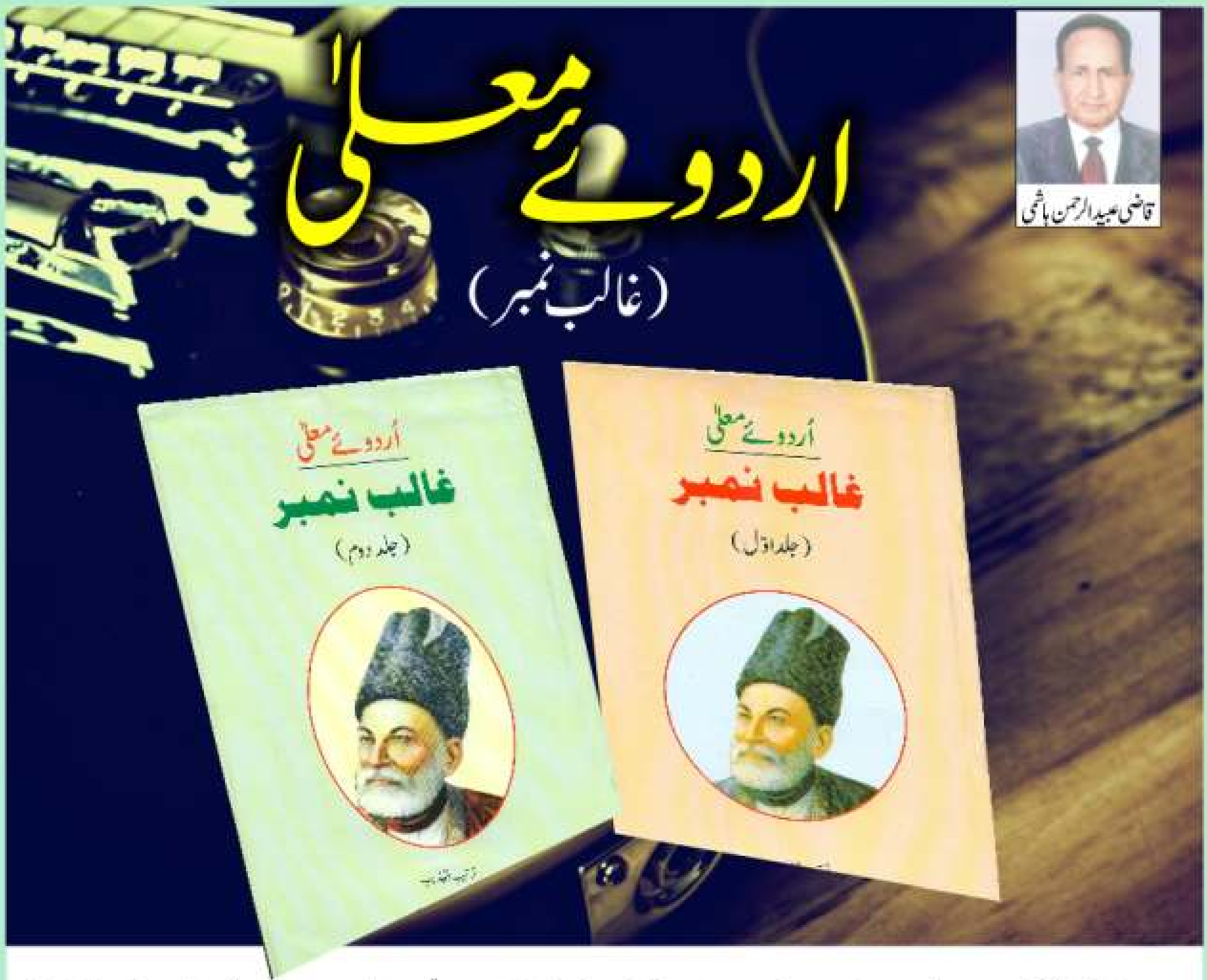

قاضی عبیدالرحمن ہاشمی

اردوئے معلیٰ

(غالب نمبر)

اردو میں شعر و سخن کی صدیوں پرانی روایت میں جو اہمیت اور قدر و منزلت 19 ویں صدی کے شاعر مرزا اسداللہ خاں غالب کو حاصل ہوئی وہ کسی دوسرے سخنور کا مقدر نہ بن سکی۔ اس سے غالب کی شاعرانہ عظمت اور آفاقی قدر و قیمت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ غالب نے پوری زندگی دہلی میں گزاری اور اسی شہر میں پیوند خاک بھی ہوگئے، اس لحاظ سے سرزمین دہلی کے دانشوروں کا بنیادی فریضہ تھا کہ وہ اپنے اس نابغۂ روزگار شاعر کو خراج تحسین پیش کرنے میں بڑھ چڑھ کر پیش رفت کرتے۔ تاہم ایک عرصہ تک اکا دکا مضامین اور مقالات کے ماسوا غالب کی شخصیت اور شاعرانہ کمالات کا مفصل جائزہ لینے کے لیے 1960 تک کسی بڑی کوشش کا سراغ نہیں ملتا۔ تاہم یہ سعادت اور توفیق دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو اور اس کے صدر پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کو حاصل ہوئی (جو بجائے خود ایک سربرآوردہ ادیب اور محقق تھے) کہ انھوں نے غالب صدی تقریبات کے موقعے پر اپنے شعبے سے رسالہ 'اردوئے معلیٰ' کا اجرا کیا اور اس کے اوّلین شمارہ کو غالب کے بارے میں ان کے شایانِ شان لکھے گئے نہایت وقیع مقالوں سے منسوب کیا۔ دہلی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کا باقاعدہ قیام 1959 میں عمل میں آیا اور حیرت ہے کہ شعبے سے دوسرے سال ہی یعنی 1960 میں اردوئے معلیٰ کے بیک وقت دو شمارے اور 1969 میں تیسرا خصوصی شمارہ منظر عام پر آیا۔ ان کے مشمولات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ موضوعات کی اہمیت اور افادیت کے ماسوا یہ مضامین جن حضرات کے رشحات قلم کا نتیجہ ہیں، ان میں سے بعض نہایت معتبر اور سربرآوردہ ناقد و محقق ہیں۔

تاہم یہ مقام حیرت ہے کہ غالب نمبر کے یہ خصوصی شمارے اپنی اشاعت کے تقریباً چالیس برسوں کے درمیان دوبارہ کبھی شائع نہ کیے جاسکے۔ غالب شناسی کے تعلق سے ان نہایت اہم اور وقیع خصوصی نمبروں کی دوبارہ اشاعت کا بیڑا شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی کے سابق صدر پروفیسر ارتضی کریم نے اس وقت اٹھایا جب وہ 1911 میں کافی بڑے پیمانے پر شعبے کا جشن زرّیں منا رہے تھے۔ اس تاریخی موقعے پر جہاں شعبہ کی بہت سی مطبوعات اور مسودات کو زیور طبع سے آراستہ کیا گیا مذکورہ تینوں جلدیں بھی بڑے اہتمام سے شائع کی گئیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب کی وفات سے اب تک ان پر جتنا کچھ علمی و تحقیقی کام ہوا ہے وہ اپنی جگہ پر ایک بہت بڑا ریکارڈ ہے، تاہم موجودہ خصوصی شمارہ کی تینوں جلدیں جن کی ترتیب و تہذیب کا فریضہ پروفیسر ارتضی کریم نے انجام دیا ہے، (جو خود ایک معروف ناقد، محقق اور ادیب ہیں) اس کی دائمی قدر و قیمت سے انکار نہیں ہوسکتا۔ تقریباً 90 مضامین پر مشتمل ان جلدوں کی اہمیت اس کے مضامین کے تنوع اور بالیدگی فکر کے سبب روز افزوں ہوتی گئی جسے صحیح معنوں میں غالب شناسی میں ایک غیر معمولی اضافہ کہا جاسکتا ہے۔

مولانا امتیاز علی خاں عرشی، قاضی عبدالودود، محمد اشرف، مولانا نیاز فتح پوری، ڈاکٹر گیان چند جین، خواجہ محمد فاروقی، مولانا غلام رسول مہر، مختارالدین احمد، گوپی چند نارنگ، رشید احمد صدیقی، خواجہ غلام السیدین، ضیا احمد بدایونی، میکش اکبرآبادی، شبیر احمد غوری، سید وحیدالدین،

اکبر علی خاں عرشی اور تنویر احمد علوی وغیرہ کے علاوہ متعدد اہم غیر ملکی اہل قلم بھی اس میں شامل ہیں جن کی مجموعی کوششوں سے غالب شناسی کے مختلف جہات و ابعاد پہلی بار سامنے آئے ہیں۔

ان مجلوں کا امتیاز یہ ہے کہ ان میں غالب کی شخصیت، اردو، فارسی شاعری، خطوط اور وہ تمام تحریریں جو ان سے منسوب ہیں ان کا نہایت عالمانہ اور مدلل تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے اور غالب کی تخلیقی فطانت کے تعلق سے پہلی بار بعض ایسے اہم نکتے دریافت کیے گئے ہیں جن کی طرف پہلے توجہ نہیں کی جا سکی تھی۔ اس سلسلے میں ایک مطالعہ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے بھی پیش کیا ہے جنھوں نے ان جلدوں کی ترتیب کا فریضہ انجام دیا ہے۔ ان کے مطالعے کا موضوع، کلام غالب میں 'جیب' کا استعمال ہے۔ سنہ 1960 میں موصوف یقیناً بہت کم عمر ہوں گے تاہم مضمون کے مطالعے سے ان کی باریک بینی اور تحقیقی وتنقیدی تیور دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ذہنی طور پر اپنی نوخیز عمر میں بھی نہایت بالیدہ ذہن اور حساس تھے۔ غالب کا یہ شعر

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

کلام غالب میں مذکورہ شعر کے علاوہ دیگر کئی اشعار میں جہاں جہاں غالب نے 'جیب' کا استعمال کیا ہے، اس کی لفظی، معنوی اور استعاراتی صورت حال پر سیر حاصل بحث سے ماقبل کے شارحین کے تسامحات کو جس طرح پروفیسر ارتضیٰ کریم نے نشان زد کیا ہے، وہ نہایت عالمانہ اور فکر انگیز ہے۔

خواجہ احمد فاروقی جن کی مساعی سے یہ اہم جلدیں وجود میں آئیں اور جن کے سبب غالب شناسی کے سرمایے میں خاطر خواہ اضافہ ہوا انھوں نے اپنے کلیدی مضمون **'غالب کی شخصیت اور شاعری میں ترکی اور ایرانی عناصر'** میں اپنی گہری تحقیقی بصیرت، وسیع مطالعہ و مشاہدہ اور تفہیم غالب میں جس دقتِ نظر اور تخلیقی ارتکاز کا ثبوت بہم پہنچایا ہے، وہ نہایت قابل ستائش ہے۔ زبان و بیان کی لطافت، ندرت اور معجزہ کاری نے پورے مضمون کو جاوداں کر دیا ہے۔ چند جملے بطور مثال دیکھے جا سکتے ہیں:

''غالب کا تعلق مغلوں سے براہ راست تھا، وہ نسبتاً اور اصلاً اس قوم کے فرد تھے جس کا ایک قبیلہ دہلی کے تخت پر حکمراں تھا۔ ترکوں میں قدیم سے یہ قاعدہ ہے کہ باپ کے متروکے میں سے بیٹے کو تلوار کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔ غالب کو ورثے میں یہ ترک ایرانی ذہن تو ملا لیکن اپنے آبا کی تلوار نہ مل سکی، البتہ بزرگوں کا یہ تیر ٹوٹ کر ان کا قلم بن گیا۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کو جو خیالات و احساسات اپنے ورثے، ماحول اور اپنی افتادِ طبع کی بدولت ملے تھے ان کا جتنا خوب صورت اظہار غزل میں ہوا ہے، وہ اور کسی صنف میں نہیں ہوا، ان کی تشبیہات و استعارات اور تراکیب اپنے اندر جہانِ معنی چھپائے ہوئے ہیں۔ ان کے ذریعے غزل کا آرٹ نکھر گیا ہے اور زبان و بیان اپنی نئی بلندیوں تک پہنچ گئے ہیں۔ ان دریچوں سے ہم غالب کی اس حسین معنویت، امتزاجی بصیرت اور شوخ ذہانت کا نظارہ کر سکتے ہیں جو ایرانی، ترکی، ہندی خصوصیات کی تخل بندی کا نتیجہ ہے اور جو اردو کی سب سے بڑی دولت ہے۔''

فاروقی صاحب کے مضمون کے اختتامی جملے ملاحظہ فرمائیں:

''آخر وہ کیا چیز ہے جس نے غالب کو حلقۂ شام و سحر سے نکال کر جاوداں بنا دیا۔ میرے خیال میں وہ یہی ایشیائی ورثے کا تسلسل ہے جو ہمیں غالب کی انسان دوستی، آفاقیت، وسیع المشربی، دردمندی، بے نیازانہ خوش طبعی اور معنی لفظ آدمیت کی شکل میں از سر نو دستیاب ہوا ہے۔ یہ وہی مشرق کے شعور کی رو ہے جو قدیم و جدید اور خواب و حقیقت کی وادیوں کے درمیان بے پروائی اور رعنائی سے بہتی ہوئی اور نا آسودگی اور آرزومندی کے گردابوں سے کھیلتی ہوئی عالمی ادب کے ماورائی سمندر سے جا ملی ہے۔''

ان مجلّوں میں یوں تو اکثر ایسے مضامین ہیں جو اپنی گوناگوں افادیت اور غالب شناسی کی بہترین مثال ہونے کی حیثیت سے تعارف کی مستحق ہیں۔ تاہم اس مختصر سے تبصرہ میں گنجائش کم ہونے کے باعث صرف معروف جرمن اسکالر انا مری شمل کے انگریزی سے ترجمہ شدہ مضمون **'غالب کی ایک فارسی غزل'** سے ایک اقتباس نقل کرنا چاہوں گا جس پر ایک نظر ڈال کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مستشرق جو غالب اور اقبال سے غایت درجہ عقیدت رکھتی ہے۔ اس نے کس طرح غالب کے اشعار میں پوشیدہ فنی و فکری فطانت کے دلآویز نقوش کی نشان دہی کی ہے اور غالب فہمی کا حق ادا کیا ہے۔ غالب کی ایک فارسی غزل جس کا ردیف 'برقص' ہے اس کے تجزیہ و تفسیر کے ذریعہ شمل نے غالب کی فنی کارگزاری خصوصاً ندرت اظہار اور معنی آفرینی کے اوصاف کی طرف اشارے کیے ہیں۔ مذکورہ غزل کے شعر۔

در عشق انبساط بپایاں نمی رسد
چوں گرد باد خاک شود در ہوا برقص

کا تنقیدی محاکمہ کرتے ہوئے شمل لکھتی ہیں کہ:

''حرکت کی علامت (غالب) کے اشعار میں بار بار آتی ہے۔ حرکت ہی یقیناً وہ شے ہے جو زندگی کو معنویت عطا کرتی ہے اور یہ حرکت موت کے بعد بھی جاری و ساری رہے گی، خواہ وہ مرنے والوں کی خاک کی صورت میں ہو جو ان لافانی ہواؤں میں اڑتی پھرتی ہے یا وہ وجود کے اعلیٰ ترین طبقوں میں روح کے انتقال و حرکت کی شکل میں ہو، ہر دم مائل بہ سفر روح نہ شجر طوبیٰ کے سائے کی تمنا کر سکتی ہے اور نہ اس کی گرم روی آب کوثر ہی آرزومند ہے۔

جسے زندگی ذرا بھی چھو گئی اس کی حرکت رقص بن گئی۔ طوفان بھی جو اس ظاہری شکل کو برباد کرتا ہے اسے مائل بہ رقص کر دیتا ہے، مقدم سیلاب سے در و دیوار بھی ناچ اٹھتے ہیں۔

نہ پوچھ بے خودی، عیش مقدم سیلاب
کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار

یہ محض اتفاق ہے کہ غالب نے فنکار کی (جو کہ ناتراشیدہ پتھروں میں پہلے ہی سے ان کے جلوے دیکھ لیتا ہے) خلاقی کارزار 'در دل سنگ بنگر رقص بتانِ آزری' کہہ کر ظاہر کیا ہے۔ زندگی ایک حرکت ہے اور حرکت بھی اپنی اعلیٰ ترین صورت میں۔ یہ رقصِ بلا اور رقص شرر بھی ہے اور ایک تماشائے رقصِ ابدی بھی۔ رقص جاری ہے اور پھر بھی پل اپنی جگہ سے نہیں ہلتا۔ غالب صدیوں پرانی تہذیب کی مستحکم روایات کے پابند تھے۔ مگر وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اشعار میں زندگی کے ہلکے سے ہلکے ارتعاش کو کس طرح سمویا اور پیش کیا جا سکتا ہے اور اس لیے زندگی کے بے کراں صحرا میں روح کے اس رقص سے وہ خود بھی مست ہوتے ہیں اور پڑھنے والوں کو بھی بے خود کر دیتے ہیں۔''

اس نوع کی تحریریں جو اب خود کلاسکس کا درجہ حاصل کر چکی ہیں ان کا مطالعہ ہمارے لیے کس قدر ضروری اور سودمند ہے اس کا احساس دھیرے دھیرے ماند پڑتا جاتا ہے، ضروری ہے کہ ہم اپنے ادبی مجلات خصوصاً غالب سے منسوب مذکورہ مجلّوں میں محفوظ بیش قیمت مضامین و خیالات سے استفادہ کو اپنی اولین ترجیحات میں شامل کریں۔

■

Quazi Obaidur Rahman Hashmi,B-10 Okhla Vihar, Jamia Nagar, New Delhi - 110025

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

ممتاز دانشور

معصوم مرادآبادی

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی علمی اور ادبی حلقوں میں نہایت ھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کا انتقال علمی دنیا کا بہت بڑا خسارہ ھے۔ ان کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ اردو رسائل کا نہایت سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کرتے تھے اور رسالے کے مشمولات پر اپنے ردعمل کا اظہار بھی کرتے تھے۔ ماھنامہ 'اردو دنیا' کے اکثر شمارو ںپر انھوں نے اپنی گراں قدر رائے دی اور ان کے یہ خطوط 'اردو دنیا' میں شائع بھی ہوئے۔ اس کے علاوہ دیگر رسائل وجرائد میں وہ خطوط اور مضامین لکھا کرتے تھے۔ ضعیف العمری کے باوجود انھوں نے قلم اور قرطاس سے اپنا رشتہ جوڑے رکھا۔ ادارہ ان کے انتقال پر سوگوار ھے۔ (ادارہ)

ممتاز دانشور ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی کے انتقال سے علمی، ادبی اور تہذیبی فضا سوگوار ہے۔ انھوں نے چند ہفتوں کی علالت کے بعد گزشتہ 10 جنوری کو نئی دہلی کے اپولو اسپتال میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر 96 برس تھی اور بیماری سے قبل وہ پوری طرح چاق وچوبند تھے۔ انھیں دیکھ کر گزرے زمانے کے وہ علما اور فضلا یاد آتے تھے جن کے نزدیک علم ہی سب سے بڑا سرمایہ تھا اور وہ زندگی کا ہر لمحہ اسی کی خدمت میں صرف کرتے تھے۔ ڈاکٹر ہاشم قدوائی ہماری علمی، تہذیبی اور سیاسی زندگی کا ایک چلتا پھرتا انسائیکلوپیڈیا تھے۔ ان کی گفتگو اور علم سے استفادہ کرنے والے تا دیر بیٹھ کر انھیں سنا کرتے تھے۔ ڈاکٹر ہاشم قدوائی نے انتہائی سرگرم اور بامقصد زندگی بسر کی۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی علم کے حصول اور اس کی ترسیل کے مقصد سے غافل نہیں رہے۔

ان کا خاص مشن علم وادب اور تہذیب وتمدن کی خدمت ہی تھا۔ پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ان کے ہزاروں ہونہار شاگرد اس بات کے گواہ ہیں کہ انھوں نے صحیح خطوط پر ان کی تربیت کی اور انھیں ملک وملت کے لیے کارگر بنایا۔

ان کا مطالعہ انتہائی وسیع تھا اور اس میں بلا کی گہرائی تھی۔ ان کی طبیعت میں جو مستعدی اور کمٹمنٹ تھا وہ کم ہی لوگوں کا خاصہ ہوتا ہے۔ انھیں معاشرے کی مسلمہ اخلاقی قدروں سے گہرا لگاؤ تھا اور وہ اس سے انحراف کو گناہ عظیم تصور کرتے تھے۔ ان کی شخصیت گہرے تاریخی، تہذیبی، سماجی شعور کی حامل تھی۔ ان جیسی سلامت فکری اور عقیدے کی پختگی بہت کم لوگوں میں نظر آتی ہے۔ وہ ہر قسم کی اخلاقی پامالی کے مخالف تھے۔

ڈاکٹر ہاشم قدوائی نے انتہائی سرگرم اور بامقصد زندگی بسر کی اور اپنی عمر کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔ آخری عمر تک وہ کسی سہارے کے بغیر چلتے پھرتے تھے اور ان کے تمام اعضا پوری طرح درست تھے۔ انتقال سے دو ماہ قبل جب راقم الحروف ان کی عیادت کے لیے حاضر ہوا تو وہ بیماری کی حالت میں بھی گھر سے باہر نکلنے کے لیے تیار تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ مجھے تو زندگی میں کبھی کوئی عارضہ ہی لاحق نہیں ہوا، بس ایک بار موتیابند کا آپریشن ضرور ہوا تھا۔ 96 برس کی عمر میں بھی وہ چشمے کے بغیر لکھتے اور پڑھتے تھے۔ ان کی نگاہ بڑی دوربین تھی۔ وہ ادب، صحافت، سیاست اور سماج سب کے خیرخواہ تھے۔ موجودہ دور میں شاید ہی کوئی شخص ان کے ہم پلہ ہو۔ تمام قابل ذکر اخبارات وجرائد کے وہ مستقل خریدار تھے اور ہر ایک کا مطالعہ بڑی دلچسپی اور لگن کے ساتھ کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً ہر اخبار اور جریدے کے مکتوبات کے کالم میں ان کا کوئی نہ کوئی چشم کشا خط ضرور نظر آتا تھا جو اخبار یا رسالے میں شائع شدہ کسی مضمون کی تاریخی یا واقعاتی غلطی کی تصحیح پر مشتمل ہوتا تھا۔ انھیں اس بات کا سخت شکوہ تھا کہ موجودہ دور کے بیشتر مؤرخین، صحافی اور قلم کار واقعات کی صحت اور حقائق سے نابلد ہیں۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی کا سب سے بڑا سرمایہ ان کی یادداشت تھی۔ اس پیرانہ سالی کے باوجود وہ اپنی عمر کے ہر واقعہ کو پوری صحت کے ساتھ یاد رکھنے پر قادر تھے۔ ساٹھ ستر سال پرانے واقعات کو بھی وہ اس طرح بیان کرتے تھے کہ جیسے کل ہی کی بات ہو۔ اگر کوئی واقعہ آپ نے ان کی زبانی دس بیس برس پہلے سنا ہو اور اب وہ دوبارہ اسے بیان کررہے ہوں تب بھی اس میں ذرہ برابر تبدیلی نہیں ہوتی تھی۔ یہ دراصل سچائی سے ان کے گہرے لگاؤ کا نتیجہ تھا کیونکہ سچے لوگوں کا ہی حافظہ اتنا مضبوط ہوتا ہے۔ ان کا دوسرا بڑا سرمایہ ان کے عقیدے کی سلامتی تھی اور اس معاملے میں وہ کسی بھی قسم کی لچک کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے۔ ان کی بنیادی تربیت ان کے چچا مولانا عبدالماجد دریابادی کے ہاتھوں میں ہوئی تھی جن سے انھوں نے زندگی کے بنیادی راز حاصل کیے تھے۔ اس کے بعد انھیں ڈاکٹر رفیع احمد قدوائی کی سرپرستی حاصل ہوئی جن سے انھوں نے سیاست اور سماجی خدمت کے گن سیکھے۔ ڈاکٹر رفیع احمد قدوائی کی انتہائی قابل قدر سوانح عمری لکھنے کا فخر ڈاکٹر ہاشم قدوائی کو حاصل ہوا۔ انھوں نے مولانا عبدالماجد دریابادی کے ہزاروں خطوط جمع کرکے انھیں تاریخ کا حصہ بنایا۔

ڈاکٹر ہاشم قدوائی نے کوئی 34 برس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں درس وتدریس کی خدمات انجام دیں۔ اس دوران انھوں نے اپنے شاگردوں کی ایک ایسی باشعور نسل کو پروان چڑھایا جس نے ملک وملت کی نمایاں خدمات انجام دیں۔ نائب صدر جمہوریہ محمد حامد انصاری ان کے انتہائی ہونہار شاگردوں میں شامل ہیں۔ ایک استاد کی حیثیت سے اپنے شاگردوں کے ساتھ وہ جس شفقت اور محبت کے ساتھ پیش آتے تھے اور زندگی بھر اس تعلق کو جس طرح نبھاتے رہے اس کی مثال شاذ ونادر ہی ملے

گی۔ انھوں نے تمام عمر اپنے اصولوں سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ جس چیز کو حق سمجھا اس کا برملا اظہار کیا اور جسے غلط سمجھا اس کی کھل کر مخالفت کی۔ ان کی زندگی مشعل راہ کی طرح تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے انتقال کے بعد ان کے شاگردوں نے خود کو یتیم تصور کیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں درس وتدریس کے دوران انھوں نے پراکٹر کی خدمات بھی انجام دیں اور طلبا کو ان کی نفسیات کے مطابق برتا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جن وسیع مقاصد کے تحت قائم کی گئی تھی اس کی انھوں نے بھرپور پیروی کی اور علی گڑھ تحریک کو آگے بڑھانے میں بھی حصہ لیا لیکن سرسید احمد خاں کے مذہبی نظریات سے انھیں جو اختلاف تھا اس کا انھوں نے برملا اظہار بھی کیا اور وہ ہمیشہ یہ کہتے رہے کہ سید احمد خاں کے مذہبی نظریات اسلام سے ہٹے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی ایک سچے قوم پرست مسلمان تھے۔ انھوں نے پوری زندگی ہر قسم کی فرقہ پرستی اور تنگ نظری کے خلاف جدوجہد کی۔ وہ ہندو اور مسلم دونوں ہی قسم کی فرقہ پرستی اور انتہا پسندی کے مخالف تھے۔ انھوں نے لکھنؤ میں زمانہ طالب علمی کے دوران مسلم لیگ کی تحریک کی مخالفت کی تھی۔ وطن اور مذہب سے متعلق ان کا نظریہ وہی تھا جو مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد کا تھا۔ یعنی جہاں وطن کی بات آتی تھی وہ پہلے بھی ہندوستانی ہوتے تھے اور بعد میں بھی ہندوستانی۔ لیکن جہاں مذہب کی بات آتی تھی وہ پہلے بھی مسلمان ہوتے تھے اور بعد میں بھی مسلمان۔ انھوں نے اسلام کی تاریخ کا بھرپور مطالعہ کیا تھا اور اس سے تمام عمر استفادہ بھی کیا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ مسلمانوں کی زبوں حالی اور پستی کا بڑا سبب اسلام سے دوری ہے۔ ان کی گفتگو بڑی نرم اور بامقصد ہوتی تھی۔ وہ الفاظ کا استعمال نہایت سوچ سمجھ کر اور موزوں انداز میں کرتے تھے۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی کی پیدائش 31 مارچ 1921 کو لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ وہ ایک اہم علمی خانوادے کے چشم وچراغ تھے۔ ان کے پردادا مفتی مظہر کریم کو پہلی جنگ آزادی میں حصہ لینے کی پاداش میں انڈومان جلاوطن کر دیا گیا تھا اور برطانوی حکومت نے انھیں عمر قید کی سزا سنائی تھی۔ ان کے دادا مولوی عبدالقادر فرنگی محل لکھنؤ کے فیض یافتہ تھے۔ انگریزی زبان سیکھ کر تحصیل دار مقرر ہوئے اور ترقی کرتے ہوئے ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز کیے گئے۔ ان کے والد عبدالمجید دریابادی ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز تھے جو نامور صحافی اور مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادی کے بڑے بھائی تھے۔ ان کے ایک اور بھائی حکیم عبدالقوی دریابادی نے برسوں مولانا عبدالماجد دریابادی کے اخبار 'صدق جدید' کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی نے بی اے، ایم اے کی تعلیم لکھنؤ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ان کی طالب علمی کا بیشتر حصہ لکھنؤ میں گزرا۔ انھوں نے طالب علمی کے زمانے میں تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ آزادی کے وقت ڈاکٹر ہاشم قدوائی کی عمر 26 سال تھی اور وہ ایک پختہ کار نوجوان کے طور پر نہایت سنگین حالات سے لوہا لے رہے تھے۔ انھوں نے جنگ آزادی کا نہ صرف خود مشاہدہ کیا بلکہ تقسیم کے نتیجے میں رونما ہونے والے خونیں واقعات کے بھی شاہد تھے۔

ان کی عملی زندگی کا بیشتر حصہ مادر علمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں گزرا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ملازمت کے دوران انھوں نے پی ایچ ڈی مکمل کی۔ اکتوبر 1948 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ سیاسیات میں بحیثیت لیکچرر ان کی تقرر ہوا اور مئی 1982 میں وہ یونیورسٹی سے سبکدوش ہوئے۔ یونیورسٹی میں ان کا شمار انتہائی نیک نام، فرض شناس، دیانت دار، محقق، منتظم اور مدبر استاد کے طور پر ہوتا تھا۔ ان کے سیکڑوں شاگرد ملک وبیرون ملک میں علم وادب، سیاست وصحافت اور دیگر شعبوں میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ مسلم یونیورسٹی سے سبکدوش ہونے کے بعد 1984 میں انھیں راجیہ سبھا کا ممبر نامزد کیا گیا۔ راجیہ سبھا کے رکن کے طور پر انھوں نے انتہائی فعال اور سرگرم زندگی گزاری۔ یوں تو وہ 1984 سے 1990 کے دوران 6 برس تک راجیہ سبھا کے ممبر رہے لیکن سیاسی اور سماجی امور سے ان کی گہری دلچسپی کا ہی اثر تھا کہ وہ راجیہ سبھا سے ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے انتقال سے چند ماہ قبل تک تقریباً روزانہ پارلیمنٹ آتے تھے اور یہاں کی انتہائی وقیع لائبریری سے بھرپور استفادہ کرتے تھے۔ سوائے ان دنوں کے جب وہ لکھنؤ، علی گڑھ یا جے پور کے سفر میں نہ ہو۔ انگریزی اخبارات کے نام اپنے خطوط وہ پارلیمنٹ میں ہی ٹائپ کراتے تھے اور پارلیمنٹ کے پوسٹ آفس سے ہی انھیں پوسٹ کرتے تھے۔ انھوں نے تمام عمر اپنے لیے کوئی گاڑی نہیں خریدی اور ہمیشہ پبلک ٹرانسپورٹ کا استعمال کیا۔ وہ ایک انتہائی شریف النفس، باوضع اور بے ریا انسان تھے۔ سیاسی امور پر ان کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ وہ کسی بھی الیکشن میں مختلف پارٹیوں کو ملنے والی نشستوں کی پیشین گوئی کر دیا کرتے تھے جو اکثر درست ثابت ہوتی تھی۔ ان کا تاریخی اور سیاسی شعور انتہائی پختہ تھا۔ انھوں نے سخت ترین حالات میں بھی اپنے نظریات اور اصولوں سے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ صبر واستقامت کا دامن کبھی نہیں چھوڑا۔ ڈاکٹر ہاشم قدوائی ہندوستان کی تہذیبی، ثقافتی اور سیاسی تاریخ پر گہری نظر رکھتے تھے۔ تاریخ اور شخصیات کے تجزیاتی مطالعے سے ان کو گہرا شغف تھا۔ وہ ایک مدبر، مفکر اور دانشور ہی نہیں تھے بلکہ اپنی زندگی میں انھوں نے اپنے علم اور مشاہدے سے جو کچھ حاصل کیا تھا اسے دوسروں تک منتقل کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔

ڈاکٹر ہاشم قدوائی ایک ایسے جرأت مند دانشور تھے جنھوں نے قومی اور ملی مسائل سے کبھی چشم پوشی نہیں کی۔ ان کا بہت بڑا وصف یہ تھا کہ وہ علمی، تاریخی اور مذہبی معاملات میں کسی بھی غلطی کو نظر انداز نہیں کرتے تھے اور اس کی اصلاح کرنا اپنا فرض اولین سمجھتے تھے۔ اس ضمن میں وہ بڑی سے بڑی شخصیت سے بھی مرعوب نہیں ہوتے تھے کیونکہ ان کا مطالعہ اور مشاہدہ بے داغ تھا۔ مرحوم اکثر صالح اقدار کی پامالی کا شکوہ کرتے تھے۔ حق کی نشان دہی سچائی کی طرف داری اور مظلوموں کی حمایت میں ان کا قلم کبھی مداہنت سے آلودہ نہیں ہوا۔ ان کا مطالعہ انتہائی وسیع تھا اور اردو اور انگریزی زبان میں ایک درجن سے زائد کتابیں اس کی گواہ ہیں۔ ڈاکٹر ہاشم قدوائی کی متعدد کتابوں میں جمہوریہ ہند کا دستور اساسی، اصول سیاسیات، اصول مدنیت، دنیا کی حکومتیں، مبادی سیاسیات، یوروپ کے عظیم مفکر، ہند جدید کے سیاسی وسماجی افکار، جدید فکر، رفیع احمد قدوائی، مکتوبات ماجدی (سات جلدیں) ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی کے تبصرے اور انگریزی زبان میں ان کی تازہ ترین تصنیف 'ایک قوم پرست مسلمان کی زندگی اور اس کا عہد، قابل ذکر ہیں۔ ان کی آخری دو کتابوں کا اجرا نائب صدر جمہوریہ محمد حامد انصاری کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ ان دونوں کتابوں کی تقریب اجراء میں نظامت کے فرائض ادا کرنے کے لیے ڈاکٹر ہاشم قدوائی نے راقم کا انتخاب کیا تھا۔ ان کی آخری کتاب The life and times of a Nationalist Muslim میں اولین وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو کے عہد تک کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک قوم پرست مسلمان کے طور پر جدوجہد سے لبریز ایسی بامقصد زندگی گزاری جس میں سیاست کی چمک دمک اور پرتعیش زندگی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

■

Masoom Moradabadi
Editor : Daily Jadid khabar
Z-103, Taj Enclave, Geeta Colony,
Delhi-110031

چراغ محبت

حیرت ہے تم رؤف رضا سے نہیں ملے

جاوید قمر

رؤف رضا سے پہلی ملاقات کب ہوئی اب تاریخ اور سال تو ذہن میں محفوظ نہیں ہے لیکن 1981 میں دہلی آنے کے کچھ عرصہ بعد ہی ان سے ملاقات ہوئی تھی اور یہ ملاقات سلیم شیرازی صاحب نے کروائی تھی۔ میں بیسویں صدی رسالہ سے وابستہ ہو چکا تھا ایک دن جب سلیم شیرازی ملے تو انھوں نے زور دیا کہ آج میں ان کے یہاں رک جاؤں اس طرح دہلی اور خاص طور پر فصیل بند شہر کے ادیبوں اور شاعروں سے ملاقات کی سبیل بھی پیدا ہوجائے گی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ رات میں سلیم بھائی مجھے لے کر سلیمان ہوٹل گئے تھے۔ ان دنوں وہاں کے مستقل آنے والوں میں ہیرالعل فلک ڈاکٹر افتخار علوی کاکوروی، قیصر حیدری، مختار عثمانی، افسر جمشید، سلیم شیرازی، طالب رامپوری، منیر ہمدم رؤف رضا سعید طارق، راشد کمال، ساحل ہمدانی، عاقل مرادآبادی، سلطان نظامی، قمر سنبھلی، شہباز ندیم ضیائی، ظفر تابش شامل تھے۔ اکثر دہلی کے دوسرے شعرا بھی وہاں آجاتے تھے۔ ان سب کے ہمراہ اقبال اشہر اور جاوید مشیری بھی اکثر ہوٹل آجاتے تھے۔

ہائے کیا دن تھے تب دہلی واقعی شعروادب کا گہوارہ ہوا کرتی تھی۔ جامع مسجد کے سامنے واقع اردو بازار بھی تب ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں سے بھرا رہتا تھا۔ یہ بھی ہوتا تھا کہ باہر کے جو شعرا دہلی کے مشاعروں میں آتے وہ بھی سلیمان ہوٹل آجایا کرتے تھے۔ اس تاریخی ہوٹل سے تھوڑے فاصلے پر جو سڑک مٹیا محل کے اندر جاتی ہے اس کے ایک کونے پر کشمیر ہوٹل بھی تھا۔ سلیمان ٹی اسٹال بند ہوتا تو دوستوں کا یہ گروپ جس میں عام طور پر افسر جمشید، منیر ہمدم، رؤف رضا، سلیم شیرازی، ظفر تابش اور چھوٹوں میں اقبال اشہر وجاوید مشیری شامل ہوتے کشمیر ہوٹل آتے اور پھر یہاں جو محفل جمتی وہ رات کے ڈھائی تین بجے تک جاری رہتی۔ کبھی کبھی مٹر گشتیاں بھی ہوتیں۔ لیکن یہ سب وقت گزاری کے لیے نہیں تھا بلکہ چائے کے دوران گفتگو کا آغاز جب ہوتا تو ادب کے ہر شعبہ پر سیر حاصل بحث ہوتی بعض اوقات یہ بحث کچھ اتنی شدید ہوجاتی کہ آوازیں، چیخ وپکار میں تبدیل ہوجاتیں۔ افسر جمشید مرحوم بڑی دلچسپ شخصیت کے حامل تھے۔ بنیادی طور پر وہ شاعر تھے مگر دہلی میں صحافت کررہے تھے۔ بلا کے ذہین اور گفتگو میں طاق۔ وہ کسی موضوع پر زبان کھولتے تو ایسا لگتا کہ علم کا دریا بہہ رہا ہے لیکن ان میں بہرحال ایک کمزوری تھی۔ وہ چاہتے یہ تھے کہ وہ جو کچھ کہیں دوسرے اس کو تسلیم کرلیں۔ کوئی سوال نہ کریں۔ منیر بھائی، سلیم بھائی اور رؤف رضا انھیں اکثر چھیڑا کرتے تھے اور ان کے صبر کا امتحان لینے کے لیے سوال بھی کردیا کرتے تھے۔ پہلے تو افسر صاحب دلیلوں سے اپنی بات کو درست ثابت کرنے کی کوشش کرتے لیکن اگر اس کے بعد بھی بات نہ بنتی اور کوئی نیا سوال داغ دیتا تو بھتے سے اکھڑ جاتے اور لاحول پڑھ کر محفل سے اٹھ جایا کرتے تھے۔ اس تعلق سے منیر ہمدم کا یہ تبصرہ بے حد دلچسپ ہوتا کہ افسر صاحب شیطان کو بھگانے کے لیے لاحول پڑھتے ہیں اور خود ہی بھاگ بھی جاتے ہیں۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ اگلی شام پھر افسر صاحب محفل میں موجود ہوتے اور ہر کسی سے کچھ اتنی اپنائیت اور محبت سے گفتگو کرتے کہ جیسے کل کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ منیر ہمدم اور رؤف رضا ایک دوسرے کے گہرے دوست تھے ان کی یہ دوستی ادبی حلقوں میں بھی مشہور تھی یہاں تک کہ مشاعروں اور نشستوں میں انھیں ایک ساتھ مدعو کیا جاتا تھا۔ ایک طرح وہ ایک جان دو قالب تھے۔ ان دنوں دہلی میں بانی، مخمور سعیدی، امیر قزلباش، زبیر رضوی اور کمار پاشی جیسے سینئر شعرا جہاں جدید رنگ میں شعر کہہ رہے تھے تو نوجوان نسل میں رؤف رضا اور منیر ہمدم جدید لب ولہجہ میں خوبصورت شاعری کررہے تھے۔ میں ان دنوں ذاکر نگر میں رہتا تھا مگر اب ہوتا یہ کہ سلیم بھائی کے اصرار پر اکثر ان کے کمرے پر ٹھہرنے لگا۔ یہی وہ عرصہ ہے جب رؤف بھائی کو میں نے قریب سے سمجھا اور پرکھا۔ جب بھی ملتے اپنی دل آویز مسکراہٹ سے استقبال کرتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان دنوں طارق سعید صاحب دہلی میں تھے اور غالباً وہ پہلی بار یہاں آئے ہوئے تھے (بعد میں تو وہ کچھ دن دہلی میں رہے بھی) اور اتفاق سے ان کا ٹھکانہ افسر جمشید کا کمرہ تھا۔ ہم کشمیری ٹی اسٹال پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اب یہ یاد نہیں کہ ظفر تابش اور اقبال اشہر تھے یا نہیں ہاں یہ ضرور یاد ہے کہ رؤف بھائی، منیر ہمدم، سلیم شیرازی، افسر جمشید صاحب اور طارق سعید موجود تھے۔ طے ہوا کہ سب شعر سنائیں چونکہ ان میں سب سے چھوٹا میں تھا اس لیے ابتدا مجھ سے ہوئی۔ میں نے ایک تازہ غزل کے اشعار سنائے اس میں ایک شعر تھا کہ

وہ روزگار کی راہیں تلاش کرتا اگر
تو پھر یہ طے ہے کبھی خودکشی نہیں کرتا

اس شعر کو سب نے سراہا، افسر صاحب نے اس شعر کی تشریح میں باقاعدہ ایک تقریر شروع کردی۔ اسی دوران طارق سعید نے کوئی ایسی بات کہہ دی جو افسر صاحب کو کچھ اتنی ناگوار گزری کہ جو چائے کا گلاس ان کے ہاتھ میں تھا اسے زمین پر غصہ سے دے مارا اور لاحول پڑھتے ہوئے چلے گئے۔ بعد میں دوستوں نے مل کر ان دونوں میں پھر دوستی کرادی۔ دراصل اس تفصیل سے میں یہ باور کرانا چاہتا ہوں کہ بھلے ہی ہم شب بیداریاں کررہے تھے لیکن یہ شب بیداریاں محض وقت گزاری کے لیے نہیں

تھیں بلکہ ان کے ذریعہ نوجوانوں کی ذہنی تربیت کا کام بھی ہو رہا تھا۔ اقبال اشہر کے بقول یہ چائے خانے نہیں تھے بلکہ ہماری تربیت گاہیں تھیں۔ چند برس بعد میں اس وقت کے انتہائی مقبول ہفت روزہ 'اخبار نو' سے وابستہ ہوگیا جس کے ایڈیٹر م۔افضل صاحب تھے۔ وہ ممبر پارلیمنٹ ہوئے تو اخبار کا دفتر بھی ساؤتھ ایونیو منتقل ہوگیا۔ چنانچہ اب میری ملاقاتیں رؤف بھائی اور دوسرے لوگوں سے کم ہونے لگیں۔ سلیم بھائی سے بھی ملاقاتوں کا وقفہ زیادہ ہوگیا۔ دور رہنے سے میں ادبی سرگرمیوں سے بھی تقریباً کٹ کر رہ گیا۔ 1997 میں مجھے سر میں درد رہنے لگا میں کچھ لکھتا یا پڑھتا تو چکر آنے لگتے تھے اور پسینہ پسینہ ہوجاتا۔ میں نے اپنا علاج کرایا اس دوران ڈاکٹروں نے مجھے دماغی کام کرنے سے منع کردیا۔ چنانچہ علاج کے بعد میں اپنے وطن واپس چلا گیا۔ یہ عرصہ طویل ہوگیا۔ گھر گیا تو زمین اور جائیداد کے تنازعات میں گھر گیا۔ میں چونکہ بھائیوں میں سب سے بڑا تھا اس لیے میرا وہاں رہنا ضروری ہوگیا۔ 2005 میں اپنے 14 سالہ بیٹے فراز کی اچانک موت کے بعد میں ٹوٹ کر رہ گیا۔ زندگی سے دلچسپی بھی میرے لیے ختم ہوچکی تھی۔ بکیل اتساہی صاحب کو میری اس کیفیت کا علم ہوا تو وہ مجھے زبردستی دہلی لے آئے۔ م۔افضل صاحب اس وقت ترکمانستان میں سفیر تھے اور دہلی آئے ہوئے تھے ایک تقریب میں ملاقات ہوئی تو انھوں نے ایک بار پھر 'اخبار نو' کی ذمہ داری سنبھالنے پر اصرار کیا۔ اس میں خاص طور پر بزرگ صحافی مودود صدیقی کی منشاء شامل تھی۔ اس طرح میں نے اخبار نو کو دوبارہ جوائن کرلیا اور افضل صاحب کے مکان میں ہی رہنے لگا۔ میرے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ رؤف بھائی نے سلیمان ٹی اسٹال کی روایت کو زندہ کر رکھا ہے۔ ایک روز میرے دوست جاوید مشیری رات گئے رؤف بھائی کو میرے کمرے پر لے آئے تو میں حیران رہ گیا۔ برسوں کے بعد ملاقات ہوئی تھی مجھے دیکھ کر رؤف بھائی بہت خوش ہوئے۔ یہ شکوہ بھی کیا کہ تمہیں واپس آئے اتنے دن ہوگئے اور اب تک نہیں ملے۔ اس طرح خلیل بھائی کے اس ہوٹل پر میری آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوا جہاں رؤف بھائی اپنی ایک دنیا آباد کیے بیٹھے رہا کرتے تھے۔ معمول کے مطابق وہ دوپہر کے کھانے کے بعد ہوٹل آتے اور اگر کوئی مہمان نہیں ہوتا تو عام طور پر تین اور چار کے درمیان اٹھ جاتے ان کی دوسری آمد رات 10 بجے ہوتی۔ یہاں کے مستقل آنے والوں میں ایوب بھائی، جاوید مشیری، تسلیم دانش تھے اب میں بھی ان کی صف میں شامل ہوگیا تھا۔ جب کبھی منیر ہمدم بھائی آجاتے تو اس محفل میں چار چاند لگ جاتے۔ اقبال اشہر چونکہ اب باہری دہلی میں رہ رہے ہیں اور ان کے پاس مشاعروں کی بھی مصروفیت ہے اس لیے وہ روز نہیں آتے تھے لیکن ہفتہ دس دن میں وہ آتے ضرور تھے اور جب آجاتے تو گھنٹوں بیٹھا کرتے تھے۔ سلیمان ہوٹل کی طرح خلیل بھائی کا ہوٹل بھی ادبی حلقوں میں مشہور ہوچکا تھا چنانچہ باہر سے جو شعراء دہلی آتے ان میں سے اکثر یہاں کا بھی رخ کرتے۔ راحت اندوری اور منظر بھوپالی سے لے کر عزم شاکری، عادل رشید اور شاہد انجم تک موقع نکال کر اکثر یہاں آجاتے تھے اور رؤف بھائی اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ سب کی چائے سے ضیافت کرتے تھے۔ مستقل آنے والوں میں نعمان شوق، ملک زادہ جاوید اور معین شاداب بھی شامل تھے۔ پچھلے چند برسوں کے دوران میں رؤف بھائی کے بے حد قریب آچکا تھا۔ میرا آفس رام لیلا میدان سے تھوڑا آگے ماتا سندری روڈ ڈی ڈی اے فلیٹس میں واقع ہے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ دفتر کے لیے کچھ پہلے نکلتا اور ہوٹل پہنچ جاتا اور رات میں بھی واپس ہوتے ہوئے سیدھے ہوٹل کا رخ کرتا جہاں عام طور پر رؤف بھائی انتظار کر رہے ہوتے۔ ان سے ملاقات ہوتی تو دن بھر کی تھکن اتر جاتی اور ذہن تازہ ہوجاتا۔ اقبال اشہر ہوں، جاوید مشیری، تسلیم دانش یا میں۔ ہر ملاقات میں رؤف بھائی کا سب سے یہی سوال ہوتا۔ کچھ نیا ہوا؟ جواب نفی میں ہوتا تو کہتے کہ یہ اچھی بات نہیں ہے فکر کا سوتا خشک نہ ہونے دو۔ کچھ نہ کچھ کہتے رہا کرو۔ یہ ان کی تحریک کا ہی نتیجہ ہے کہ پچھلے کچھ برسوں کے دوران میں نے ڈھیر ساری غزلیں اور گیت کہہ ڈالے۔ وہ بہت خوبصورت نظمیں بھی کہتے تھے لیکن ان کا اصل میدان غزل تھا۔ ادھر تو وہ خوب کہہ رہے تھے اور نئی نئی زمینوں میں تجربے بھی کر رہے تھے۔

نئے لکھنے والوں میں ان کا رنگ سب سے جدا اور انوکھا تھا۔ مشکل ترکیبوں سے اجتناب کرتے ہوئے وہ سیدھے سادے لفظوں میں اپنی بات کہنے کے عادی تھے۔ ان کے یہاں روایت سے انحراف نہیں تھا۔ بلکہ وہ جدید رنگ میں روایت کا رنگ شامل کرکے شعر کا لطف دو آتشہ کردیا کرتے تھے۔ وہ بنی بنائی ڈگر پر چلنے کے عادی نہیں تھے بلکہ اپنے شعری سفر کے لیے ایک نئی راہ نکالنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کے اولین شعری مجموعہ 'دستکیں میری' کی ادبی حلقوں میں زبردست پذیرائی ہوئی تھی۔ ان کے کچھ اشعار کے تیور دیکھیے۔

نشانہ باندھومیاں روح تک تو بہتر ہے
بدن جواب نہ دے گا بدن تو پتھر ہے
جہاں بھی جاؤ گے رنگین ہو کے نکلو گے
سفر بھی گیلی زمیں کا گھٹا بھی سر پہ ہے
یہاں پردیس میں نیندوں کی بڑی قلت ہے
اگلے پیغام میں کچھ خواب روانہ کرنا

یا پھر یہ سادہ شعر دیکھیے۔

وہ یہ کہتے ہیں صدا ہو تو تمہارے جیسی
اس کا مطلب تو یہی ہے کہ پکارے جاؤ
آپ جو چاہیں تو میں ہاتھ بنا سکتا ہوں
یہ جو آنسو ہیں انھیں جگنو بنا سکتا ہوں
ایک گلدان ہے اک میرا قلم ایک گلوب
میں اسی میز کو بازار بنا سکتا ہوں

اور یہ شعر۔

ختم ہونا نہیں پھولوں کا سفر
روز اک شاخ ہلا دیتا ہوں

ان اشعار میں نہ تو مشکل ترکیبیں ہیں اور نہ ہی ایسی علامتیں جو عام قاری کی دسترس سے دور ہوں اس کے باوجود ان اشعار میں ایک طرح کا نیا پن ہے اور یہ نیا پن ہی ان کی شعری شناخت تھی۔ ادھر تو وہ کچھ اتنی سرعت سے شعر کہہ رہے تھے جیسے انھیں کہیں جانے کی جلدی ہو اس لیے ان کے دل و دماغ میں جو کچھ تھا وہ اسے کاغذ پر اتار دینا چاہ رہے تھے۔ ان کا تخلیقی سفر اپنے شباب پر تھا۔

ممتاز شاعر فرحت احساس کے لفظوں میں رؤف بھائی بھری بہار میں رخصت ہوگئے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ گیتوں کے بارے میں بھی ان کی معلومات بہت وسیع تھی۔ ملک کے مختلف علاقوں اور خطوں میں گائے جانے والے لوک گیت ہوں یا اردو میں کہے گئے گیت سب پر ان کی گہری نگاہ تھی۔ ایک بار انھوں نے کہا کہ جاوید کچھ اس طرح کا گیت لکھو جو آج کے زمانے سے ہم آہنگ ہو لیکن ہو عورت کی زبان میں اور اس میں وہی رنگ ہو جو عام طور پر دیہی گیتوں میں ہوتا ہے۔ ان کے بار بار اکسانے پر میں نے ایک گیت کہا اور انھیں سنایا تو بہت تعریف کی اور کہا کہ میں جیسا چاہتا تھا یہ ویسا ہی گیت ہے۔ ان کے اصرار پر میں نے اسے فیس بک پر پوسٹ بھی کیا جسے لوگوں نے بے حد پسند بھی کیا ایک ملاقات میں قبلہ بکیل اتساہی کو جب میں نے اپنا یہ گیت سنایا تو وہ نہ صرف خوش ہوئے بلکہ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر ڈھیر ساری دعائیں بھی دیں۔ سوشل میڈیا کو رؤف بھائی بڑی اہمیت دیتے تھے۔ کہتے تھے کہ لوگوں تک رسائی کا یہ اب سب سے بڑا

ذریعہ ہے۔ وہ خود بھی سوشل میڈیا پر بہت سرگرم تھے اور دوستوں کو بھی اس کی ترغیب دیتے تھے۔ منیر ہمدم بھائی ایک خاموش طبع انسان ہیں۔ شہرت ومقبولیت اور چھپنے چھپانے سے انھیں بھی رؤف بھائی کی طرح کوئی دلچسپی نہیں ہے رؤف بھائی انھیں بھی مسلسل اکساتے رہے کہ وہ بھی اپنا فیس بک اکاؤنٹ بنائیں اور وہ مسلسل ٹال رہے تھے بالآخر ابھی سال بھر پہلے رؤف بھائی کے مسلسل اصرار پر وہ بھی فیس بک پر آگئے لیکن وہ رؤف بھائی کی طرح متحرک نہیں ہیں۔

یہ بات بہت سوں کے علم میں ہے کہ اپنی خانگی ذمہ داریوں کے باعث انہوں نے کچھ عرصہ کے لیے خود کو شاعری سے الگ کرلیا تھا اور اپنے کاروبار میں لگ گئے تھے۔ انھوں نے بہت خوبصورتی اور کامیابی سے اپنی خانگی ذمہ داریوں کو ادا کیا۔ چار بیٹیوں کی شادیاں کیں پھر جب اکلوتے بیٹے نے بڑے ہوکر کاروبار سنبھال لیا تو وہ مطمئن ہوگئے۔ انھیں دل کی بیماری لگ چکی تھی اور اب سے 20 برس قبل انہوں نے ایک آپریشن بھی کرایا تھا لیکن انھیں دیکھ کر نہیں لگتا تھا کہ وہ دل کے مریض ہیں۔ وہ پرہیز بھی کررہے تھے اور وقت وقت پر اپنی جانچ بھی کروارہے تھے وہ ایک زندہ دل انسان تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ حضرت دل کو انھوں نے ہمیشہ اپنے قابو میں رکھا۔ البتہ شوگر کی بیماری نے انھیں کسی قدر کمزور ضرور کردیا تھا۔ دوستوں کے ساتھ کبھی کبھی وہ بدپرہیزیاں بھی کرلیا کرتے تھے۔

یکم دسمبر کو مجھے شام میں جب یہ روح فرسا خبر ملی کہ قبلہ بیکل اتساہی صاحب سخت علیل ہیں اور رام منوہر لوہیا اسپتال کے آئی سی یو میں داخل ہیں تو میں نے ان کی صاحبزادی ڈاکٹر صوفیہ اور داماد شاہد خان سے فون پر رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ بڑی دیر کی کوشش کے بعد میری شاہد بھائی سے بات ہوئی اور جو کچھ انھوں نے بیکل صاحب کے بارے میں بتایا سن کر میرے اوسان خطا ہوگئے پھر میں نے کپکپاتے ہاتھوں سے دل کڑا کرکے فیس بک پر ایک پوسٹ کی جس میں دوستوں سے بیکل صاحب کی صحت یابی کے لیے دعا کی اپیل کی۔ وہ پوسٹ جیسے ہی رؤف بھائی کی نظر سے گزری انہوں نے مجھے فون کیا۔ کیونکہ انھیں بیکل صاحب سے میری ذہنی وابستگی اور عقیدت کا علم تھا میں نے تفصیل بتائی تو مجھے حوصلہ دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ گھبراؤ نہیں اللہ فضل کرے گا۔ میرا دل آفس میں نہیں لگ رہا تھا کسی طرح اخبار کا کام نمٹا کر ہوٹل جانے کے بجائے میں اپنے دوست سلیم صدیقی کے اسکوٹر سے سیدھے اپنے کمرے جا پہنچا۔ ابھی میں کمرے کے اندر داخل ہی ہوا تھا کہ رؤف بھائی کا فون آگیا انہوں نے پوچھا۔ کیا دفتر سے نکلے؟ میں نے جب بتایا کہ میں تو سیدھے گھر آگیا تو رؤف بھائی کا جملہ تھا۔ یار میں تو ہوٹل میں تمہارا انتظار کررہا تھا۔ مجھے معلوم ہے تم ذہنی طور پر بہت پریشان ہوگے۔ ہوٹل آجاؤ کچھ طبیعت تو بہلے گی اور میں الٹے پاؤں ہوٹل جا پہنچا۔ وہاں رؤف بھائی اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے البتہ روز کے آنے والوں میں ایک حاجی محمد رفیع صاحب ان کے ساتھ تھے۔ عام طور پر ہر روز اس وقت ان کے پاس ایوب بھائی تسلیم دانش اور جاوید مشیری بیٹھے ہوتے تھے۔ مگر اس روز یہ لوگ جانے کہاں تھے۔ میں پہنچا تو رؤف بھائی کھل اٹھے انھوں نے چائے کا آرڈر دیا اور مجھ سے گفتگو کرنے لگے۔ میں چونکہ بیکل صاحب کی شدید علالت کی خبر سے ذہنی طور پر ڈسٹرب تھا اس لیے میرا لہجہ اس روز قدرے مضمحل تھا۔ رؤف بھائی نے شاید میری اس کیفیت کو محسوس کیا چنانچہ وہ ایک طرح سے میری دلجوئی کرنے لگے۔ اتنا ہشاش بشاش انھیں میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ چائے کی چسکیوں کے درمیان انھوں نے پوچھا کہ کیا میں نے ان کی آج کی پوسٹ دیکھی۔ میں نے کہا کہ نہ صرف دیکھی بلکہ اس پر کمنٹ بھی کیا ہے تو پوچھنے لگے۔ شعر کیسا ہے؟ میں نے جب کہا کہ خوبصورت اور آپ کے اپنے رنگ کا شعر ہے تو خوش ہوئے اور بولے سنو اس کا مطلع بھی ہوگیا ہے۔

پھولوں بھری زمیں ہو اور آسماں بھی ہو
دونوں کے بیچ وبیچ میرا لامکاں بھی ہو

میں نے داد دی تو مسکرائے اور بولے تم کو تو میرا ہر شعر اچھا لگتا ہے۔ اس پر میں نے کہا کہ رؤف بھائی واقعی بہت اچھا شعر ہے۔ اب انھوں نے بات کا رخ بدل دیا۔ کہنے لگے کئی دن سے تم نے کچھ نیا نہیں سنایا۔ کچھ کہا تو ضرور ہوگا۔ پہلے تو میں نے انکار کیا لیکن رؤف بھائی کی محبت کے آگے میں نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس روز کچھ نئے شعر بلکہ مکمل غزل کئی دن کے بعد کہی تھی میں نے سنادی۔ حسب معمول انھوں نے میری حوصلہ افزائی کی بلکہ ایک شعر کو تو انھوں نے کئی بار سنا اور اسے گنگنایا بھی۔ رؤف بھائی کی یہ عادت تھی جب موڈ میں ہوتے تو کبھی اپنے کبھی دوسروں کے شعر گنگنانے لگتے۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ گویا ہوئے۔ لو جاوید اب مقطع کا شعر بھی ہوگیا ہے۔

حیرت ہے تم رؤف رضا سے نہیں ملے
اب لوٹ آؤ دلی کو چاہے جہاں بھی ہو

پہلے حیرت کی جگہ انھوں نے افسوس کہا تھا۔ میں نے داد دی تو کرید کرید کر پوچھا۔ ٹھیک ہے؟ میں نے شعر کی تعریف کی تو خوش ہوئے۔ تب تک رات کے سوا گیارہ بج چکے تھے میں نے اجازت چاہی تو پلٹ کر پشت کی دیوار پر ٹنگی گھڑی کو دیکھ کر بولے ہاں وقت تیزی سے بھاگ رہا ہے۔ اس وقت تو ہم اس جملہ کا مفہوم نہیں سمجھ سکے تھے لیکن اب ان کے بعد یہ بات سمجھ میں آرہی ہے کہ انھوں نے بے اختیار یہ جملہ کیوں کہا تھا وہ پھر بولے۔ ٹھیک ہے آخری چائے تو پی لو۔ چنانچہ رات کے تقریباً 11:30 بجے ہم دونوں ہوٹل سے نکلے گلی سے سڑک تک ساتھ آکر جب ہم جدا ہونے لگے تو انھوں نے میرا شانہ تھپتھپا کر صبر کی تلقین کی اور بولے کہ کل اگر وقت ملا تو میں بھی بیکل صاحب کو دیکھنے چلوں گا لیکن یہ وقت کبھی نہیں آیا۔ صبح ہی وہ ہم سب کو چھوڑ کر وہاں چلے گئے جہاں ہم میں سے ہر ایک کو ایک نہ ایک دن جانا ہے۔

انوکھی چمک اس کے چہرے پہ تھی
مجھے کیا خبر تھی کہ مر جائے گا

اب وہ نہیں ہیں تو ان کے ہونے کی اہمیت سمجھ میں آرہی ہے۔ جب سے وہ گئے ہیں ایک بھی شعر نہیں کہہ سکا ہوں۔ اس لیے کہ اب تحریک دینے اور کریدنے والا نہیں رہا۔ انہوں نے خلیل بھائی کے ہوٹل کے ایک کونے میں جو ایک ادبی کنبہ تیار کیا تھا اب بکھر چکا ہے۔ وہ جس طرح اچانک گئے اس کا صدمہ ان کے تمام چاہنے والوں کو ہے۔ اس روز غالب انسٹی ٹیوٹ کی تعزیتی نشست میں ہر وہ شخص جو مائک تک آتا تھا پھوٹ پڑتا تھا۔ منیر ہمدم بھائی، اقبال اشہر، معین شاداب، جاوید مشیری، شکیل جمالی، رؤف بھائی کو لفظوں کا نہیں آنسوؤں کا خراج پیش کررہے تھے۔ نشست میں بھائی سلیم اور خلیل بھائی نم آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ خلیل بھائی کو بھی شدید دکھ ہے کہ ان کا ہوٹل محض ایک شخص کے نہ ہونے سے کتنا ویران ہوگیا۔ اس دوران کئی مرتبہ بے اختیار میں ہوٹل گیا ضرور مگر جب اس مخصوص کونہ پر نظر پڑی جہاں رؤف بھائی بیٹھا کرتے تھے تو دل بے قابو ہوگیا۔ خلیل بھائی نے ہر مرتبہ چائے کے لیے اصرار کیا لیکن میں وہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکا۔ رؤف بھائی آپ ہمیں اس قدر تنہا کرگئے ہیں کہ اگر بھیڑ میں بھی ہوتے ہیں تو لگتا کہ تنہا ہیں۔ جاتے ہوئے آپ اپنے اس شعر کو سچ کرگئے۔

یوں ہی ہنستے ہوئے چھوڑیں گے غزل کی محفل
ایک آنسو سے زیادہ کوئی رونے کا نہیں

■

Javed Qamar, 1734 Kucha Dakni Rai, Pataudi House, Darya Ganj, New Delhi - 110002
Mob.:9540770010
Email.: javedqamar186@gmail.com

کمپیوٹر کی بناوٹ
(Structure of Computer)

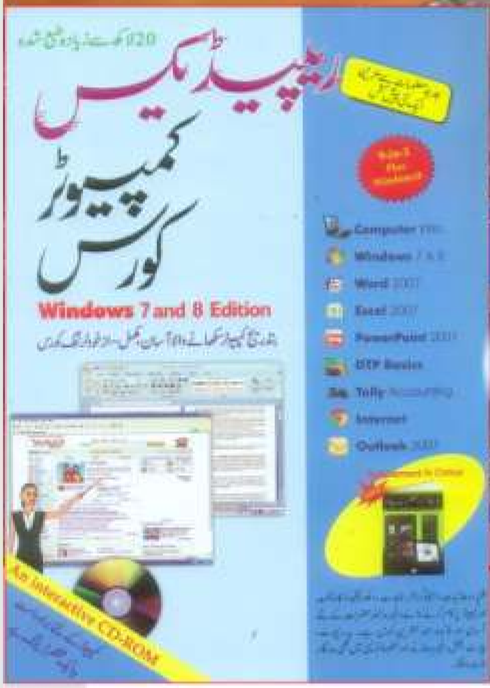

جس طرح سے ہر مشین کے الگ الگ پرزے ہوتے ہیں، اسی طرح کمپیوٹر بھی الگ الگ پرزوں یا حصوں سے مل کر بنتا ہے۔ ان حصوں کے الگ الگ کام ہوتے ہیں۔ کمپیوٹر چاہے چھوٹا ہو یا بڑا، نیا ہو یا پرانا، اس کے پانچ اہم حصے ہوتے ہیں۔ ان پٹ، آؤٹ پٹ، پروسیسر، میموری اور پروگرام۔ ان سبھی حصوں کے آپسی تعلق کو تصویر C-2.1 میں دکھایا گیا ہے۔ ان کے بارے میں آگے تفصیل سے بتایا گیا ہے:

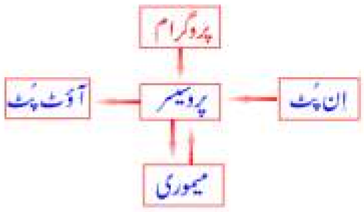

تصویر C-2.1: کمپیوٹر کے اہم حصے

پروسیسر (Processor)

کمپیوٹر میں جو بھی کام کیے جاتے ہیں، انھیں کرنے والے حصے یا مشین کو 'پروسیسر' کہا جاتا ہے۔ پروسیسر کو کمپیوٹر میں وہی مقام حاصل ہے، جو ہمارے جسم میں دماغ کو۔ گویا کہ پروسیسر ہی کمپیوٹر کا دماغ ہے۔ کمپیوٹر کے باقی حصے اس کی مدد کرتے ہیں۔ اس کا کام ہے۔ کسی شخص (یا استعمال کرنے والے) کے ذریعے دی گئی ہدایات کو سمجھ کر ان پر صحیح صحیح عمل کرنا، جوڑنا، گھٹانا وغیرہ حسابی کام کرنا، دو اعداد کا موازنہ (Comparison) کرنا اور کسی خاص بات یا شرط (Condition) کی جانچ کرنا۔ یہ سارے کام پروسیسر کے ذریعے ہی انجام دیے جاتے ہیں۔

پروسیسر کو عام طور پر سنٹرل پروسیسنگ یونٹ (Central Processing Unit) یا سی پی یو (CPU) کہا جاتا ہے۔ اس کے تین حصے ہوتے ہیں۔ میموری، اے ایل یو اور کنٹرول۔ میموری کمپیوٹر کی اندرونی میموری (Internal Memory) ہوتی ہے۔ اس میں کسی بھی وقت کیے جا رہے کام سے متعلق ڈاٹا ضرورت کے وقت تک رکھا جاتا ہے۔ یہ میموری ویسے تو پروسیسر کا ہی حصہ ہے، لیکن اس کی بہت زیادہ اہمیت ہے، اس لیے ہم اس کے بارے میں الگ سے تفصیل سے پڑھیں گے۔ اے ایل یو (Arithmetic Logic Unit) میں ہر قسم کا حساب اور موازنہ کیا جاتا ہے۔ کنٹرول (Control) میں اکائی کا کام ہوتا ہے۔ ہماری ہدایات کو سمجھ کر ان پر صحیح صحیح عمل کرانا اور کمپیوٹر کے سبھی حصوں پر نظر رکھنا اور انھیں کنٹرول کرنا۔

چھوٹے کمپیوٹر، جیسے مائکرو کمپیوٹر، پی سی وغیرہ میں پروسیسر یا سی پی یو کو مائکرو پروسیسر (Micro Processor) کہا جاتا ہے۔ یہ کتاب بنیادی طور پر چھوٹے یا پرسنل کمپیوٹر (پی سی) اور ان پر چلائے جانے والے سوفٹ ویئر کے بارے میں ہے، اس لیے ہم اس پوری کتاب میں پروسیسر کو 'مائکرو پروسیسر' ہی کہیں گے۔ کوئی مائکرو پروسیسر اپنے آپ میں ایک پورا کمپیوٹر ہوتا ہے، جس میں ہر قسم کے کاموں کے لیے الیکٹرانک سرکٹ بنے ہوتے ہیں۔ آج کل انٹیل کمپنی کے مائکرو پروسیسر ہر جگہ دستیاب اور کافی مقبول ہیں۔

میموری (Memory)

جس طرح ہم اپنے ذہن (Memory) میں بہت سی باتیں یاد رکھتے ہیں، اسی طرح کمپیوٹر کے جس حصے میں بھی ڈاٹا، پروگرام وغیرہ رکھے جاتے ہیں، اسے کمپیوٹر کی میموری کہتے ہیں۔ حالانکہ انسان کے دماغ اور کمپیوٹر کی میموری میں بہت فرق ہے۔

کمپیوٹر کی میموری لاکھوں چھوٹے چھوٹے خانوں میں بٹی ہوتی ہے۔ اس قسم کے ہر خانہ کو ایک لوکیشن (Location) یا بائٹ (Byte) کہا جاتا ہے۔ جس طرح مکانوں پر نمبر پڑے ہوتے ہیں، اسی طرح میموری کی بائٹ پر نمبر شمار (سیریل نمبر) پڑے ہوئے مانے جاتے ہیں۔ کسی بائٹ کے نمبر شمار کو اس بائٹ کا پتہ (Address) کہا جاتا ہے۔

ہر بائٹ 8 چھوٹی چھوٹی بٹ (Bits) کا ایک سلسلہ (Series) ہوتی ہے۔ میموری کا سب سے چھوٹا حصہ (یا ٹکڑا) بٹ (Bit) کہلاتا ہے۔ بٹ کو آپ ایک چھوٹا بلب مان سکتے ہیں۔ جس طرح کوئی بلب یا تو جل رہا ہوتا ہے یا بجھا ہوتا ہے، اسی طرح کوئی بٹ یا تو آن (On) ہوتی ہے یا آف (Off)۔ اس طرح ہر بٹ کی دو حالت ہو سکتی ہے۔ 'آن' یا 'آف'۔ اس کے علاوہ کوئی تیسری حالت نہیں ہو سکتی۔ اپنی آسانی کے لیے ہم آن بٹ کو '1' لکھتے ہیں اور آف بٹ کو '0' لکھتے ہیں۔

کمپیوٹر کے اندر داخل کیا جانے والا ہر قسم کا ڈاٹا 1 اور 0 کی شکل میں ہی کمپیوٹر کی میموری میں رکھا جاتا ہے اور اسی شکل میں اس پر سارا کام کیا جاتا ہے۔ کام کرنے کے اس طریقے کو بائنری سسٹم (Binary System) کہا جاتا ہے۔ کمپیوٹر کا سارا کام بائنری میں ہی چلتا ہے۔ اس کے بارے میں آپ آگے پڑھیں گے۔

کسی کمپیوٹر کی میموری کا سائز بائٹ کے عدد میں ناپا جاتا ہے۔ کمپیوٹر کی میموری جتنی بڑی ہوتی ہے، وہ اتنا ہی تیز اور طاقتور (Powerful) مانا جاتا ہے۔ 1024 کو ایک کلو بائٹ (Kilobyte) یا کے بی (KB) کہتے ہیں۔ 1024 کلو بائٹ کو ایک میگا بائٹ (Megabyte) یا ایم بی (MB) کہا جاتا ہے۔ 1024 میگا بائٹ کو ایک گیگا بائٹ

(Gigabyte) یا جی بی (GB) کہتے ہیں۔ کمپیوٹر کی میموری عموماً میگا بائٹ یا گیگا بائٹ میں ناپی جاتی ہے۔

کمپیوٹر کی میموری دو قسم کی ہوتی ہے:

(الف) اندرونی (Internal) یا بنیادی (Main) میموری

(ب) باہری (External) یا معاون (Auxiliary) میموری

اندرونی یا بنیادی میموری کمپیوٹر کے سی پی یو کا ہی ایک حصہ ہوتی ہے۔ کسی عام مائکرو کمپیوٹر یا پی سی کی بنیادی میموری کا سائز ایک گیگا بائٹ سے 4 گیگا بائٹ تک ہوتا ہے۔

باہری یا معاون میموری ڈاٹا کو لمبے عرصے تک کے لیے مستقل طور پر جمع (Store) کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ یہ کمپیوٹر کے سی پی یو سے باہر ہوتی ہے۔ اس کا سائز سیکڑوں ہزاروں میگا بائٹ اور گیگا بائٹ میں ہوسکتا ہے۔ اس کے بارے میں ہم آپ کو آگے بتائیں گے۔

بنیادی میموری کو بھی دو حصوں میں بانٹا جاتا ہے۔ ریم (RAM) اور روم (ROM)۔ ریم کا پورا نام 'رینڈم ایکسس میموری' (Random Access Memory) ہے، جس کا مطلب ہے کہ اس میموری کو ہم اپنی خواہش کے مطابق جیسے چاہیں، ویسے استعمال کر سکتے ہیں۔ دراصل، اس میں ایسے ڈاٹا اور پروگرام کو رکھا جاتا ہے، جنھیں تھوڑے وقت تک رکھنا ہو۔ یہ ڈاٹا تب تک وہیں بنا رہتا ہے، جب تک اس کی جگہ پر کوئی دوسرا ڈاٹا نہیں رکھ دیا جاتا یا کمپیوٹر بند نہیں کر دیا جاتا۔ کمپیوٹر بند (Off) ہوجانے پر ریم میں رکھا ہوا سارا ڈاٹا غائب ہوجاتا ہے۔

روم کا پورا نام ہے 'ریڈ آنلی میموری' (Read Only Memory)، جس کا مطلب ہے کہ اس حصے میں رکھے ڈاٹا کو ہم صرف پڑھ سکتے ہیں۔ درحقیقت، اس حصے میں کمپیوٹر بنانے والی کمپنی کے ذریعے ایسی اطلاعات، ڈاٹا اور پروگرام رکھے جاتے ہیں، جن کی ہمیں زیادہ تر اور روز ضرورت پڑتی ہے۔ روم میں رکھے ڈاٹا کو نہ تو ہم ہٹا سکتے ہیں اور نہ ہی اس میں کوئی رد و بدل کر سکتے ہیں۔ کمپیوٹر کی بجلی بند ہوجانے پر بھی روم میں رکھا ہوا ڈاٹا محفوظ رہتا ہے۔

ان پٹ (Input)

ان پٹ کمپیوٹر کا وہ حصہ ہے، جس کے ذریعے ہم اپنا ڈاٹا یا حکم یا پروگرام کمپیوٹر کو دیتے ہیں۔ ان پٹ اکائی میں کئی مشینیں یا آلات (Devices) ہوسکتے ہیں، جن سے الگ الگ طرح کا ان پٹ (ڈاٹا یا حکم) کمپیوٹر کو دیا جاسکتا ہے۔ ان پٹ کا سب سے اچھا آلہ ہے 'کی بورڈ' (Keyboard)۔ یہ انگریزی کے عام ٹائپ رائٹر کے کی بورڈ جیسا ہی ہوتا ہے، حالانکہ اس میں کچھ زیادہ بٹن ہوتے ہیں۔ ہم اس میں لگے بٹنوں کو دبا دبا کر اپنا ڈاٹا تیار کرتے ہیں اور کمپیوٹر میں بھیج دیتے ہیں۔

کی بورڈ کے علاوہ ماؤس (Mouse)، جوائے اسٹک (Joy Stick)، لائٹ پین (Light Pen)، مائک (Mike)، اسکینر (Scanner) وغیرہ بھی ان پٹ کے آلات ہیں۔ ان کے بارے میں ہم آپ کو آگے بتائیں گے۔

آؤٹ پٹ (Output)

آؤٹ پٹ کمپیوٹر کے اس حصے کو کہتے ہیں، جس میں ہمیں اپنے حکم یا پروگرام کا نتیجہ (Result) یا جواب حاصل ہوتا ہے۔ آؤٹ پٹ میں کئی مشینیں یا آلات ہوسکتے ہیں، جن سے ہمیں الگ الگ طرح کا آؤٹ پٹ ملتا ہے۔ آؤٹ پٹ کا سب سے زیادہ آسان اور ہر جگہ پایا جانے والا آلہ ہے۔ وی ڈی یو (Visual Display Unit) یا مانیٹر (Monitor)۔ یہ کسی ٹیلی ویژن جیسا ہوتا ہے، جس کے پردے (Screen) پر نشانات یا معلومات دکھائی دیتی ہیں۔ اطلاعات یا رپورٹوں کو چھاپنے کے لیے کئی قسم کے پرنٹر (Printer) اور پلاٹر (Plotter) ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ اسپیکر (Speaker) بھی آؤٹ پٹ کا ایک آلہ ہے۔ ان کے بارے میں آپ آگے پڑھیں گے۔

وی ڈی یو اور کی۔ بورڈ کو ملا کر ایک ایسا آلہ بنتا ہے، جس سے ہم ان پٹ اور آؤٹ پٹ دونوں کا کام لے سکتے ہیں۔ اسے ٹرمنل (Terminal) کہا جاتا ہے۔ ان پٹ۔ آؤٹ پٹ کے لیے ٹرمنل سے زیادہ آسان اور اچھا آلہ دوسرا نہیں ہے۔ دنیا بھر میں تقریباً ہر کمپیوٹر میں ٹرمنل ضرور ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں ہم آپ کو آگے تفصیل سے بتائیں گے۔

پروگرام (Program)

ہدایات کے کسی مجموعہ (Group) کو پروگرام کہتے ہیں۔ یہ ہدایتیں اس طرح لکھی جاتی ہیں کہ اگر کوئی شخص ان پر ٹھیک ٹھیک عمل کرتا جائے، تو کوئی بھی کام پورا ہوجائے۔ کمپیوٹر، جو سیکڑوں قسم کے کام کرتا ہے، وہ درحقیقت پروگرام کے ذریعے ہی کرائے جاتے ہیں۔ ہر کام کے لیے ایک الگ پروگرام لکھا جاتا ہے۔ پروگرام سے ہی کمپیوٹر کو طاقت ملتی ہے۔ پروگرام کے بغیر کمپیوٹر صرف چند پرزوں کا مجموعہ ہے۔ بغیر پروگرام کے کمپیوٹر کوئی کام نہیں کرسکتا۔

کمپیوٹر کی اقسام (Types of Computers)

سائز اور سہولیات کی بنیاد پر کمپیوٹر عام طور پر تین قسم کے ہوتے ہیں:

(1) مین فریم کمپیوٹر (Mainframe Computer)

(2) منی کمپیوٹر (Mini Computer)

(3) مائکرو کمپیوٹر (Micro Computer)

مین فریم یا بنیادی کمپیوٹر سائز میں بہت بڑے اور کافی جگہ گھیرنے والے ہوتے ہیں۔ ان میں سیکڑوں ٹرمنل جڑے ہوتے ہیں۔ ان پر ایک ساتھ سیکڑوں لوگ کام کرسکتے ہیں۔ ان کی قیمت بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے بڑی بڑی کمپنیاں ہی انھیں خرید سکتی ہیں۔ آج کل ایسے کمپیوٹر کی تعداد بہت کم رہ گئی ہے۔

منی کمپیوٹر سائز میں مین فریم کمپیوٹر سے چھوٹے ہوتے ہیں، لیکن ان کی طاقت مین فریم کمپیوٹر سے بہت کم نہیں ہوتی۔ دراصل، منی کمپیوٹر ایسی کمپنیوں کے لیے بنائے گئے ہیں، جن کے پاس کمپیوٹر کا کافی کام ہوتا ہے، لیکن وہ مین فریم کمپیوٹر نہیں خرید سکتیں۔ منی کمپیوٹر کی قیمت کمپنیوں کی پہنچ کے اندر ہوتی ہے۔ ان پر ایک ساتھ 10 سے 12 آدمی کام کرسکتے ہیں۔ یہ ایک چھوٹے کمرے میں آجاتے ہیں۔ منی کمپیوٹر ایسا ہر کام کرسکتے ہیں، جو مین فریم کمپیوٹر پر کیا جاسکتا ہے۔ آج کل منی کمپیوٹر کی تعداد بہت ہے۔

1980 کے بعد کے برسوں میں ایسی تکنیکیں آئی ہیں، جن سے کمپیوٹر کا سائز اور بھی چھوٹا ہوگیا ہے، ساتھ ہی ان کی رفتار بھی بڑھ گئی ہے۔ اس سے مائکرو کمپیوٹر سامنے آئے۔ ان کی قیمت منی کمپیوٹر کے مقابلے کافی کم ہوتی ہے اور سائز میں یہ اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ ایک چھوٹی سی میز پر آسانی سے آجاتے ہیں۔ ان پر ایک بار میں صرف ایک آدمی ہی کام کرسکتا ہے۔

مائکرو کمپیوٹر کی ہی دوسری شکل ہے پرسنل کمپیوٹر (Personal Computer)، جسے مختصراً 'پی سی' (PC) کہا جاتا ہے۔ سب سے پہلے انھیں آئی بی ایم کمپنی کے ذریعے بنایا گیا تھا۔ یہ کتاب بنیادی طور پر پی سی کے بارے میں ہی ہے۔ پی سی کے بارے میں آپ آگے اور بھی تفصیل کے ساتھ پڑھیں گے۔

ان تین قسم کے کمپیوٹروں کے علاوہ نئے کمپیوٹر میں 'سپر کمپیوٹر' بھی ہیں۔ یہ رفتار میں بہت تیز ہوتے ہیں۔ یہ اکیلے ہی کئی مین فریم کمپیوٹر کے برابر ہوتے ہیں۔ ان کی قیمت بھی کروڑوں میں ہوتی ہے۔ ہندوستان میں 'پرم' نام کا ایک سپر کمپیوٹر بنایا گیا ہے۔

■

بہ شکریہ: ریپڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8/ آفس 2007)، سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 2
فون نمبر: 011-23275434,23262683

ای بینکنگ
ایک انقلابی ٹیکنالوجی

فرمان چودھری

جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے نئی سے نئی ٹیکنالوجی وجود میں آرہی ہے۔ انسان کے لیے اب کوئی کام مشکل نہیں رہا۔ جدید ٹیکنالوجی سے ہرکوئی مستفید ہورہا ہے۔ کمپیوٹر کی ایجاد نے دنیا کو کہاں سے کہاں لاکھڑا کیا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی کا استعمال ہرجگہ ہوتا نظر آرہا ہے۔ مینول ورک کو الیکٹرانک ورک پر شفٹ کردیا گیا ہے۔ ہرکام کو جدید ترین ٹیکنالوجی کے استعمال سے تیز اور آسان بنانے کا عمل مسلسل جاری ہے۔ ایسی ہی ایک جدید ٹیکنالوجی کا نام ای بینکنگ ہے۔ ای بینکنگ اب کوئی نئی چیز نہیں رہ گئی ہے۔ بھارت میں اس کا استعمال شروع ہوئے کئی برس ہو چکے ہیں اور روز کروڑوں لوگ انٹرنیٹ کے ذریعے بینکنگ لین دین کرتے ہیں۔

کسی بھی بینک کی جانب سے فراہم کی جارہی خدمات کو کسی بھی جگہ سے کمپیوٹر، موبائل یا دیگر برقی آلات سے انٹرنیٹ کے ذریعے استعمال کرنا ای بینکنگ کہلاتا ہے۔ اس کے لیے بینک ویب سائٹ اور موبائل اپلی کیشن بنا کراپنے گاہکوں کو انٹرنیٹ کے ذریعے دستیاب کرواتے ہیں۔

ای بینکنگ کوکئی ناموں سے جانا جاتا ہے جیسے کہ آن لائن بینکنگ، موبائل بینکنگ، نیٹ بینکنگ، ای بینکاری وغیرہ، لیکن ان سب کا مطلب ایک ہی ہوتا ہے۔ اس نظام کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ کوئی بھی شخص گھر یا دفتر یا کہیں سے بھی کمپیوٹر کا استعمال کرکے بینکوں کے نیٹ ورکس اوران کی ویب سائٹ پر اپنی پہنچ بنا سکتا ہے۔

آن لائن بینکنگ نے لین دین کو بے حد آسان بنا دیا ہے۔ بینک جاکر ہونے والے زیادہ تر کام آپ گھر بیٹھے نمٹا سکتے ہیں۔ اس کی وجہ سے چیک اور کیش جمع کرنے، چیک بک لینے یا کسی طرح کا بل بھرنے کے لیے بینک آنے جانے میں لگنے والے وقت اور پیسے دونوں کی بچت ہوتی ہے۔ ای بینکنگ کے ذریعے آپ گھر بیٹھے خریداری بھی کرسکتے ہیں۔ آن لائن بینکنگ سے بجلی، پانی اور دیگر بل جمع کرنا نہ صرف آسان ہے بلکہ کفایتی بھی ہے۔ بجلی اور ٹیلی فون کمپنیاں آن لائن بل جمع کرنے پر صارفین کو چھوٹ دیتی ہیں۔ انشورنس پالیسی کا پریمیم، میوچول فنڈ میں سرمایہ کاری، ہوم لون سمیت دیگر طرح کے قرض کی ماہانہ قسط گھر بیٹھے آن لائن جمع کرسکتے ہیں۔ اس میں متعلقہ رقم طے تاریخ کو اپنے آپ کٹ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ سرکاری اور نجی شعبے کے کئی بینک مسڈ کال سے صارفین کو اکاؤنٹ میں پیسے کی معلومات دینے لگے ہیں جو مفت ہے۔ اس کے لیے موبائل نمبر بینک میں اس خدمت کے لیے رجسٹرڈ ہونا چاہیے۔ آن لائن بینکنگ کی شروعات چونکہ حالیہ چند برسوں میں ہوئی ہے، اس لیے اب بھی بہت سارے لوگ ہیں جو ای بینکنگ کی سہولت کا پورا پورا فائدہ نہیں لے پاتے ہیں۔ وجہ ہے ان کی اس بارے میں معلومات نہ ہونا یا معلومات کا کم ہونا۔

کچھ لوگ ای بینکنگ کو بینکنگ کے لیے محفوظ ذریعہ نہیں مانتے، لیکن یہ درست نہیں ہے۔ اصل میں انٹرنیٹ بینکنگ بھی بینکاری کے لیے ایک محفوظ، تیز اور بہت ساری خصوصیات سے لیس ایک ایسا ذریعہ ہے، جس سے انٹرنیٹ کے استعمال کی بنیادی معلومات رکھنے والا شخص آسانی سے فیضیاب ہوسکتا ہے۔

بینکنگ کی ضرورت ہم سب کو پڑتی ہے اور نئے زمانے کی نئی بینکنگ نے اسے مزید قابل رسائی بنا دیا ہے۔ یہ ای بینکنگ کا دور ہے۔ ای بینکنگ یعنی الیکٹرانک بینکنگ۔ وسیع معنی میں اس میں ہم آن لائن بینکنگ، الیکٹرانک فنڈ ٹرانسفر، موبائل بینکنگ اور کارڈ ادائیگی کو بھی شامل کرسکتے ہیں۔ ان میں سے کچھ خصوصیات ہم سب کو معلوم ہیں۔ جیسے ڈیبٹ کارڈ، کریڈٹ کارڈ، اے ٹی ایم وغیرہ۔ لیکن ابھی بھی کافی لوگ کئی نئی خصوصیات اور ان کے ساتھ ضروری احتیاطی تدابیر سے ناواقف ہیں۔

جیسے آپ اپنے اے ٹی ایم کارڈ سے کسی بھی بینک کے کسی بھی اے ٹی ایم سے ایک ماہ میں پانچ بار بلا معاوضہ لین دین کرسکتے ہیں، جس میں بیلنس چیک کرنا بھی شامل ہے۔ اگر آپ کا اکاؤنٹ ڈیبٹ ہوگیا اور اے ٹی ایم سے پیسے نہیں نکلے تو فکر کی کوئی بات نہیں۔ ٹرانزیکشن سلپ اپنے پاس رکھیں اوراس کی شکایت فوری طور پر اپنے بینک میں درج کریں۔ اس کے بعد آپ کا بینک آپ کے اکاؤنٹ میں رقم واپس کریڈٹ کردے گا۔ اگر وہ ایسا سات دنوں کے اندر کرنے میں ناکام رہتا ہے تو اسے آپ کو 100 روپے یومیہ کے حساب سے ہرجانہ دینا ہوگا۔

ای بینکنگ خدمات کی کچھ مخصوص اصطلاحات بھی ہیں جن کا ہمارے لیے جاننا بے حد ضروری ہے۔ جیسے (1) الیکٹرانک کلیئرنگ سروس یعنی ای سی ایس۔ یہ بار بار اور متواتر ہونے والے الیکٹرانک فنڈ ٹرانسفر کا ذریعہ ہے۔ اداروں کی طرف سے ای سی ایس کا استعمال منافع، سود، تنخواہ، پنشن وغیرہ کی بڑی ادائیگیوں کے لیے ٹیکس وصولی، قرض قسطوں کی واپسی، باہمی فنڈز کے متواتر سرمایہ کاری وغیرہ میں ادا کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ ای سی ایس درحقیقت ایک بینک اکاؤنٹ سے کئی بینک اکاؤنٹس یا اس کے برعکس کرنسی کی تھوک منتقلی کی سہولت فراہم کرتا ہے۔

(2) نیشنل الیکٹرانک فنڈ ٹرانسفر یعنی این ای ایف ٹی۔ یہ ایک ملک گیر نظام ہے جو افراد، فرموں اور کمپنیوں کو بینک کی کسی ایک شاخ سے ملک میں واقع دیگر کسی بینک کی شاخ میں اکاؤنٹ ہولڈر افراد، فرموں اور کمپنیوں کو الیکٹرانک فنڈ ٹرانسفر کی سہولت پیش کرتا ہے۔ این ای ایف ٹی کے لیے این ایف سی کوڈ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ 11 پوائنٹس کا کوڈ ہے، جس میں پہلے 4 حروف ہیں جو بینک کو ظاہر کرتے ہیں اور آخری 6 عدد ہیں جو

شاخ کو ظاہر کرتے ہیں۔ پانچواں حرف صفر ہے۔ این ای ایف ٹی میں حصہ لینے والی تمام بینک شاخوں اور ان کی این ایف سی کی فہرست بھارتی ریزرو بینک کی ویب سائٹ پر دستیاب ہے۔ این ای ایف ٹی کی فیس 1 لاکھ روپے تک کے لین دین کے لیے محض 5 روپے پلس سروس ٹیکس ہے۔ فنڈ مستفید کے اکاؤنٹ میں اسی دن یا اگلے کام کے دن کی صبح تک کریڈٹ ہو جاتا ہے۔

(3) ریئل ٹائم گراس سیٹلمنٹ یعنی آر ٹی جی ایس: یہ فنڈ کی منتقلی کا ایک ایسا طریقہ کار ہے جس میں ایک بینک سے دوسرے بینک میں کرنسی کی منتقلی حقیقی وقت اور مجموعی بنیاد پر ہوتی ہے۔ یہ بینکنگ چینل کی طرف سے کرنسی کی منتقلی کا سب سے تیز ذریعہ ہے۔ آر ٹی جی ایس نظام بنیادی طور پر بڑے قیمت کی رقم کے لیے ہے۔ آر ٹی جی ایس سے منتقل کی جانے والی کم از کم رقم دو لاکھ روپے ہے۔ اس کی فیس پانچ لاکھ تک کے لین دین کے لیے محض 30 روپے پلس سروس ٹیکس ہے۔

انٹرنیٹ بینکنگ ہمیں اپنے تقریباً تمام بینکاری لین دین اور خدمات کے لیے بینک کی شاخ میں جانے کی پریشانی سے نجات دلاتی ہے۔ اس کے ذریعے ہم تمام بینکنگ کام گھر بیٹھے یا کہیں سے بھی کر سکتے ہیں۔ مثلاً انٹرنیٹ بینکنگ کے ذریعے ہم کسی بھی دوسرے شخص کے اکاؤنٹ میں فوری طور پر پیسے بھیج سکتے ہیں۔ اپنے اکاؤنٹ کی باقی رقم کی معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ اپنے اکاؤنٹ میں ہوئے لین دین کی تفصیلات دیکھ سکتے ہیں۔ ایف ڈی یا دیگر اکاؤنٹ کھول سکتے ہیں۔ موبائل ریچارج کر سکتے ہیں۔ بجلی، پانی، ڈش ٹی وی اور دیگر بل گھر بیٹھے ادا کر سکتے ہیں۔ چیک بک آرڈر کر سکتے ہیں۔ آن لائن خریداری کر سکتے ہیں۔ بینک سے کسی بھی دستیاب بینکنگ سروس کا مطالبہ کر سکتے ہیں یا شکایت درج کر سکتے ہیں۔ اسٹاک مارکیٹ یا کسی دیگر جگہ سرمایہ کاری کر سکتے ہیں۔ بس، ریل اور دیگر ٹکٹ انٹرنیٹ سے بک کر سکتے ہیں۔ اپنا ٹیکس اور دیگر ادائیگی آن لائن کر سکتے ہیں۔ ڈیمانڈ ڈرافٹ بنوانے کے لیے آن لائن فارم بھر سکتے ہیں۔ لون اور دیگر اکاؤنٹس کی تفصیلات دیکھ سکتے ہیں۔ لائف انشورنس، آٹو انشورنس اور دیگر بینکنگ خدمات اور مصنوعات آن لائن خرید سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ تمام خدمات کیسے حاصل کی جا سکتی ہیں۔ یا ان خدمات کو حاصل کرنے کے لیے کیا کرنا ہوگا۔ انٹرنیٹ بینکنگ کا استعمال کرنے کے لیے آپ کو اپنے بینک سے رابطہ کرنا ہوگا۔ بینک میں اس خدمت کے لیے فارم بھرنے کے بعد بینک انٹرنیٹ بینکنگ کے لیے آئی ڈی اور پاس ورڈ جاری کرے گا۔ اس کے بعد آپ انٹرنیٹ کے ذریعے اپنے بینک کی ویب سائٹ پر جائیں گے۔ بینک کی ویب سائٹ پر 'انٹرنیٹ بینکنگ' کے لیے لنک دیا ہوا ہوتا ہے، اس پر کلک کرنے سے وہ آپ سے آئی ڈی اور پاس ورڈ مانگے گا۔ پہلی بار لاگ ان یا رجسٹریشن پر زیادہ تر بینک آپ کو ایک نیا پاس ورڈ درج کرنے کے لیے کہتے ہیں۔ یہاں آپ ایک ایسا پاس ورڈ درج کریں جس کا کسی دوسرے کے لیے اندازہ لگانا مشکل ہو لیکن آپ اسے آسانی سے یاد رکھ سکیں۔

بنیادی طور پر انٹرنیٹ کا استعمال کرنا جتنا آسان ہے، اتنا ہی آپ کو احتیاط بھی برتنی ہوتی ہے۔ اگر کوئی کہتا ہے کہ انٹرنیٹ بینکنگ محفوظ نہیں ہے تو یہ غلط ہے۔ انٹرنیٹ بینکنگ مکمل طور پر محفوظ ہے۔ اس کے لیے کئی طرح کے حفاظتی اقدامات کیے گئے ہیں۔ جس میں موبائل پر بھیجا جانے والا او ٹی پی بھی شامل ہے۔ اس لیے کچھ بنیادی باتوں کا دھیان رکھتے ہوئے آپ اپنے ای بینکنگ تجربات کو خوشگوار بنا سکتے ہیں۔ مثلاً آج کل فشنگ کے ذریعے ٹیکنالوجی کے غلط استعمال سے انٹرنیٹ کے جعلساز، لوگوں کے اکاؤنٹس کو ہیک کر کے انھیں نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ایسے میں ضروری ہے کہ نیٹ بینکنگ کے استعمال میں انتہائی احتیاطی تدابیر برتی جائیں۔ نیٹ بینکنگ کا استعمال کرتے ہوئے صارف کو یو آر ایل کی تحقیقات کر لینی چاہیے۔ کئی رپورٹس یہ بتاتی ہیں کہ استعمال کی جانے والی 50 فیصد ویب سائٹ غیر محفوظ ہوتی ہیں۔ ایسے میں نیٹ سرفنگ کرنے والے شخص کے لیے یہ انتہائی ضروری ہے کہ وہ پوری جانچ پڑتال کے بعد ہی ویب سائٹ کھولے۔ کسی بھی سائٹ کے یو آر ایل ایڈریس اور ڈومین چیک کریں اور دیکھیں کہ یہ اسی بینک کے یو آر ایل اور ڈومین ہیں، ایسے میں اس بات کا امکان کافی حد تک بڑھ جاتا ہے کہ صارف محفوظ ویب سائٹ کا استعمال کر رہے ہیں۔ نیٹ بینکنگ سروس کا استعمال کرنے والوں کو اسے جلدی جلدی جانچتے رہنا چاہیے۔

انٹرنیٹ بینکنگ کے لیے آپ کو جاری کیا گیا پاس ورڈ کسی دوسرے کو نہ بتائیں۔ یہ پاس ورڈ آپ کے بینک اکاؤنٹ کی چابی ہے۔ آپ اپنے پاس ورڈ کو کہیں لکھ کر نہ رکھیں، اس سے اس کے کسی دوسرے کے ہاتھوں میں جانے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ انٹرنیٹ بینکنگ کا لنک ہمیشہ بینک کی ویب سائٹ پر جا کر ہی کھولیں۔ کسی دوسرے کی طرف سے بھیجے گئے ای میل، ایس ایم ایس وغیرہ سے حاصل لنک سے کبھی بھی انٹرنیٹ بینکنگ کا استعمال نہ کریں۔ کسی بھی شخص کے فون کرنے پر اس کو اپنے بینک اکاؤنٹ کا پاس ورڈ یا دیگر خفیہ معلومات نہ بتائیں۔ بینک سے لین دین کے دوران آپ کو عارضی پاس ورڈ بھی بھیجا جائے گا۔ یہ صرف ایک وقت کے استعمال کے لیے ہوگا، اسے بھی کسی دوسرے کو نہ بتائیں۔ انٹرنیٹ بینکنگ اکاؤنٹ کے استعمال کے بعد اسے 'لوگ آؤٹ' کر دیں۔ اپنا موبائل نمبر اور ای میل ایڈریس ضرور بینک میں درج کروائیں، جس سے آپ کے اکاؤنٹ میں ہونے والے تمام لین دین کی اطلاع فوری طور پر آپ کو مل جائے گی۔

اپنے ڈیبٹ کارڈ، اے ٹی ایم وغیرہ کو سنبھال کر رکھیں، کھو جانے پر فوری طور پر بینک کو مطلع کریں۔ اپنے براؤزر میں انٹرنیٹ بینکنگ کے استعمال کے وقت دھیان دیں کہ ایڈریس بار کا رنگ سبز ہو گیا ہے۔ ایڈریس میں ایچ ٹی ٹی پی ایس ہے یا صرف ایچ ٹی ٹی پی اور تالے کا نشان دکھائی دے رہا ہے یا نہیں۔ یہ بھی محفوظ لین دین کے لیے ضروری ہے۔ ان کے بغیر آن لائن لین دین نہ کریں۔ پیڈ لاک پر کلک کر کے آپ اس ویب سائٹ کا حفاظتی سرٹیفکیٹ بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ہمیشہ اپنے بینک کی ویب سائٹ کا مکمل ایڈریس ٹائپ کریں اور اس پر توجہ بھی دیں۔ لاٹری یا کسی انعام سے متعلق ای میل وغیرہ سے بھی بچیں۔ ان کا جواب کبھی نہ دیں اور فوراً ڈلیٹ کر دیں۔ آپ ان کی شکایت اس ادارے میں بھی کر سکتے ہیں جہاں سے یہ ای میل آنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

اپنے کمپیوٹر یا لیپ ٹاپ میں ہمیشہ نئے اینٹی وائرس رکھیں، کیوں کہ وائرس اور دیگر مال ویئر آپ کے کمپیوٹر اور آپ کے انٹرنیٹ کے استعمال کی جانکاری ہیکر کو بھیج سکتا ہے۔ کسی بھی قسم کی جانکاری یا شک ہونے پر بینک کے فون نمبر پر کال کر کے فوری طور پر اطلاع دیں۔ اگر کوئی آپ سے فون کر کے آپ کے موبائل نمبر پر آنے والے میسج کے بارے میں جانکاری چاہتا ہے تو کوئی بھی جانکاری نہ دیں۔ بینک سے آپ کے اکاؤنٹ سے جڑی کسی بھی معلومات کے لیے کبھی آپ کو کال نہیں کیا جاتا ہے۔ اس بارے میں توجہ رکھیں اور کسی بھی شخص کو، چاہے بات چیت سے وہ کتنا بھی پروفیشنل لگتا ہو، اپنی ذاتی معلومات دینے سے بچیں۔

■

Farman Chaudhry (Farman Ahmed)
C-164/5 Second Floor
Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla
New Delhi-110025
Mob. 9910440960

زبان وادب اور سوشل میڈیا

مبین نذیر

جدید ٹکنالوجی نے تمام شعبہ ہائے زندگی کو متاثر کیا ہے۔ دنیا کو سمیٹ دیا ہے۔ ترسیل کو تیز رفتاری عطا کی ہے۔ آزادی خیال اور اظہار رائے کو آسان بنا دیا ہے۔ جمہوریت کے چوتھے ستون صحافت کو توانائی عطا کی ہے۔ اسی طرح علم وادب اور نشر واشاعت کے مراحل کو بھی سہل کر دیا ہے۔

ویب سائٹ دلیل ڈاٹ کام میں اس کے مدیر اپنے مضمون تحریر کی اشاعت آپ کا تعاون درکار ہے میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

سوشل میڈیا کی برکت سے لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد سامنے آئی ہے جو دلیل سمیت مختلف ویب سائٹس پر لکھ رہی ہے۔

پہلے قلم کار کو اپنے فن کا اظہار کرنے کے بعد اس کی اشاعت کے لیے فن کار کو مہینوں اور کبھی سالوں انتظار کرنا پڑتا تھا۔ رسائل میں تخلیقات کو بھیجنے کے بعد اشاعت تک کے وقفے میں فن کار تذبذب کی کیفیت میں مبتلا رہتا تھا۔ ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ تخلیق کہیں ڈاک والوں کی تساہلی کی بھینٹ نہ چڑھ جائے یا پھر مدیر کی ڈسٹ بن کی نذر نہ ہو جائے۔ شاعر، ادیب، گلوکار اپنا تازہ کلام سنانے کے لیے سامعین کے متلاشی ہوا کرتے تھے۔ مصور اپنے خون جگر کو صفحہ قرطاس پر بکھیرنے کے بعد اس کے خوشہ چینوں کو تلاش کرتا تھا۔ گلوکار ریاض ہائے کثیر کے بعد تیار کیے گئے اپنے نغمات کی اثر پذیری کی جانچ کے لیے سامعین کا متلاشی ہوا کرتا تھا۔

کہتے ہیں نا کہ ہر پریشانی کے بعد راحت ہے۔ اسی کے مصداق سوشل میڈیا نے جہاں دیگر شعبہ ہائے زندگی سے منسلک لوگوں کو سہولیات فراہم کی ہیں وہیں فن کاروں کو بھی اظہار کا ایک ایسا پلیٹ فارم مہیا کیا ہے جو زماں و مکاں کی قیود سے بالا تر ہے۔ جہاں ارباب نقد ونظر کا ایک وقیع حلقہ تنقید وتبصرے کے ذریعے فن پاروں کے حسن وقبح پر غیر جانبداری سے اظہار خیال کرتا ہے۔ فن کار کو اس کی خوبیوں اور خامیوں سے واقف کراتا ہے۔ اپنے فن کی پذیرائی دیکھ کر یقیناً قلمکار کو جو خوشی ملتی ہے وہ نا قابل بیان ہے اور یہی خوشی اس کا اصل سرمایہ ہوتی ہے۔ جب کسی قلم کار کو پذیرائی ملتی ہے تو اس کے تخلیقی عمل میں تیزی آتی ہے۔ یہی حال سوشل میڈیا کی وجہ سے لکھاریوں کا ہے۔ جب سوشل میڈیا پر انھیں بھر پور تعاون ملتا ہے تو ان کے قلم کی رفتار میں بھی اضافہ ہوتا ہے جو یقیناً ادب کے لیے نیک فال ہے۔

سوشل میڈیا فن کو نکھارنے کی ایک ایسی بھٹی کا کام بھی انجام دے رہا ہے، جہاں آپ اپنے آپ کو تپا کر کندن بنا سکتے ہیں۔ فیس بک پر بہت سے ایسے ادبی گروپ نہایت کامیابی کے ساتھ جاری ہیں جو مختلف ادبی سرگرمیاں، مباحثوں، مکالموں اور مذاکروں کا اہتمام کرتے ہیں۔ جہاں نئے لکھنے والوں سے لے کر میدان ادب میں اپنی زندگی کے قیمتی اثاثے کو صرف کرنے والے اہل علم بھی ہوتے ہیں جو اپنی علمی ضیا پاشیوں سے ان ادبی محافل کو منور کر دیتے ہیں۔

مشاعرے جو کبھی اردو زبان وتہذیب کا اسکول ہوا کرتے تھے وقت کی گردش نے ان کے حسن کو گہنا دیا تھا مگر سوشل میڈیا پر ہونے والے طرحی مشاعروں نے اس کو نئی زندگی عطا کی ہے۔ ماضی میں آل انڈیا مشاعرے کا انعقاد کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا لیکن آج سوشل میڈیا نے عالمی مشاعروں کی فضا قائم کر دی ہے۔ آپ کو ہر گروپ میں دنیائے ادب کے ہر خطے کی نمائندگی نظر آئے گی۔ آپ کو شاعری کے اسرار و رموز جاننے ہیں، اپنے کلام پر اصلاح لینی ہے، اساتذہ کے کلام کا مطالعہ کرنا ہے، کسی کتاب کی آپ کو ضرورت ہے، آپ اپنا پیغام سارے عالم میں پہنچانا چاہتے ہیں، کتابیں خریدنا یا فروخت کرنا چاہتے ہیں.... ان تمام کا واحد حل سوشل میڈیا ہے۔ سوشل میڈیا پر متعدد گروپ درج بالا امور بحسن خوبی انجام دے رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے ادب کی ترویج واشاعت میں تیزی آئی ہے اور قلم کار اور قارئین کی تعداد میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ راقم بذات خود فیس بک اور واٹس ایپ پر ایسے متعدد گروپوں میں شامل ہے جو خاموشی کے ساتھ اردو زبان وادب کے گیسوؤں کو سنوارنے میں سرگرداں ہیں۔ ان گروپوں میں سے چند کا یہاں تذکرہ کیا جاتا ہے۔

شاعری سیکھیں اور سکھائیں۔ اس گروپ کو کراچی سے جناب محمد اسامہ سرسری صاحب نہایت کامیابی کے ساتھ چلا رہے ہیں۔ جہاں نو آموز لکھاریوں کو شاعری کے اسرار و رموز سکھائے جاتے ہیں، کلام کی اصلاح کی جاتی ہے۔ گذشتہ مہینے اس گروپ پر ایک انعامی مقابلے کا انعقاد عمل میں آیا۔ اسامہ صاحب نے اپنی ایک مفید اور کارآمد کتاب شاعری کے بیس اسباق کا برقی ایڈیشن بھی اس گروپ میں شیئر کیا، یہ کتاب مبتدی شعرا کے لیے نہایت مفید اور کارآمد ہے۔

فیس بک پر ہی ایک گروپ انہماک کے نام سے

سید تحسین گیلانی ساؤتھ افریقہ اور شفقت محمود صاحب چلا رہے ہیں۔ یہ گروپ مائکروفکشن کے لیے کام کر رہا ہے۔ ابھی حال ہی میں سید تحسین گیلانی صاحب مدیر انہماک انٹرنیشنل نے بورے والا پاکستان میں مورخہ 27 نومبر 2016 کو مشہور شاعر و ادیب اور انشائیہ نگار اے غفار پاشا صاحب کی صدارت میں مائکروفکشن کی اولین کانفرنس منعقد کی جو کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ فیس بک پر ایسے سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں گروپ ہیں جو زبان و ادب کی فلاح و بقا کے لیے کام کر رہے ہیں۔

اس کے بعد ہم آتے ہیں مشہور و مقبول اپلیکیشن واٹس ایپ کے ادبی استعمال کی طرف.... جہاں واٹس ایپ نے آفس کارخانے، کمپنی وغیرہ کے کاموں کو آسان کردیا ہے، وہیں ادبی سرگرمیوں کو بھی سہل بنا دیا ہے۔ یہاں میں واٹس ایپ کے چند ادبی گروپوں کا تذکرہ بطور خاص کرنا چاہوں گا، یوں تو اردو زبان و ادب کی نشر و اشاعت کے لیے بہت سارے گروپس ہیں لیکن ان گروپس میں جو سنجیدگی اور متانت اور ادب کے تئیں دیانت نظر آتی ہے وہ قابل داد و تحسین ہے۔

ان میں پہلا گروپ شاعری کا ہے۔ جس کا نام دبستان سخن ہے۔ اس کے ایڈمن مشہور شاعر، ماہر عروض جناب فرحان دل صاحب ہیں۔ اس گروپ کا طریقہ کار یہ ہے کہ ایک مصرعہ طرح دیا جاتا ہے جس پر شعرا اپنا کلام پیش کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے کلام پر تبصرہ و تجزیہ بھی ہوتا ہے۔ پذیرائی، اصلاح و داد و ہی کا سلسلہ بھی چلتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری کسی سرگرمی کی اس گروپ میں قطعی اجازت نہیں ہوتی۔ اگر آپ کو کوئی کلام پسند ہے تو آپ شاعر کی اجازت سے اسے دوسری جگہ پوسٹ کرسکتے ہیں۔ وقت اور حالات کی مناسبت سے نعت، حمد اور گیت وغیرہ بھی اسی طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔

دوسرا گروپ نثری ادب کی سرگرمیوں کا احاطہ کرتا ہے۔ اس کا نام دبستان ادب ہے۔ کوئی فنکار اپنی تحریر ایڈمنز کو دیتا ہے۔ ایڈمن اس تحریر کا نمبر آنے پر اسے قلم کار کے نام کے بغیر گروپ میں پوسٹ کرتا ہے۔ قلم کار کو چھوڑ کو بقیہ ممبران کو اس تحریر پر نقد و جرح کی مکمل آزادی ہوتی ہے۔ ممبران تحریر کے حسن و قبح، زبان و بیان اور دیگر فنی خوبیوں اور خامیوں پر بیباکانہ اور غیر جانب دارانہ انداز میں اپنی آرا پیش کرتے ہیں۔ مناسب تعداد میں تبصرے ہونے کے بعد قلمکار کے نام کا اعلان کیا جاتا ہے۔ قلم کار کو مبارکباد دینے کے ساتھ ہی یہ کارواں اگلی تحریر کی جانب بڑھتا ہے۔ اسی طرز عمل کا حامل ایک دوسرا گروپ تعمیر ادب کے نام سے بھی جاری ہے۔

ایک اہم بات سوشل میڈیا پر یہ بھی ہے کہ یہاں ادب صرف تحریری طور پر پیش نہیں کیا جاتا، بلکہ موقع و محل کی مناسبت سے آڈیوز اور ویڈیوز بنا کر بھی افسانے، غزلیں اور نظمیں وغیرہ پیش کی جاتی ہیں۔ اس طرح سے سوشل میڈیا پر زبان و ادب کی خدمت کا کام بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے۔ لکھاری جو اپنی تحریروں کی اشاعت نہ ہونے کی وجہ سے یا اس میں تاخیر کی وجہ سے مایوس ہوجاتے تھے اور لکھنا ترک کردیتے تھے، سوشل میڈیا نے ان کی اس مایوسی کو آس میں تبدیل کردیا ہے۔ اس نے بہت سے عمدہ شاعر، افسانہ نگار، مبصر، تجزیہ نگار اور نقاد ادب کو دیے ہیں جنھوں نے ترسیل کے اس وسیلے سے قلیل مدت میں عالمی پیمانے پر اپنے آپ کو منوایا ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے اور قوی امکان ہے کہ یہ کارواں یوں ہی رواں دواں رہے گا اور مزید افراد ہم رکاب ہوتے رہیں گے۔

سوشل میڈیا پر پوسٹ ہونے والی تحریروں کو بہت سے رسائل و جرائد اپنی اشاعت میں شامل کرتے ہیں۔ جس سے لکھاریوں کو مزید حوصلہ ملتا ہے۔ انہماک گروپ میں شامل منتخب مائکروفکشن کو پٹنہ سے شائع ہونے والے اخبار پندار کے گوشہ ادب میں شامل کیا جاتا ہے۔ ماہنامہ ندائے گل لاہور پاکستان نے نومبر 2016 کے خاص شمارے کو مائکروفکشن سے معنون کیا ہے۔ اسی طرح دبستان سخن میں شامل محمود انصاری صاحب کے افسانے پہچان کو پاکستان کے روزنامہ ڈیلی یورپ انٹرنیشنل نے شامل اشاعت کیا ہے۔ اسی گروپ کے ممبر جناب افضال انصاری صاحب کے افسانے دی ججمینٹ کو عالمی اردو افسانہ فورم میں، جس میں مشرف عالم ذوقی جیسا فنکار بھی شامل ہے، کو اول انعام سے نوازا گیا اور افضال انصاری جیسا صاحب نظر فنکار جس نے صرف پندرہ مہینے کی قلیل مدت میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے اسی سوشل میڈیا کی دریافت ہے۔ غرض یہ کہ سوشل میڈیا زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں تاریخی کردار ادا کر رہا ہے۔

کتابوں کی نکاسی کے مسئلے کو بھی سوشل میڈیا نے آسان بنا دیا ہے۔ اگر واقعی آپ کے قلم میں جان ہے، زبان و ادب کے متعلق آپ کا اپنا ایک ٹھوس نظریہ ہے تو آپ اپنا کلام، اپنے نظریات اور آرا کو شیئر کیجیے قدر دان آپ کا استقبال کریں گے۔ اپنی تصانیف کی اشاعت سے مطلع کیجیے آپ کو ملک ہی سے نہیں بیرون ملک سے بھی آڈر ملیں گے۔ محمد اسامہ سرسری کی کتاب شاعری سیکھیں اور سکھائیں، اس کی زندہ مثال ہے جس کا اولین ایڈیشن دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہوگیا اور برقی ایڈیشن بھی خوب مقبول ہوا۔

اسی طرح شاعری گروپ، دبستان ادب گروپ، افسانہ فورم گروپ، ادبی محاذ گروپ وغیرہ بھی زبان و ادب کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

جس طرح ہر بات کے دو پہلو ہوا کرتے ہیں اسی طرح سوشل میڈیا کی وجہ سے نئے افکار سامنے آرہے ہیں، ماہرین فن ان کی سرپرستی اور رہنمائی کر رہے ہیں۔ لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ پیش کردہ ہر تحریر تمام فنی خوبیوں سے آراستہ نہیں ہوتی۔ جس طرح پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہیں اسی طرح سوشل میڈیا پر پیش کردہ تحاریر بھی شاہکار کے زمرے میں شمار نہیں کی جاسکتیں۔ مختلف درجات کی تحریریں، تنقید اور تبصرے سامنے آتے ہیں اور اپنے معیار کے مطابق پذیرائی پاتے ہیں۔

اسی کا دوسرا رخ بیان کرتے ہوئے معروف ویب سائٹ ویلیل ڈاٹ کام کے مدیر لکھتے ہیں۔ زیادہ چھپنے اور چھاپنے کی دوڑ میں جہاں زیادہ لکھا جارہا ہے وہیں انھیں جیسا آیا ہے کی بنیاد پر شائع بھی کیا جارہا ہے۔ ایسے میں ویلیل جیسی ویب سائٹ کو مشکل کا سامنا ہے۔ جہاں ہر تحریر ادارتی فرائض انجام دینے والوں کی نظر سے گزرتی ہے اس کی نوک و پلک سنوارنے پر توجہ دی جاتی ہے۔ اور خاصا وقت اس میں صرف ہو جاتا ہے۔ لکھنے والے خواتین و حضرات اگر چند چھوٹے امور کی طرف توجہ دیں تو ادارتی ٹیم کو سہولت ہوسکتی ہے، جس کی وجہ سے تحریر جلد شائع ہوگی۔ آپ کی بھی اور دوسروں کی بھی۔ بعض اوقات کوئی اچھی تحریر اس وجہ سے رہ جاتی ہے کہ اس میں ادارت کے حوالے سے زیادہ محنت درکار ہوتی ہے۔

دوسری جانب سوشل میڈیا پر کچھ احباب ادبی سرقہ کے بھی مرتکب ہو رہے ہیں۔ کسی دوسرے کی تحریروں کو اپنے نام سے فارورڈ کرنے والوں کی بھی یہاں کمی نہیں ہے۔ جو یہ سمجھتے ہیں کہ چار دیواری میں بیٹھ کر وہ اس کار خیر کو انجام دے رہے ہیں اس لیے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی لیکن شاید وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ سچائی ایک نہ ایک دن ضرور سامنے آکر رہتی ہے اور سوشل میڈیا پر اس میں تاخیر بالکل نہیں ہوتی اور سرقہ بہت جلد طشت ازبام ہوجاتا ہے۔

اگر سرقے سے صرف نظر کیا جائے تو یقیناً سوشل میڈیا لکھاریوں اور زبان و ادب کے لیے ایک وسیع پلیٹ فارم مہیا کر رہا ہے جس کی زلفوں کا اسیر سارا عالم ہے۔

■

Prof. Mubeen Ahmad Nazeer Ahmad Ansari
Asst. Prof. Dept of Urdu/persian, M.S.G Arts, Science and Commerce College, Malegaon Camp, Distt.: Nasik - 423105 (Maharashtra)
Mob.:8983152574

اردو کا دامن نہ صرف ترجمہ اور تصنیف و تالیف کی برکت سے وسیع ہوا بلکہ مذہبیات کے علاوہ تاریخ ،تہذیب وثقافت اور دوسرے سائنسی علوم مثلاً طب اس زبان میں ڈھلنے لگے۔ اس کی غالباً وجہ یہ رہی ہوگی کہ طب کی ابتدا اگر چہ یونان اور روم سے ہوئی لیکن اس کی ترویج و اشاعت میں عربی و فارسی زبان نے کلیدی رول ادا کیا، چنانچہ تعلیم و تعلم سے لے کر تصنیف و تالیف، ترجمہ و تدوین تک ہی نہیں بلکہ اس فن کا کل اور مجموعی ڈھانچہ بالخصوص عربی زبان اور بالعموم فارسی زبان پر منحصر ہے۔ لیکن Generation gap کی وجہ سے ان دونوں زبانوں پر کلی اور جزوی دسترس نہ ہونے کی وجہ سے افہام و تفہیم مشکل اور دشوار ہوگئی اس لیے اطبا نے اس طب کو بچانے کے لیے اس زبان کا سہارا لیا جس میں خصوصی طور سے یہی دونوں مشترک زبانیں شامل تھیں اور وہ زبان اردو ہے۔ آزادی سے پہلے ہندوستان کی دفتری سرکاری اور عوامی زبان صرف اردو تھی چنانچہ اردو کا مطلب ہندوستانیت ہے۔ پنڈت سندرلال نے مہاتما گاندھی کو جو خط میں لکھا تھا وہ اپنی جگہ صدفی صد درست ہے ''اردو نہ مسلمانوں کی اور نہ کسی اور کی مذہبی زبان ہے اور نہ کبھی تھی، وہ صرف اس ملک کے رہنے والوں کی جن میں ہندو، مسلمان، عیسائی اور جین شامل ہیں یعنی ان سب کی قدرتی اور مادری زبان ہے۔'' چونکہ یونانی طب اپنی نزاکت اور لطافت میں ہندوستانی باشندوں سے بے حد قریب تھی اس لیے اس طب نے یہاں کی مقامی زبان کا سہارا لیا اور اس طرح طب کا اردو زبان سے یہ رشتہ اس کا ملی پس منظر کہلایا۔ نیز اس زبان کی وسعت اور وسیع المشربی بھی، جس نے سائنسی علوم کو جذب ہی نہیں کیا بلکہ اس کے ارسال و ترسیل کا ذریعہ بھی بنی۔

چنانچہ اس غیر روایتی حلقے میں اردو کی رسائی اردو کے لیے نیک فال ثابت ہوا جس سے نہ صرف ہزاروں کی تعداد میں نت نئے الفاظ، اصطلاحات اور تعبیرات وجود میں آئیں بلکہ نسخہ نویسی جو فارسی میں ہوا کرتی تھی اردو میں منتقل ہوئی۔ اس نے اردو زبان کے لیے نسخہ کیمیا کا کام کیا بلکہ طب سے منسلک مساعدین مثلاً عطار، پنساریوں، جراح فصاد وغیرہ کو بھی اردو سیکھنے اور پڑھنے کے لیے مجبور ہونا پڑا اور یونانی طب ہی وہ خالص سائنس ہے جو خود کو اردو کا سہارا لے کر ذریعہ تعلیم کا سبب بنی۔

اردو زبان سے طب کا تاریخی رشتہ با قاعدہ طور پر سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں ہی قائم ہو جاتا ہے، لیکن فورٹ ولیم کالج اور دہلی کالج کے قیام کے بعد اس میں مزید استحکام آتا ہے، اس طرح اس کی نثر اور شعریات میں طب کی سیکڑوں اصطلاحات و محاورات پھول اور بوٹوں کی طرح زینت کا سامان بنتے ہیں مثلاً طبیب، نسخہ نویسی، عناصر، اخلاط، عقاقیر، آبلہ، صفراء، سودا، بلغم، دم، شفا، مریض، اعصاب، بحران، حمی، صداع، ہذیان، شقیقہ، ناساز، دوران سر، نزلہ، زکام، مدقوق، عفونت، حرارت، طبیعت، اعضاء رئیسہ، امتزاج قوی، اعضا، تنقیہ، خفقان، قبض، اسہال وغیرہ۔ مزکورہ طبی اصطلاحات شعراء اور نثر نگار کی خاص کاوش کی غماز ہیں۔

ملاحظہ کریں مندرجہ ذیل اشعار جن میں طبی اصطلاحات کی نمائندگی ہے۔

غالب کا شعر:

پی جس قدر ملے شب مہتاب میں شراب
اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

میر کا ایک شعر:

بھوکے مرتے مرتے منھ میں تلخی صفرا پھیل گئی
بے ذوقی میں ذوق کہاں جو کھانا پینا مجھ کو بھائے

مومن کے اشعار:

اے چارہ گر قابلِ درماں نہیں یہ درد
ورنہ مجھے سودا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
عشق ان کی بلا جانے، عاشق ہو تو پہچانے
لو مجھ کو اطبا نے سودے کا خلل جانا

مندرجہ بالا اشعار میں بلغمی، تلخی صفرا، سودا اور سودے کا خلل اس بات کا اشارہ ہیں کہ شعرا طبی اصطلاحات پر کس قدر گرفت رکھتے تھے، نیز اس کی ترجمانی بھی بڑے ایقان و اعتماد سے کرتے تھے۔

ذوق کا ایک شعر:

نسخہ یہ لکھنے نہیں پاتا ہوالشافی طبیب
کہتا ہے بیمار بس کر مجھ کو بالکل ہے شفا

سودا کا ایک شعر:

تجھ عشق کے مریض کی تدبیر شرط ہے
لیکن شفا کو گردش تقدیر شرط ہے

داغ کا ایک شعر:

وہ وقت نزع دیکھ مجھ کو یہ کہہ گئے
اچھا ہے تو کیا اسے حاجت دوا کی ہے

حالی کے اشعار:

مٹی سے، ہوا سے، آتش و آب سے یاں
کیا کیا نہ ہوئے بشر پہ اسرار عیاں

شفا، ھوالشافی، طبیب، عناصر اربعہ (مٹی، پانی، ہوا، آگ) اور نزع یہ سب طبی اصطلاحات ہیں جن کو شعرا نے اپنے اشعار میں نہایت سلیقے سے استعمال کیا ہے۔ نثر نگاری میں بھی اطبا نے اپنے اپنے جوہر مختلف انداز میں دکھائے ہیں مثلاً حکیم محمد شریف خاں کے بارے میں سرسید فرماتے ہیں ''حکیم شریف خاں جیسا کمالات ظاہری و باطنی کا عرصۂ روزگار میں جلوہ گر نہیں، علم و عمل کے ساتھ اس بزرگ بلند فطرت کی ذات میں جمع ہے، آج تک ان کے کمالات کا شہرہ گنبد دوار میں از بس بلند ہے۔ جالینوس اور ارسطو کا غلغلہ اس کے سامنے ایسا ہے جیسے طوطی کی آواز نقار خانے میں اور فی الحقیقت اس روزگار کے اکثر اطبا نامی ان کی ہی نسبت شاگردی سے سرمایہ اعتبار رکھتے ہیں'' اس طبیب نے حد درجہ اردو کی خدمت کی ہے، اس کی کتابیں سرمایہ افتخار ہیں مثلاً علاج الامراض، تالیف شریفی، ترجمۂ کلیات قانون، ترجمۂ حمیات قانون، شرح موجز اور مطب شریف خان وغیرہ، ایک مصدقہ روایت یہ بھی ہے کہ اردو زبان میں قرآن شریف کا سب سے پہلا ترجمہ بھی حکیم موصوف کے ذات گرامی کی طرف منسوب ہے اس ترجمے سے متعلق مولوی عبدالحق کی رائے ہے کہ ''اس کی زبان صاف اور لفظی پابندی میں سختی نہیں کی گئی ہے اردو زبان کی ترکیب کا نسبتاً زیادہ خیال رکھا گیا ہے اور ریختہ میں ترجمہ کیا گیا ہے

بیسویں صدی میں اطبا کی ایک بڑی جماعت رہی ہے جس نے اردو زبان کی کشت کو اپنے خون جگر سے سینچا ہے مثلاً حکیم محمد کبیر الدین جس نے طب کی سیکڑوں کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا اور کروایا، حکیم شکیل احمد شمسی، حکیم کوثر چاندپوری اور حکیم عبدالحمید جس نے غالب اکادمی کی زمین کی قیمت اپنی جیب خاص سے ادا کیا، مجروح سلطان پوری جو مطب سے پردۂ سیمیں تک پہنچ کر تا حیات اردو کی خدمت کرتے رہے حکیم ظل الرحمن بانی ابن سینا اکادمی حکیم موصوف

نے نہ صرف طب کی معتد بہ کتب کا اردو زبان میں تدوین و ترجمہ کیا بلکہ ابن سینا اکادمی میں اقبالیات اور غالبیات کی ذخیرہ اندوزی میں اردو کے دیگر کتب خانوں سے سبقت لے گئے، علاوہ ازیں الطاف احمد اعظمی جو نہ صرف اردو اکادمی دہلی کے چیرمین منتخب ہوئے، بلکہ طب یونانی اور اردو زبان پر ایک بڑی کانفرنس کا انعقاد کیا، جس کی پروسیڈنگ آج بھی اس موضوع پر اصل اور مرجع کی حیثیت رکھتی ہے، یہ گفت و شنید کا وہ پہلو تھا کہ جس میں طب اردو کے فروغ کے لیے ممد و معاون ثابت ہوئی ہے، مگر سکے کا دوسرا رخ بھی کم اہمیت کا حامل نہیں ہے کہ اگر اردو زبان نہ ہوتی تو طبیہ کالج کب کے بند ہو گئے ہوتے کیوں کہ علمی انحطاط و زوال اس حد تک آ پہنچا کہ اطبا براہ راست عربی و فارسی کتابوں سے استفادہ کرسکیں

اب سوائے اردو کے اور کوئی چارہ کار نہ رہا یعنی افہام و تفہیم اور ارسال و ترسیل کا ذریعہ اردو زبان ہی ٹھہری اس لیے بلا شبہ ہم خدام طب تو اردو کے ممنون و مشکور ہیں، الحاصل دونوں کے مابین خوشگوار تعلق (Symbiotic Relationship) ہے۔ جہاں یونانی طب کی پہنچ سے اردو زبان کا کینوس وسیع ہوتا ہے وہیں اردو بھی یونانی طب کے فروغ میں اساسی رول ادا کر رہی ہے کیوں کہ دونوں ہی اسلامی تہذیب و ثقافت کی آئینہ دار ہیں اور یہی ان کا تہذیبی و ثقافتی رشتہ بھی ہے لیکن موجودہ منظر نامہ کچھ زیادہ ہی مایوس کن ہے کیونکہ اردو والوں کی طرف سے یونانی طبیبوں کو جوڑنے کی کوئی خاطر خواہ کوشش نہیں ہو رہی ہے حالانکہ غیر روایتی دائرے میں طب یونانی ہی وہ خالص سائنس ہے جس نے اردو کی گرانقدر خدمت انجام دی ہے اس وقت اردو والوں کے لیے ضروری ہے کہ اطبا کو اپنے ساتھ رکھ کر اپنا دائرہ وسیع کریں کیونکہ اردو کی تخم ریزی سب سے زیادہ غیر روایتی حلقہ یعنی طب یونانی ہی سے ممکن ہے اور اس تعلق کی روایت بھی رہی ہے، سائنس کے دیگر شعبوں کو اردو کے ساتھ جوڑنا ذرا مشکل ہے البتہ پرانی روایت کا احیا ممکن اور آسان ہے۔

کتابیات:

1. القرآن الکریم
2. المنجد فرید بک ڈپو، اردو مارکٹ، مٹیا محل، نئی دہلی
3. فرہنگ آصفیہ (جلد اول) مولوی سید احمد دہلوی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی-1998
4. طب یونانی اور اردو زبان و ادب، پروفیسر الطاف احمد اعظمی، سنٹر فار ہسٹری آف میڈیسین اینڈ سائنس، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی 2004
5. اردو دنیا (اردو اور ہندوستانیت) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان جولائی-2014

■

Dr. Wasim Ahmad Lecturer, Dept of Kulliyat,
National Institute of Unani Medicine
Kottigepalya, Magadi Main Road
Bangaluru - 560091 (Karnataka)

انیس امروہوی

ہندوستانی سنیما کے 100 برس کا سہانا سفر

1810 میں جب دُنیا میں متحرک فلموں کا آغاز ہوا تو ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت تھی اور ان کے ذریعے یہاں بھی کبھی کبھی چھوٹی چھوٹی متحرک فلموں کی نمائش تفریحاً کسی ہوٹل وغیرہ میں کر دی جاتی تھی۔ 1910 میں ایسی ہی ایک نمائش میں دادا صاحب پھالکے نے سب سے پہلے ایک چھوٹی سی فلم 'لائف آف کرائسٹ' دیکھ کر یہ سوچا تھا کہ کیوں نہ ہندوستان میں بھی اس قسم کی کوئی فلم بنائی جائے۔ 3 مئی 1913 کو دادا صاحب پھالکے کی ذاتی محنت اور لگن سے تیار کی گئی خالص ہندوستانی پہلی فلم 'راجہ ہریش چندر' بمبئی کے کارونیشن تھیئٹر میں عام لوگوں کے لیے نمائش کے لیے پیش کی گئی اوراس طرح ہندوستان میں فلموں کا وہ سفر شروع ہوا جس کواب سو برس ہو چکے ہیں۔

ہندوستانی فلموں کے اس سو برس کے سفر میں بہت سے اُتار چڑھاؤ آئے ہیں، زمانے کے سرد وگرم آئے ہیں۔ بعض لوگوں نے بڑا نام پیدا کیا ہے تو بہت سے لوگ برباد بھی ہوئے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے کامیابی حاصل کی ہے اور بہت پیسے بھی کمائے ہیں۔ لاکھوں لوگوں کو اس سے روزگار بھی ملا ہے۔ ان سو برسوں میں ہندوستانی سنیما نے ہر شعبے میں ترقی بھی کی ہے اور نئے نئے تجربات بھی ہوئے ہیں اوراب یہ عالم ہے کہ پوری دنیا میں ہالی ووڈ کے بعد دوسرے نمبر پر ہندوستانی فلم انڈسٹری کا نام آتا ہے۔ اب یہاں ہر برس تقریباً ایک ہزار سے زائد فلمیں بنتی ہیں۔

1913 سے ہندوستانی فلموں کا جو سفر شروع ہوا تھا، وہ ابھی خاموشی کے ساتھ جاری تھا اور اس درمیان فلم سازی کے شعبے میں نئے نئے تجربات بھی ہو رہے تھے۔ آواز کو سلولائیڈ پر منتقل کرنے کی کوششیں کی جارہی تھیں۔ لہٰذا 14 مارچ 1931 کو ہندوستان کی پہلی باقاعدہ متکلم فلم ''عالم آرا'' نمائش کے لیے پیش کر دی گئی۔ فلم 'عالم آرا' فلمساز و ہدایتکار آرڈیشر ایرانی نے امپیریل کمپنی کے لیے بنائی تھی اور بمبئی کے مجیسٹک تھیئٹر میں اس کی نمائش ہوئی تھی۔ اس فلم میں کل 7 گانے تھے۔ ماسٹر وِٹھل، زبیدہ، جلّو بائی (فلم 'مغلِ اعظم' میں انارکلی کی ماں) اور ڈبلو۔ ایم۔ خان وغیرہ نے بے حد پختہ اور خوبصورت اداکاری کی تھی۔ اس فلم کا پہلا گانا ڈبلیو۔ ایم۔ خان کی ہی آواز میں ''دے دے خدا کے نام پر......'' تھا۔ یہ فلم ہر لحاظ سے ایک کامیاب فلم تھی۔ اس طرح ہندوستان میں 1931 کا سال فلموں کے لیے ایک انقلابی سال تھا اور اس پورے سال مجموعی طور پر 28 متکلم فلمیں ریلیز ہوئیں۔

فلموں کے لیے اب زمانہ بدل چکا تھا۔ نئے نئے لوگ فلمسازی سے وابستہ ہو رہے تھے اور نئی نئی فلم کمپنیاں قائم ہو رہی تھیں۔ کلکتہ اور مدراس میں بھی فلمسازی کا کام شروع ہو چکا تھا اور ہندوستان کے شہروں اور قصبوں میں نئے نئے سنیما گھر بن رہے تھے۔

وقت کے ساتھ ساتھ فلموں کی کہانی، موسیقی، عکاسی، اداکاری، صدابندی (ساؤنڈ)، نغمہ نگاری اور پیش کش میں بھی سدھار آتا جارہا تھا۔ یہی وہ دور تھا جب ملک کی آزادی کی تحریک زور پکڑ رہی تھی۔ گاندھی جی کی تحریک 'انگریزو بھارت چھوڑو' شروع ہو چکی تھی۔ لہٰذا اس کا اثر بھی ہندوستانی سنیما پر پڑ رہا تھا۔ انگریز حکومت نے 1923 میں جو پریس سنسرشپ قائم کی تھی، اس کے دائرہ کار میں ہندوستانی سنیما کو بھی جکڑ لیا تھا، جس کی وجہ سے اگر کوئی فلمساز تحریک آزادی کو موضوع بنا کر فلم بناتا تو اس کی نمائش پر پابندی لگ جاتی تھی۔ اس کے باوجود لوگوں نے ہمت کر کے اور موضوع بدل کر کئی ایسی فلمیں بنائیں جن میں ہندوستانی قومیت کا جذبہ اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا عنصر بھی شامل تھا۔ فلم کس کا قصور، گوری بالا، رام رحیم، سورن، دی بم، اُودے کال اور 'غصہ' وغیرہ ایسی ہی چند فلمیں تھیں۔ 1947 میں آزادی ملنے کے فوراً بعد ہندوستانی فلمسازوں کو موقع مل گیا اور انھوں نے قوم پرستی سے لبریز کئی بہترین فلمیں بنائیں جو بہت کامیاب بھی ہوئیں۔ بی۔ این۔ سرکار کی 'ہمراہی'، پربھات فلم کمپنی کی 'ہم ایک ہیں'، وی۔ شانتارام کی 'اپنا دیش' تپن بوس کی 'مشعل'، شیام مکھرجی کی ''سنگرام''، فینس پکچرس کی 'جلیاں والا باغ' اور 1953 میں منروا مووی ٹون کے روحِ رواں سہراب مودی نے 'جھانسی کی رانی' بنائی جو بہت مقبول ہوئی۔ 1954 میں فلمستان والوں نے 'جاگرتی' فلم بنائی جو بہت پسند کی گئی۔ اس کے بعد دلیپ کمار کی 'شہید' اور منوج کمار کی 'شہید' اور 'کرانتی'، چیتن آنند کی فلم 'حقیقت' اور 'جوہر محمود اِن گوا' وغیرہ کئی فلمیں وطن پرستی کو موضوع بنا کر پیش کی گئیں۔ یہی وہ دور تھا جب ہندوستانی سنیما کے لیے نغمہ نگاروں نے بھی بہترین گانے لکھے۔

1950 سے 1975 تک کا زمانہ پچیس برس پر محیط ہے جو ہندوستانی فلموں کا سنہرا دور کہلانے کا مستحق ہے۔ اسی عرصے میں ہندوستان میں بے مثال اور ہر لحاظ سے بہترین فلمیں تیار ہوئیں اور لوگوں کا رجحان بھی فلموں کی طرف تیزی سے بڑھا۔ یہی وہ دور تھا جس میں بمبئی ٹاکیز، فلمستان، محبوب اسٹوڈیو، رنجیت اسٹوڈیو، جیمنی فلمز، راج کمل کلا مندر، راج شری پکچرس، محل پکچرس، آر۔ کے۔ فلمز، نوکیتن فلم کمپنی، پرکاش پکچرس، مدن تھیٹر، امپیریل فلم کمپنی، منروا مووی ٹون، اور وی۔ شانتارام کی پربھات فلم کمپنی اور نیو تھیٹر جیسے فلمسازی کے ادارے قائم ہوئے۔ ہمانشو رائے، بمل رائے، محبوب خان، اے۔ آر۔ کاردار، کمال امروہی، بی۔ آر۔ چوپڑہ، کے۔ آصف، لیش چوپڑہ، راجندر سنگھ بیدی، رامانند ساگر، ایس۔ ایچ رویل، چیتن آنند، رشی کیش مکرجی، وی۔ شانتارام، راج کپور، اور وجے بھٹ جیسے فلمساز اور ہدایتکاروں نے اپنی بہترین، کامیاب اور مقبول ترین فلمیں بنائیں۔ اسی دور میں نوشاد، ایس۔ ڈی۔ برمن، سلیل چودھری، غلام محمد، سجاد، روی، مدن موہن، شنکر جے کشن، کھیم چند پرکاش اور روشن جیسے موسیقاروں نے فلمی دنیا کی تاریخ کے بہترین نغمے بنائے۔ شکیل بدایونی، ساحر لدھیانوی، راجہ مہدی علی خاں، کیفی اعظمی، مجروح سلطانپوری، شیلندر، حسرت جے پوری، راجندر کرشن اور کیف بھوپالی، نقش لائل پوری اور نخشب جیسے نغمہ نگاروں نے اسی دور میں اپنی زندگی کے بہترین فلمی نغمے لکھے۔

فلمی دنیا کے اسی سنہرے دور میں اشوک کمار، پرتھوی راج کپور، بلراج ساہنی، دلیپ کمار، دیوآنند، راجندر کمار، دھرمیندر، پردیپ کمار، بھارت بھوشن اور جیتندر جیسے مقبول ترین اداکاروں نے اپنی اداکارانہ صلاحیتوں سے فلمی شائقین سے خوب داد وتحسین حاصل کی۔ نرگس، ثریا، مدھوبالا، مینا کماری، وحیدہ رحمٰن، وجینتی مالا، سادھنا، نوتن، مالا سنہا اور آشا پاریکھ جیسی اداکاراؤں نے اپنے حسن اور اداکاری سے فلم بینوں کا دل جیتا اور مقبولیت کی معراج حاصل کی۔ پران، جیون، کنہیا لعل، کے این سنگھ، اے این انصاری، تیواری جیسے ولن فلموں کو دیے اور جانی واکر، محمود، مرزا مشرف، یعقوب، جگدیپ اور کیشٹو مکرجی، موہن چوٹی، اسیت سین اور سندر جیسے مزاحیہ اداکاری میں باکمال فنکار فلمی دنیا کو دیے، جنھوں نے انتہائی نازک موقعوں پر بھی فلم بینوں کا ہنساتے ہنساتے بُرا حال کردیا۔ شمشاد بیگم، طلعت محمود، محمد رفیع، لتا منگیشکر، نور جہاں، ثریا، آشا بھونسلے، مکیش، مہندر کپور جیسے باکمال گلوکاروں نے فلمی تاریخ کے بہت سے بہترین اور بے حد مقبول نغموں کو اپنی آواز کے سحر میں صدابند کرا کے امر کر دیا۔

فلمی دنیا کے اسی سنہرے دور میں فلموں کے بہترین سیٹ لگائے گئے۔ بہترین فوٹوگرافی ہوئی اور بہترین ڈریس ڈیزائننگ ہوئی۔ یہی وہ دور تھا جس میں سنیما کے سو برسوں کے سہانے سفر کی سب سے کامیاب اور تکنیکی طور پر بہترین فلمیں بنیں۔

یہاں ہم سب سے پہلے محبوب خان کی فلم 'مدر انڈیا' کا ذکر کریں گے۔ محبوب خان نے پہلے فلم 'عورت' بنائی تھی جو کافی کامیاب ہوئی تھی۔ پھر جب رنگین فلموں کا دور شروع ہوا تو انھوں نے فلم 'عورت' کو ہی نئے انداز میں اور بڑے پیمانے پر 'مدر انڈیا' کے نام سے بنایا۔ اس فلم میں اداکارہ نرگس نے ایک ایسی عورت کا کردار ادا کیا ہے جو اپنے شوہر کے انتقال کے بعد اپنے تین بچوں کی پرورش کرنے کے لیے ہر قسم کی مصیبت اور پریشانی جھیل لیتی ہے، مگر اپنی عزت کا سودا نہیں کرتی اور آخر میں ایک عورت کی عزت بچانے کے لیے اپنے چہیتے بیٹے کو قربان کر دیتی ہے۔ اس فلم کو ہندوستانی فلموں میں ملینیم فلم کا اعزاز دیا گیا ہے۔

فلم 'مغل اعظم' کے آصف نے اپنا سب کچھ داؤں پر لگا کر سولہ برس میں تیار کی تھی اور جب یہ فلم ریلیز ہوئی تو اس نے نہ صرف یہ کہ کامیابی کے سابقہ سارے ریکارڈ توڑ دیے بلکہ مقبولیت کے بھی کئی نئے ریکارڈ بنائے۔ بلیک اینڈ وہائٹ فلم ہوتے ہوئے بھی اس فلم کی کردار سازی، سیٹ، نغمے، موسیقی، اداکاری، ہدایتکاری، فوٹوگرافی، مکالمہ نگاری...... تقریباً ہر شعبے کے لیے ہر طرف سے تعریف وتوصیف کے انبار لگ گئے۔ یہ بادشاہ اکبر کے عدل وانصاف اور سلیم انارکلی کی محبت کی کہانی تھی۔ اس فلم کی مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ 2008 میں سب سے پہلے اسی فلم کو تکنیکی ترقی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے رنگین کر کے دوبارہ ریلیز کیا گیا اور اس نے پھر سے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے۔

گرودت کی فلم 'صاحب، بی بی اور غلام' ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو اپنے زمیندار شوہر کی توجہ حاصل کرنے کے لیے بناؤ سنگھار کے علاوہ شراب نوشی تک پر آمادہ ہو جاتی ہے مگر سماجی روایتوں اور زمیندارانہ سسٹم کی نذر ہو کر اپنی زندگی ختم کر لیتی ہے۔

بمل رائے کی فلم 'دو بیگھہ زمین' بھی بلراج ساہنی کی اداکاری اور کہانی کی بنت کی وجہ سے سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے اور ہندوستانی کسان کی زندگی اور اس کے مسائل سے لوگوں کو روشناس کراتی ہے۔ گرودت کی ہی دوسری فلم 'چودھویں کا چاند' ہندوستانی مسلمانوں کی تہذیب، روایات اور نوابی دور کی ایک رومانٹک کہانی پر مبنی خوبصورت اور کامیاب ترین فلم ہے۔ اسی طرح گرودت کی ہی فلم 'پیاسا' اور 'کاغذ کے پھول' اپنی کہانی، نغموں، موسیقی اور ہدایتکارانہ فنکاری کے لیے ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

بی آر چوپڑہ کی فلم 'وقت' اپنے زمانے کی کامیاب ترین فلم ہے۔ اس فلم کی کہانی ایک بھرپور خاندان کے بکھرنے اور پھر سب کے یکجا ہونے کی بہترین بنت والی کہانی ہے۔ اس فلم میں راجکمار، سنیل دت اور ششی کپور، تین ہیرو ہیں، اور سادھنا، شرمیلا ٹیگور ہیروئنیں ہیں۔ بلراج ساہنی کی بہترین اداکاری کے علاوہ اور بھی کئی مشہور اداکار فلم میں موجود ہیں۔ اس فلم میں ساحر لدھیانوی کے سبھی نغمے بے حد مقبول ہیں اور عدالت کے لمبے لمبے سین کافی دلچسپ اور سنسنی خیز ہیں۔ یہ ایک خوبصورت اور کامیاب ترین فلم ہونے کا درجہ حاصل کر سکی ہے، اور ہندوستان کی پہلی ملٹی اسٹارس فلم بھی یہی ہے۔

ستر کی دہائی ختم ہوتے ہوتے ہندوستانی فلموں میں تشدد، سیکس اور بھونڈے نغموں اور شور شرابے والی موسیقی کی بھرمار شروع ہو چکی تھی۔ ایسے دور میں ہندوستانی فلم بین معیاری سنیما سے مایوس ہو گئے تھے کہ اچانک 1972 میں کمال امروہی کی فلم 'پاکیزہ' نمائش کے لیے پیش ہوئی۔ حالانکہ یہ فلم ریلیز ہونے کے سولہ سال قبل بنائی شروع ہوئی تھی۔ مگر کمال امروہی اور فلم کی ہیروئن مینا کماری کے اختلافات کی وجہ سے ڈبوں میں بند ہو گئی تھی۔ جب یہ فلم ریلیز ہوئی تو اس نے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ

غیر ممالک میں بھی کامیابی کے نئے ریکارڈ بنائے۔ اس فلم کے تمام گانے مقبول ہوئے، راجکمار اور مینا کماری کی اداکاری کو سراہا گیا اور فلم کی کہانی اور مکالموں کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ ایک ایسی طوائف کی کہانی تھی جو زمیندارانہ نظام کی پیداوار تھی مگر وہ طبقہ اس کو اپنانے کو تیار نہیں تھا۔ آخر کار اسی روایتی نظام کا نئی نسل کا ایک نوجوان ان فرسودہ روایات کی نفی کرتا ہے اور اس کو اپناتا ہے۔

انگریزی ناول کی کہانی پر بنی دیو آنند کی فلم 'گائیڈ' بھی ہندوستانی سنیما کے سفر میں میل کا پتھر ثابت ہوئی۔ حالانکہ یہ ایک گائیڈ اور ایک ماہر آثار قدیمہ کی ڈانسر بیوی کی کہانی ہے۔ اس فلم کی ہدایت وجئے آنند گولڈی نے کی تھی اور پوری فلم پر ان کی بھرپور پکڑ ہے۔ دیو آنند کی تمام زندگی کی بہترین اداکاری اس فلم میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ اسی طرح مرکزی کردار میں وحیدہ رحمٰن کی اداکارانہ صلاحیتوں اور ان کے کلاسیکل رقص کی فنکارانہ پیش کش نے اس فلم کو سنگ میل کا درجہ عطا کر دیا ہے۔ فلم کے گانے بے حد مقبول ہیں۔ سیٹ بہت عمدہ ہیں اور موسیقی میں ایس۔ ڈی۔ برمن نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کا استعمال کیا ہے۔ اپنی کہانی کی باریکیوں اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے پیغام کی وجہ سے یہ فلم عوام وخواص پر اپنا اثر چھوڑتی ہے۔

اداکار دلیپ کمار نے اپنی ہدایت کاری میں فلم 'گنگا جمنا' بنائی۔ یہ فلم زمیندارانہ دور کی کہانی ہے جس کے ظلم وستم سے گاؤں کا ایک نوجوان ڈاکو بن جاتا ہے۔ جبکہ اس کا چھوٹا بھائی تعلیم حاصل کرکے پولیس انسپکٹر بن جاتا ہے اور آخر میں اپنے فرض پر رشتوں کو قربان کر دیتا ہے۔ یہ پوری فلم اور اس کے نغمے بھوجپوری زبان میں ہونے کے باوجود یہ ایک ہندی فلم ہے اور عوام وخاص میں بے حد مقبول ہوئی۔ موسیقار نوشاد علی کے سنگیت میں شکیل بدایونی کے نغمے بے حد مقبول ہوئے، جو انھوں نے بھوجپوری لہجے کی چاشنی میں ڈوب کر لکھے تھے۔ اس طرح یہ ایک یادگار فلم بن گئی۔

ہدایتکار ایچ۔ ایس۔ رویل کی فلم 'میرے محبوب' بھی فلمی دنیا کے اس سفر میں ایک اہم پڑاؤ ہے۔ حالانکہ یہ فلم نوابی دور کے لکھنؤ کی ایک عام رومانٹک کہانی پر مبنی ہے، مگر اس فلم کی کہانی کی بنت، فلم کی موسیقی اور نغمے بہت عمدہ ہیں۔ اس فلم کے اداکاروں میں سادھنا، راجندر کمار، اشوک کمار، نمی اور امیتا کے علاوہ مزاحیہ اداکار جانی واکر نے بھی فلم بینوں کو بہت متاثر کیا ہے۔ فلم کے سیٹ بہت عمدہ ہیں اور سب سے بڑھ کر فلم کی ہدایتکاری کے سبب مسلم معاشرے کی تہذیب وثقافت کی بہترین جھلک اس فلم میں ملتی ہے۔ یقیناً یہ ایک خوبصورت اور کامیاب فلم ہے۔

فلمساز وہدایتکار راج کپور ایک کامیاب فلمساز تھے اور انھوں نے کئی بہترین فلمیں بنائیں۔ فلم 'سنگم' اپنی کہانی، موسیقی، نغموں، فوٹوگرافی اور اداکاری کے لحاظ سے ایک بہترین فلم ہے۔ اس میں وجینتی مالا نے مرکزی کردار بڑی خوبصورتی سے ادا کیا ہے اور سائیڈ ہیرو کے کردار میں راجندر کمار نے بہترین اداکاری کی ہے۔ اس فلم میں پہلی بار دو انٹرویل رکھے گئے تھے کیونکہ فلم کی لمبائی بہت زیادہ تھی۔ ہندوستانی فلموں کے سفر میں فلم 'سنگم' بھی میل کا ایک پتھر ثابت ہوئی۔ اسی طرح راج کپور کی فلم 'میرا نام جوکر' ان کی زندگی کی سب سے بہترین فلم تھی مگر چند نامعلوم وجوہات کی بنا پر یہ فلم ناکام ہوگئی تھی۔

رمیش سپی کی فلم 'شعلے' حالانکہ ایک چھوٹے بجٹ کی مار دھاڑ والی کاؤبوائز ٹائپ کی خالص تفریحی فلم کے طور پر بنائی گئی تھی، مگر اس فلم نے ریلیز ہونے کے فوراً بعد سے ہی ایسی دھوم مچائی کہ عالمی سطح پر سب سے زیادہ ایک ہی سنیما ہال پر چلنے والی کنگ بروس لی کی فلم 'اینٹر دی ڈریگن' کا بھی ریکارڈ توڑ دیا۔

اس فلم کی اسکرپٹ بہت چست اور دم دار ہے جس کی وجہ سے فلم بین شروع سے آخر تک فلم سے نظر نہیں ہٹا پاتے۔ کردار سازی بہت عمدہ کی گئی ہے اور مکالمے برمحل اور چست ہیں۔ فلم کی موسیقی حالانکہ تیز اور شور شرابے والی ہے مگر فلم کے موضوع سے مطابقت رکھتی ہے۔ گانے بھی دلچسپ اور مقبول ہیں۔ کل ملاکر یہ فلم بھرپور تفریح فراہم کرنے اور سپر ہٹ فلم ثابت ہونے کی وجہ سے فلمی سفر میں میل کے پتھر کی حیثیت رکھتی ہے۔

ویسے تو فلم 'دیوار' کے فلمساز گلشن رائے تھے، مگر اس فلم کی پبلسٹی میں کہا گیا تھا 'سلیم جاوید کی دیوار'...... سلیم جاوید کہانی کار اور مکالمہ نگار جوڑی تھی جو اپنی لگاتار کئی فلموں کی کامیابی سے اتنی مقبولیت حاصل کر چکے تھے کہ فلم دیوار کی پبلسٹی ان کے ہی نام سے کی گئی تھی۔ یہ فلم حالانکہ ایک اسمگلر کے جرائم اور اس کے انجام کی کہانی تھی مگر اس میں جو مختلف پہلو نکالے گئے تھے، انھوں نے کہانی کو بہت دلچسپ بنا دیا تھا۔ دو بھائیوں کے الگ الگ راستوں پر چل نکلنے کے فارمولے کو اس فلم میں بڑی چابکدستی سے پیش کیا گیا تھا۔ اس فلم کی اسکرپٹ بہت چست اور مکالمے بہت جاندار ہیں۔ اپنے دور کی یہ بھی ایک کامیاب ترین فلم ہے اور مائل اسٹون کا درجہ رکھتی ہے۔

اپنے سنہرے دور میں فلمی دنیا میں اور بھی بہت سی عمدہ

ہندوستانی فلموں کا سو برس کا یہ سفر بہت دلچسپ ہے اور کامیاب بھی ہے اور ہم اُمید کرتے ہیں کہ وقت آئے گا کہ جب دوبارہ سے ہندوستان میں فلموں کا معیار بلند ہوگا اور بطور فن اس پیشے کو پہچان ملے گی۔ آج فلمسازی کے میدان میں ہندوستان دوسرے نمبر پر ہے، اُمید ہے کہ آنے والے وقت میں ہمارا ملک نمبر ایک پر آئے گا۔

فلمیں بنی ہیں مگر ان سب کا ذکر کرنے کے لیے پورے ایک دفتر کی ضرورت درکار ہوگی۔

گزشتہ صدی کے اسّی اور نوّے کی دہائیوں سے لے کر اب تک ہماری ہندوستانی فلمی دنیا نے بے حد ترقی کی ہے۔ تکنیکی طور پر بھی اور فلم میکنگ کے ہر شعبے میں نئے نئے تجربے ہوئے ہیں۔ بہت سے پیچیدہ مسائل پر بھی فلمیں بنی ہیں۔ بہت سے نئے اداکار اور اداکاراؤں نے اپنی صلاحیتوں سے متاثر کیا ہے۔ فلم کی فوٹوگرافی اور صدابندی میں بھی بہت ترقی ہوئی ہے۔ کاروباری لحاظ سے بھی بڑے بڑے بجٹ کی بہت سی فلمیں بنی ہیں اور انھوں نے کمائی بھی خوب کی ہے۔ مگر کل ملاکر کہیں نہ کہیں فلموں کا معیار کم ضرور ہوا ہے۔ آج کل ٹیلی ویژن یعنی فاصلہ نمانے اور سی ڈی اور ڈی وی ڈی کے کاروبار نے فلموں کو گھر کے ڈرائنگ روم اور بیڈروم تک پہنچا دیا ہے، اس کے باوجود فلموں کے معیار میں کمی آئی ہے۔ آج فلموں کا بجٹ لاکھوں سے بڑھ کر کروڑوں میں پہنچ گیا ہے اور آمدنی بھی کروڑوں تک پہنچ گئی ہے، مگر یادگار ہو جانے والی فلموں کی تعداد میں بے حد کمی آئی ہے۔

کل ملاکر ہندوستانی فلموں کا سو برس کا یہ سفر بہت دلچسپ ہے اور کامیاب بھی ہے اور ہم اُمید کرتے ہیں کہ وقت آئے گا کہ جب دوبارہ سے ہندوستان میں فلموں کا معیار بلند ہوگا اور بطور فن اس پیشے کو پہچان ملے گی۔ آج فلمسازی کے میدان میں ہندوستان دوسرے نمبر پر ہے، اُمید ہے کہ آنے والے وقت میں ہمارا ملک نمبر ایک پر آئے گا۔

■

Anees Amrohvi F-5, First Floor, Jawahar Park (w) Laxmi Nagar, Delhi - 110092

تبصرہ و تعارف

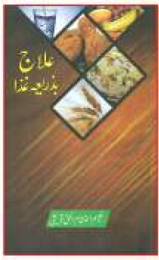

علاج بذریعہ غذا

مصنف: حکیم احتشام الحق قریشی

صفحات: 415، قیمت: 185 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

مبصر: شمیم ارشاد اعظمی، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ علم الادویہ اسٹیٹ یونانی، میڈیکل کالج، الہ آباد یوپی

حکیم احتشام الحق قریشی کا شمار ممتاز طبی اسکالر میں ہوتا ہے۔ نصف درجن سے زائد طبی کتب کے مصنف ہیں۔ تکمیل الطب کالج لکھنؤ اور اسٹیٹ یونانی میڈیکل کالج الہ آباد کے پرنسپل رہ چکے ہیں۔ علاج معالجہ سے خاص شغف ہے۔ ادویہ آپ کا خاص موضوع ہے۔ کلیات ادویہ سے متعلق آپ کی نہایت محققانہ کتاب 'مقدمہ علم الادویہ' طبی حلقوں میں بہت ہی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ادویہ مفردہ پر بھی آپ کی 'افعال الادویہ' کے نام سے ایک کتاب شائع ہوچکی ہے۔ ادویہ سے متعلق آپ کا ایک اہم اور تاریخی کارنامہ 'انیسویں صدی میں علم الادویہ کی رفتار ترقی' ہے۔ زیر تبصرہ کتاب 'علاج بذریعہ غذا' اس سلسلے کی چوتھی کڑی ہے۔ یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی سے 2016 میں شائع ہوئی ہے، اس کی پہلی اشاعت 1999 میں عمل میں آئی تھی۔ راقم کے پیش نظر اس کی تیسری طباعت ہے۔ یہ کتاب 415 صفحات پر مشتمل ہے۔

کتاب کی ابتدا اشارات سے شروع ہوتی ہے، یہ دراصل مصنف کا مقدمہ ہے۔ اس کے بعد غذا کی تعریف، غذا اور دوا کا فرق اور طب یونانی میں غذا کی تقسیم کا عنوان قائم کیا گیا ہے، پھر علاج بذریعہ غذا۔ چند بنیادی اصول کا ذکر ہے، اس کے بعد معدہ اور جگر کی عموماً مضر غذائیں، پھلوں کو نہار منھ کھانے کی ممانعت، مریضوں کے لیے غذائی قوانین، مختلف غذاؤں میں غذائی اجزا کا تناسب، مختلف غذاؤں کے ہضم ہونے کے اوقات، نباتی غذائیں، حیوانی غذائیں، حیوانی اور نباتی اعضاء سے علاج، حیوانی اعضاء سے علاج، حفظ صحت کا غذائی نظام، پانی اور برف کی طبی اہمیت، غذائی علاج کی تفصیل کو بیان کیا گیا ہے۔

غذا سے متعلق یہ اہم مباحث ہیں جن کا جاننا نہایت ضروری ہے ورنہ یہی غذائیں جو صحت کے لیے استعمال کی جاتی ہیں وہیں ان کا غلط اور زیادہ استعمال صحت کے لیے نقصان دہ بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ غذائی علاج کی تفصیل کے تحت اغذیہ کا تذکرہ حروف تہجی کے اعتبار سے کیا گیا ہے، عام طور سے غذاؤں کا تذکرہ ان کے مشہور اور مقبول ناموں سے کیا گیا ہے۔ ہر ایک غذا کے بیان میں اس کی ماہیت، مزاج اور افعال وخواص کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ غذا کے مضرت اور ضرر رساں پہلو کو بھی بیان کیا گیا ہے نیز ساتھ ہی ان کے مصلح کا بھی ذکر کیا گیا ہے تاکہ ان کی مضرت سے بچا جا سکے۔ کہیں کہیں غذاؤں کا بدل بھی لکھا گیا ہے۔ اس کتاب میں کل 284 غذائیں شامل ہیں۔ ان غذاؤں کا خاص طور سے تذکرہ کیا گیا ہے جو روزمرہ کے استعمال میں ہیں، ان میں سبزیاں، پھل، اناج اور گوشت بطور خاص شامل ہیں۔ غذاؤں سے متعلق عام رجحان یہ ہے کہ غذائیں صرف لذت کام ودہن بخشتی ہیں۔ اس کتاب کا مقصد اغذیہ کی طبی افادیت سے لوگوں کو متعارف کرانا ہے۔ مصنف 'اشارات' میں اس کتاب کی غرض و غایت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''طب میں غذا سے علاج کا مضمون مستقل انداز میں بیان نہیں کیا گیا ہے، بلکہ وہ علم الادویہ اور علم العلاج کے ذیل میں بکھرا ہوا ہے۔ اس لیے صرف انھیں لوگوں کے لیے کارآمد ہے جو ان طبی علوم پر گہری اور وسیع نظر رکھتے ہیں، لیکن اس کی ضرورت و افادیت اس خاص طبقے کے لیے مخصوص نہیں ہے، بلکہ وہ عوامی ضرورت اور فائدے کی چیز ہے اور یہ استفادہ اس وقت ممکن ہوسکتا ہے جب بکھرے ہوئے موتی ایک لڑی میں پرو کر ایک خوبصورت ہار کی شکل میں پیش کیے جائیں، یہ کتاب اسی غرض کے لیے مرتب کی گئی ہے۔''

قومی اردو کونسل کی
کتابیں

غذاؤں کا تذکرہ الفبائی کے اعتبار سے کیا گیا ہے۔

مصنف نے اس کتاب میں غذاؤں کے اصول سے متعلق طویل بحث کی ہے۔

اس کتاب کا ایک اہم عنوان مریض کے لیے غذائی قانون بھی ہے۔ مصنف کتاب لکھتے ہیں کہ بیماری کی حالت میں غذاؤں کے استعمال کا مسئلہ بہت ہی نازک اور اہم ہے۔ کیونکہ بہتر سے بہتر دوائیں استعمال کی جائیں لیکن اگر غذا کا استعمال صحیح اور حسب موقع نہیں ہے، تو علاج میں کامیابی ممکن نہیں ہے۔ اس لیے غذا کے دینے اور نہ دینے اور غذا کے تجویز کرنے میں معالج کو نہایت فراست کے ساتھ یہ اندازہ قائم کرنا چاہیے کہ بغیر غذا کے مریض کی قوت کب تک قائم رہ سکتی ہے۔ چنانچہ اس اندازہ کے مطابق حسب ضرورت ہلکی پھلکی غذا تجویز کرنی چاہیے یا پھر فاقہ کرایا جائے۔

اسی عنوان کے تحت مضر غذاؤں کا بھی ذکر ہے۔ وہ غذائیں جو ہر ایک مریض کے لیے نقصان دہ ہیں، انھیں ثقیل غذا کے نام سے جانا جاتا ہے۔

یہ کتاب مواد اور معلومات کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ انداز بیان دلکش ہے اور ہر سطح کے لوگوں کے لیے نہایت مفید ہوسکتی ہے۔ کاغذ اور طباعت جدید معیار کے مطابق ہیں اور قیمت بھی مناسب ہے۔

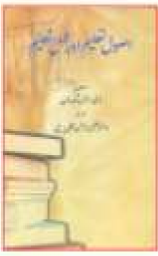

اصول تعلیم اور عمل تعلیم

مصنف: ڈی ایس گورڈن، مترجم: ڈاکٹر خلیل الرحمن سیفی پریمی،
صفحات: 330، قیمت: 155، سنہ اشاعت: 2016
ناشر: ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی
مبصر: شاہ عمران حسن
C-120، کشوری اپارٹمنٹ، سکنڈ فلور، شاہین باغ، نئی دہلی

زیر نظر کتاب 'اصول تعلیم اور عمل تعلیم' ممتاز ماہر تعلیم و مصنف ڈی ایس گورڈن کی تحریر کردہ ہے جس کا اُردو ترجمہ ڈاکٹر خلیل الرحمن سیفی پریمی نے کیا ہے۔ اُردو ترجمہ نہایت سلیس انداز میں کیا گیا ہے۔ کتاب کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کتاب اُردو میں ہی لکھی گئی ہے۔

یہ کتاب اصلاً مدرسین کے لیے تحریر کی گئی ہے اور وہ بھی ہندوستانی مدرسین کے لیے جو دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصے میں اصول تعلیم پر بحث کی گئی ہے جب کہ دوسرے حصے میں تنظیم مدرسہ پر، دونوں حصے میں بارہ بارہ ابواب ہیں۔ ذیل میں ابتداً پہلے حصے کے بارہ ابواب پر مفصل بات کی جا رہی ہے، اس کے بعد دوسرے حصے پر مختصر گفتگو کی جائے گی۔

پہلے باب میں اصول تعلیم پر بحث کی گئی ہے۔ اس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ تعلیم کی اصل کیا ہے اور سماج میں یہ کس طرح ارتقائی منزل پر پہنچی۔ سماج میں کس کس طرح سے تعلیم کا سلسلہ چلا۔ نیز تعلیم کے وسائل کیا رہے ہیں یعنی تعلیم کے حصول کا ذریعہ سماج میں کیا کیا رہا ہے۔ جب کہ دوسرے باب میں مشرق میں مروجہ تعلیم کا تذکرہ ملتا ہے۔ مثلاً چینی سماج، برہمنی نظام، بدھ نظام، مسلم سماج، برطانوی تعلیمی نظام کا مفصل ذکر کیا گیا ہے جو اساتذہ کے لیے دل چسپی کا باعث ہے۔

تیسرا باب یورپ میں مروجہ تعلیم پر گفتگو کرتا ہے۔ مثلاً یونان، اسپارٹی تعلیم، ایتھنی تعلیم، سقراط، افلاطون، ارسطو کا نظریہ تعلیم، رومی تعلیم پر صاحب کتاب نے سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ یہ نہ صرف تعلیمی گفتگو ہے بلکہ اس میں تاریخ کا عنصر بھی نظر آتا ہے۔ جب کہ کتاب کا چوتھا باب تعلیم میں سائنسی نقطہ نظر پر گفتگو ہے۔ اس میں تعلیم کی فنی اصطلاحات پر بات کی گئی ہے کہ تعلیم آرٹ ہے یا سائنس۔ علم حیاتیات، علم عضویات، علم نفسیات، علم سماجیات، منطق، اور تعلیم میں شماریات کے حوالے سے اچھی بحث کی گئی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ اساتذہ کرام فنی اصطلاحات سے واقفیت حاصل کرسکیں۔ پانچواں باب بہت اہم ہے۔ اس باب میں تعلیم کے مقاصد پر صاحب کتاب نے اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔ وہ یہ بتاتے ہیں کہ تعلیم حاصل کرنے کے مقاصد کیا ہیں۔ مثلاً معاش، علم، سماجی کارکردگی، اخلاقی مقاصد، فرصت، متوازن شخصیت، باہمی تعاون وغیرہ پر مختصر نوٹ تحریر کیا گیا ہے جو کسی بھی قاری کے مطالعے کے لیے دل چسپی کا باعث ہے۔

چھٹا باب تعلیمی عمل سے متعلق ہے۔ اس میں مصنف نے یہ بتایا ہے کہ تعلیمی عمل کس طرح سماجی ورثے کی حیثیت سے نسل در نسل منتقل ہوتا رہتا ہے اور اس کے طریق کار کیا ہیں اور ساتواں باب 'بچے' کی نفسیات کے مطالعے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ تعلیم کی ترسیل کے وقت بچے کی نفسیات کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ اس میں پروفیسر ریمانٹ اور پروفیسر باگلے کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

آٹھواں باب استاد و شاگرد کے رشتے پر تحریر کیا گیا ہے۔ نویں باب میں نصاب کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔ کتاب کا دسواں باب طریقہ تدریس کے اصول پر مشتمل ہے۔ جب کہ گیارہواں باب تدریسی تکنیک پر بحث کرتا ہے کہ تعلیم دینے کے لیے کس کس تکنیک کا سہارا لیا جا سکتا ہے۔ اور آخری باب مرکز تعلیم پر مبنی ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ تنظیم مدرسہ سے تعلق رکھتا ہے، یہ بھی بارہ ابواب پر مشتمل ہے، اس میں تکنیکی گفتگو کی گئی ہے۔ مثلاً سماج اور مدرسہ کا تعلق، اقامتی مدرسہ، اسکول اسمبلی، اسکول کی ذمہ داری، انعام اور سزا، اسکول کے تہذیبی مشاغل، مدرسہ کی عمارت و ساز سامان، استاد کی شخصیت، طلبہ کی درجہ بندی، نظام اوقات، مدرسہ کے فرائض، مدرسہ کی صحتی زندگی، اسکول کا ریکارڈ، امتحان اور جانچ وغیرہ پر مفصل گفتگو کی گئی ہے۔

غرض کہ مدرسین کے لیے یہ ایک مفید کتاب ہے، جس کا مطالعہ مدرسین کو ضرور کرنا چاہیے تاکہ وہ تدریس کے فرائض انجام دیتے ہوئے اس سلسلے کی تمام دشواریوں اور اصطلاحوں کو سمجھ کر مثبت قدم اُٹھائیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اس اعتبار سے مبارک باد کی مستحق ہے کہ مدرسین کے لیے ایک نایاب کتاب کو دوبارہ شائع کیا ہے۔

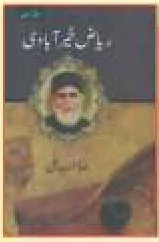

ریاض خیر آبادی (مونوگراف)

مصنف: صاحب علی
صفحات: 115، قیمت: 75 روپے، سنہ اشاعت: 2016
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: رئیس صدیقی
302/11، شاہجہان آباد اپارٹمنٹس، سیکٹر 11، دوارکا، نئی دہلی 75

ریاض خیر آبادی پر یہ مونوگراف پروفیسر صاحب علی نے تیار کیا ہے۔ صاحب علی شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی سے وابستہ ہیں۔ ان کی دس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ صاحب علی نے 'مہاراشٹر میں اردو افسانہ: تاریخ و تنقید' کے موضوع پر بھی تحقیقی کام کیا ہے۔

ریاست اودھ میں قصبہ خیر آباد، تاریخی، سیاسی، ادبی اور تہذیبی لحاظ سے ہمیشہ ممتاز حیثیت کا مالک رہا ہے۔ ایک طرف سیاسی اعتبار سے خیر آباد کو شہرت دوام بخشنے کا سہرہ علامہ فضل حق خیر آبادی کے سر ہے تو دوسری جانب اقلیم شعر و سخن کے حوالے سے ریاض خیر آبادی کا نام اہم اور نمایاں ہے۔ وہ قصبہ خیر آباد ضلع سیتا پور اتر پردیش میں 1853 میں پیدا ہوئے اور 28 جولائی 1934 کو اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

ریاض نے اسیر کی شاگردی میں باقاعدہ اپنی شاعری کا آغاز کیا اور آشفتہ تخلص رکھا لیکن بہت جلد اس تخلص کو بدل کر ریاض تخلص اختیار کیا۔ ابتدا میں مشکل پسندی ان کی شاعری کی خصوصیت تھی۔ غالب کی زمینوں میں ریاض نے بہت سی غزلیں کہیں۔ اسیر صاحب ریاض کی اس مشکل پسندی سے ناراض تھے۔ لہٰذا ریاض بہت جلد سہل گوئی کی طرف متوجہ ہوئے۔

ابتدائیہ، سوانح و شخصیت، ادبی و تخلیقی سفر، تنقیدی محاکمہ، انتخاب کلام کے عنوانات سے صاحب علی نے سمندر کو کوزہ میں سمیٹ کر ریاض خیر آبادی جیسے مقبول عام شاعر کو قاری سے بڑی خوب صورتی سے روبرو کرایا ہے۔

سوانح و شخصیت کے تحت ذیلی عنوانات قائم کرکے ریاض خیر آبادی کا خاندانی پس منظر، ریاض کے احباب، ریاض کے رومان، ریاض کے تلامذہ، ادبی و تخلیقی سفر کے ذیلی عنوانات کے تحت شاعری، صحافت، ترجمہ نگاری اور تنقیدی محاکمہ کے ذیلی عنوانات کے تحت شاعری، ریاض اور دیگر اصناف شاعری، ریاض خیر آبادی کی صحافت نگاری اور انتخاب کلام کے تحت 47 غزلیں شامل کتاب ہیں۔

ریاض خیر آبادی کو اردو میں خمریاتی ادب کے عظیم نمائندہ شاعر کا مرتبہ حاصل ہے۔ انھوں نے شراب کو کبھی منھ نہیں لگایا۔ ریاض کو خمریہ شاعری کا امام تسلیم کیا جاتا ہے لیکن ان

کے مذہبی کلام کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔

ریاض خیرآبادی نہ صرف اردو کے بے حد اہم شاعر تھے بلکہ صحافت سے بھی ان کا گہرا رشتہ تھا اور وہ بہت اچھے مترجم بھی تھے۔ انھوں نے رینالڈ کے تین ناولوں کے اردو ترجمے کیے۔ حرم سرا، نظارہ، تصویر جو بہت مقبول ہوئے۔ لیکن ریاض خیرآبادی اردو دنیا میں شاعر خمریات کی حیثیت سے ہی مشہور و مقبول ہوئے۔ ریاض خیرآبادی غزل کے شاعر تھے اور تقریباً پانچ سو غزلوں پر مشتمل ان کا مکمل دیوان موجود ہے۔

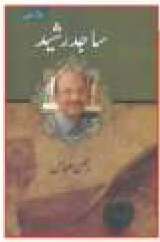

ساجد رشید (مونوگراف)

مصنف: رحمان عباس

صفحات: 123، قیمت: 77 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: اسرار گاندھی، C-5، گلاب باڑی کالونی، الہ آباد (یوپی)

ساجد رشید مرحوم پر یہ دوسری کتاب ہے۔ پہلی کتاب افسانہ نگار اشتیاق سعید نے مرتب کی ہے۔ جس میں ساجد پر لکھے گئے مضامین کو یکجا کیا گیا ہے۔

اس کتاب کو رحمان عباس نے پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

پہلا باب ساجد رشید کی شخصیت اور ادبی سفر پر مبنی ہے۔ دوسرا باب ان کی کتابوں سے متعلق ہے۔ تیسرا ان کی افسانہ نگاری پر ہے۔ چوتھے باب میں رحمان عباس نے ان کی کہانیوں کا انتخاب کیا ہے اور پانچواں کتابیات سے تعلق رکھتا ہے۔

میں نے جب بھی کسی مونوگراف کو پڑھا تو ہمیشہ یہ خیال گزرا کہ جس کا مونوگراف لکھا جارہا ہے وہ کوئی پیر یا بزرگ شخصیت ہیں اور وہ تمام انسانی کمزوریوں سے دور ہیں۔ اس نے کبھی کوئی ایسی حرکت یا ایسے کام نہیں کیے جو قابل اعتراض ہوتے۔ لیکن سچائی یہ ہے کہ تمام انسانوں کے اندر نیکیوں کے ساتھ کمزوریاں بھی ہوتی ہیں۔ ساجد کے اندر بھی انسانی کمزوریاں تھیں لیکن ان کے اندر اچھائیاں اتنی کثرت سے تھیں کہ ان اچھائیوں نے ان کی کمزوریوں پر پردہ ڈال رکھا تھا۔

رحمان عباس نے پوری کوشش کی ہے کہ ان کی زندگی کے تمام پہلو سامنے آجائیں۔ پھر بھی اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے کچھ اور باتیں لکھنی چاہیے تھیں۔ مثلاً انھوں نے تسلیمہ نسرین کا ذکر تو کیا ہے لیکن کچھ کترا کر نکل گئے ہیں۔ جب تسلیمہ نسرین کا ممبئی آنا ہوا تو ایک بڑی تعداد میں لوگوں نے ان کی مخالفت کی۔ ساجد نے ایک رائٹ اَپ میں لکھا کہ تسلیمہ کو خوش آمدید کہنے والوں میں سلام بن رزاق، انور قمر اور علی امام وغیرہ تھے۔ اس بات پر ان تینوں نے React کیا اور 'نیا ورق' کے اگلے شمارے میں ان لوگوں کے سخت قسم کے خطوط چھپے۔ ان تینوں نے اس بات کی مخالفت کی کہ ان کا نام ان کی اجازت کے بغیر کیوں لیا گیا۔

یہیں سے ساجد کی کشادہ دلی سامنے آتی ہے۔ انھوں نے ان لوگوں کے خطوط شائع کردیے اور اشارتاً معذرت بھی کی۔

اسی طرح ایک بار بے حد شہرت یافتہ سیکولر Activist ڈاکٹر روپ ریکھا ورما نے ساجد (ان دونوں کے تعلقات خاصے قریبی تھے) سے کہا کہ تم مسلمانوں کے خلاف ہی کیوں لکھتے ہو؟ سب ان کے پیچھے پڑے ہیں، تم بھی اسی میں شامل ہو۔

ساجد نے برجستہ کہا ''میڈم ایک طرف آپ کہتی ہیں سچ لکھو، دوسری طرف آپ سچ لکھنے کے لیے منع بھی کرتی ہیں۔''

پھر انھوں نے مسز ورما سے پوچھا ''کیا مسلمانوں میں بھی فرقہ پرست نہیں ہیں؟'' مسز روپ ریکھا ورما ساجد کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی خاموش ہوگئیں۔

یہ محض اتفاق تھا کہ جب ان کے اور ساجد کے درمیان یہ باتیں ہورہی تھیں تو میں بھی وہاں موجود تھا، میرے علاوہ کچھ دوسرے لوگ بھی موجود تھے۔ بہرحال پھر بھی رحمان عباس نے ان کی شخصیت پر بہت اچھی طرح سے روشنی ڈالی ہے۔ نیز یہ کہ کس طرح سے لڑکپن سے لے کر 16-15 سال کی عمر تک حالات ان پر اثرانداز ہوتے رہے۔

دوسرے باب میں ساجد کی تصنیفات کا ذکر ہے۔ اور ہر کتاب کا ہلکا پھلکا تعارف۔

لیکن تیسرا باب بہت اہم ہے۔ اس باب میں ان محرکات کو تلاش کیا گیا ہے جو ساجد کے لیے کھاد اور پانی کا کام کرتے رہے، لیکن اس باب پر کچھ لکھنے سے پہلے ایک اور بات ہے جو ضروری ہے۔

رحمان عباس نے کئی جگہ لکھا ہے 1970 میں جدیدیت اپنے عروج پر تھی۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے 70 تک آتے آتے جدیدیت ڈھلان پر آگئی تھی۔ افسانے اپنا رنگ بدلنے لگے تھے، زندگی کی سچائیاں اپنا پرتو لے کر آنے لگی تھیں۔ ہاں اسلوب میں جدیدیت کا رنگ ابھی بھی کسی قدر غالب تھا۔ ہاں ایک عجیب بات یہ بھی تھی کہ یہ تبدیلیاں جہاں مہاراشٹر کے کہانی کاروں میں نظر آرہی تھیں وہیں بہار کے کہانی کاروں میں ایسی تبدیلیاں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ وہ ابھی پرانے راستوں کے ہی شہسوار تھے۔

لیکن ساجد رشید ان دونوں طرح کے کہانی کاروں سے الگ اپنی ایک دنیا آباد کیے ہوئے تھے۔ یہ بات ان کی سمجھ میں آگئی تھی کہ زندگی سے کٹ کر لکھی گئی کہانیاں اب بے معنی ہوچکی ہیں۔ اسی لیے ان کی کہانیوں میں زندگی ہر رنگ میں نظر آتی ہے کبھی ہنستی، آہ و بکا کرتی، خوشیوں پر مسکراتی اور دکھوں میں آنسو بہاتی دکھائی پڑتی ہے۔

رحمان عباس نے پوری کوشش کی ہے کہ وہ ساجد کے ذہنی ارتقا، کو تلاش کرسکیں اور پھر اس کی روشنی میں ساجد کے فن کا جائزہ لے سکیں۔ وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہیں۔

چوتھا باب ساجد کی کہانیوں کا انتخاب ہے۔ اس انتخاب میں چار کہانیاں شامل ہیں۔ یہ کہانیاں رحمان عباس کی ذاتی پسند پر مبنی ہیں۔ ویسے عام طور پر یہ کہانیاں سب کو پسند آنے والی ہیں۔ کتابیات میں پندرہ کتابوں کا ذکر ہے۔

بحیثیت مجموعی یہ مونوگراف بہت اچھا لکھا گیا ہے جس کے لیے رحمان عباس قابل مبارکباد ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنونِ لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں. کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی – 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

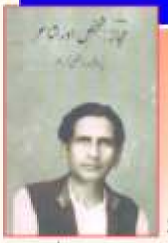

مجاز: شخص اور شاعر

مصنف: پروفیسر ارتضیٰ کریم

صفحات: 164، قیمت: 135، روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: پبلی کیشن ڈویژن، حکومت ہند

مبصر: جمیل اختر، G-18، سی پی ڈبلوڈی کالونی، وسنت وہار، نئی دہلی 54

پروفیسر ارتضیٰ کریم کا نام اردو دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی ان کی ادبی فعالیت نے ایک روشن مستقبل کی ضمانت دے دی تھی۔ تخلیقی ادب سے اپنا ادبی سفر شروع کرنے والے ارتضیٰ کریم افسانوی افق سے تو جیسے غائب ہی ہوگئے اور تحقیق وتنقید کے نئے آسمانوں پر روشن ستارے کی طرح جگمگانے لگے۔ فکشن کی تنقید وتحقیق ان کا خاص میدان رہا ہے اور شعبۂ ادب کو اپنی جانفشانیوں سے کافی وقیع کیا ہے۔ دو درجن سے زائد کتابوں کے مصنف ومرتب کی حیثیت سے ان کا نام افق ادب پر روشن ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'مجاز: شخص اور شاعر' ان کی تازہ ترین تحقیقی تصنیف ہے۔ ان کے اندر کی جولانیوں نے انھیں فکشن سے شاعری کی طرف مراجعت بخشی ہے۔ شاعری کی تحقیق شیشہ گری ہے۔ عزم مستحکم اور متحمل مزاجی اس کے لیے بے حد ضروری ہے اور ساتھ ساتھ شادمانی وسرشاری کی بھی ضرورت ہے۔ جس کی زندگی مجسم پیکر تحرک وتحریک ہو اس میں سنجیدگی فکر کا فقدان ہوتا ہے۔ بزم سازی، احباب بازی اور محفل آرائی کے ساتھ ساتھ سنجیدہ موضوع پر کسی تصنیف کا اس سلیقے سے منظر عام پر آنا محض چار عشری حیات عملی کے دوران محیر العقول کارنامہ ہے۔ اس سے ارتضیٰ کریم کی ادبی وابستگی جو ہر لمحہ مائل بہ پرواز ہے کا روشن ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

مجاز پر یہ مختصر کتابچہ اپنے آپ میں بھرپور تحقیقی مواد رکھتا ہے۔ اس میں 'حیات اور واردات' کے تحت مجاز کے خاندانی پس منظر، اس کی تہذیبی خصوصیات اور اس ماحول کا ذکر بہ تفصیل کیا ہے۔

دوسرا باب 'آہنگ' کی اشاعت اوّل (قصہ یا قضیہ) سے متعلق ہے جس میں ارتضیٰ کریم کی تحقیقی ذکاوت کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ اس باب میں انھوں نے پوری دیانت داری کے ساتھ تحقیقی منصب سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی ہے کہی سنی، سنی سنائی، زبانی، تحریری تمام روایتوں پر مدلل اور مفصل انداز میں منطقی دلائل کی روشنی میں موازنہ و مواخذہ کیا ہے اور یہی اس کتاب کا اصل ماحصل بھی قرار پاتا ہے۔ تمام قرائن وحقائق کی روشنی میں محقق یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ 'آہنگ' مجاز کا پہلا مجموعہ کلام پہلی بار 1940 یا 1942 میں لکھنؤ سے شائع ہوا۔ مجھے لگتا ہے کہ تحقیق کو ابھی آگے کی منزل طے کرنا باقی ہے۔ ان دونوں تاریخوں میں کوئی ایک تاریخ ہی صحیح ہوگی جس سے پردہ اٹھنا ابھی باقی ہے۔

گرچہ ارتضیٰ کریم نے اپنی تحقیق کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے مجاز کے مختلف 'آہنگ' کے نام سے الگ سے ایک پورے باب میں 1938 سے 1952 تک کے تمام اڈیشنوں کا بالتفصیل جائزہ لیا ہے اور ان کی مختلف نظموں کی سنہ اشاعت کے ذریعے 1938 کی اشاعت کو غلط ثابت کیا ہے اور ایک ایک کی تفصیل مجموعے میں شامل نظموں کی سنہ اشاعت کے حوالے سے دی ہے۔ اختلاف متن کے بارے میں تفصیلی گفتگو حوالے کے ساتھ مدلل انداز میں کی ہے جس سے قاری مکمل طور پر مطمئن ہوجاتا ہے۔ مجاز کی زندگی کا انتشار وتضاد ان کے کلام میں درآیا ہے۔ یہ بات ارتضیٰ کریم کے اس جائزے سے مکمل طور پر عیاں ہوجاتی ہے۔ مجاز کے بارے میں اتنی مستند اور مدلل تحقیقی گفتگو پہلی بار میری نظر سے گزری ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا مطالعہ ہے جس میں اتنی تفصیل کے ساتھ مجاز کے کلام کے متن کا تحقیقی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

مجاز کی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے یہ بات واضح کردی کہ مجاز ترقی پسند شاعری کے اہم ستون تھے۔ ان کا شعری ذوق کلاسیکی ادبی روایت کا تربیت یافتہ تو تھا ہی مگر باوجود اس کے انھوں نے اس خمیر کو اپنی شاعری میں جذب کرکے ایک نئی راہ نکالی جس میں ترقی پسندی کے فکری عناصر، کلاسیکی رچاؤ اور جدید لب ولہجہ بھی شامل ہے۔ ان کا مختصر مجموعہ کلام 'آہنگ' کے نام سے شائع ہوا۔ یہ نام اپنے آپ میں شعری وفکری کمالات اور ان انفراد کو سامنے لاتا ہے جو ہندوستانی ادب میں نئے رجحانات کا علمبردار ہے۔ سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ثقافتی تغیر وتبدل کی آمیزش اور اس کے اٹھتے خمیر کی پھوٹتی 'پو' جونئی صبح کی بشارت کا اعلانیہ ہے کا پتہ دیتی ہے۔ آہنگ میں صرف ایک آہنگ نہیں بلکہ رومان و انقلاب سبھی آہنگ شامل ہیں۔ مجاز آخری وقت تک کسی ایک سے بھی غافل نہیں ہوئے۔

مجاز کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے معاصرین میں پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اپنی شاعری میں عورت کی انقلابی روح کو نہ صرف پہچانا بلکہ ان کی نفسیاتی گرہ کشائی کرتے ہوئے سیاسی اور انقلابی معاملات سے انھیں براہ راست جوڑنے کی کوشش کی اور عورتوں کی طاقت، قوت ارادی اور دوراندیشی کی بابت 'آزادی نسواں' کی بھی بات کی اور کہا

ترا شباب امانت ہے ساری دنیا کی
تو خار زار جہاں میں گلاب پیدا کر
جو ہو سکے، ہمیں پامال کرکے آگے بڑھ
نہ ہو سکے تو ہمارا جواب پیدا کر
تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر
جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

عورت کو اپنے وجود، اپنی شخصیت اور اپنی سماجی ذمے داری کا احساس دلانے والی اور مرد کے ہم دوش کرنے والی یہ پہلی نظم ہے۔

اس کتاب میں مجاز کی رومانی اور انقلابی شاعری پر الگ الگ بھرپور گفتگو کی گئی ہے۔ ساتھ ہی غزلیہ شاعری کو موضوع بنایا ہے اور یہ بات ان کی غزلوں کے حوالے سے ثابت کی گئی ہے کہ "جدید غزل میں انقلابی بانکپن کے بنیادگزار مجاز ہیں۔ مجاز کی کوئی بھی غزل عشق ومحبت کی واردات سے متعلق ایسی نہیں جس میں ان کا یہ انقلابی شعور موجود نہ ہو۔"

آخری باب مجاز کے انفراد کا ہے۔ اس پر گفتگو کرتے ہوئے مجاز کے تین اختصاص گنوائے گئے ہیں۔ پہلا: انھوں نے اردو شاعری میں عورت کے اس تصور کو رد کیا جس کے تحت عورت یا محبوب کو صرف پیار ومحبت اور دل بستگی کا سامان سمجھا جاتا تھا۔ انھوں نے پہلی بار عورت کو ہم نشیں کے ساتھ ساتھ ہم قدم اور ہم رکاب بنانے کی کامیاب کوشش کی۔ دوسرا اختصاص نظموں کے ساتھ ان کی غزل گوئی ہے جس سے اس عہد کے ترقی پسند شعرا اجتناب برتتے تھے نظم میں بھی انھوں نے پابند نظم کہہ کر اپنے عہد کے مزاج سے ہٹ کر شاعری کی۔ تیسرا وصف یہ ہے کہ انھوں نے ترقی پسند اقدار کو شاعری میں کچھ اس طرح شامل کیا کہ اسے پروپیگنڈہ نہیں بننے دیا بلکہ شعریت اور موسیقیت کا پورا لطف ان کی غزلوں اور نظموں سے اٹھایا جاسکتا ہے۔

یہ کتاب مجاز پر ایک عمدہ کتاب کہی جاسکتی ہے۔ جس میں مجاز کی زندگی اور شاعری کا بھر پور احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ مجاز پر تحقیق و تنقید کرنے والے ہر فرد کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ مجاز پر کوئی بھی کام اس کے حوالے کے بغیر ادھورا رہے گا۔

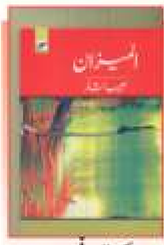

المیزان

مصنف: ڈاکٹر حبیب نثار

صفحات: 304، قیمت: 137 روپے، سنہ اشاعت: 2015

پبلشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: محمد نظام الدین، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

ڈاکٹر حبیب نثار ایک مخلص اور محنتی محقق ہیں، جن کی نگاہیں ادب کے تمام فن پارے پر ہیں۔ وہ ہاشمی، زور، جعفر اور تبسم کی روایتوں کے امین ہیں۔ انھوں نے تحقیق میں نئے نئے گوشوں کی بازیافت کی ہے۔ دکنیات کے ساتھ موسیقی ان کا پسندیدہ موضوع ہے۔ اب تک ان کی کئی کتابیں شائع ہو کر مقبول عام ہو چکی ہیں۔ 'المیز ان' ان کی تازہ ترین تصنیف ہے، جس کا ہر صفحہ معلومات کا خزانہ ہے۔ یہ کتاب 23 مضامین کا مجموعہ ہے۔ جس میں دس مضامین تحقیق و تنقید کے تحت ہیں۔ پانچ مضامین موسیقی کے حوالے سے ہیں، چار مضامین اردو صحافت اور طنز و مزاح سے متعلق ہیں، اور چار مضامین فکشن کے حوالے سے ہیں۔ یہ بات ذہن نشیں رہے کہ بیشتر مضامین پہلے ماہناموں میں شائع ہو چکے ہیں اور کئی بالکل نئے ہیں۔

مصنف کی محنت اور ذوق تحقیق کا اندازہ کتاب کے مطالعے سے ہوتا ہے۔ کتاب میں شامل تمام مضامین تحقیقی اور فاضلانہ ہیں۔ اچھے مضامین اور موسیقی سے متعلق وقیع معلومات سے یہ کتاب اس قدر دلچسپ ہوگئی ہے کہ اس کو مکمل پڑھے بغیر جی کو قرار نہیں آتا۔

ویسے کتاب میں شامل تمام مضامین فکر انگیز ہیں، لیکن پہلا مضمون 'ہندوستانی موسیقی کے فروغ میں امیر خسرو کا حصہ' وسعت مطالعہ اور موسیقی سے دلچسپی کا ثبوت ہے، جس میں ہندوستانی موسیقی کی آبیاری میں ستار اور طبلہ کے موجد امیر خسرو کے اہم کردار پر تفصیلی بحث موجود ہے۔ بایں ہمہ یہ مضمون اہمیت کا حامل ہے کہ محقق نے ہندوستان میں موسیقی کی روایت، چلن اور اس کے ارتقاء میں مسلمانوں کی بے لوث خدمت سے متعلق عالمانہ گفتگو کی ہے، اور پھر اس کے بعد امیر خسرو کی اختراعات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ محقق نے لکھا ہے:

''امیر خسرو نے ہندوستان کی موسیقی کو کلاسیکی موسیقی کے دبستان سے آراستہ کیا، جس کے لیے انھوں نے خیال جیسا صنف نغمہ اور ستار و طبلہ جیسے ساز اختراع کیے۔'' (المیز ان، ص 16)

'خواجہ شاہ محمد معروف شاہد کے چکی نامے' ایک پر مغز مضمون ہے۔ یہ مسلسل جد و جہد اور محنت شاقہ کا ثمرہ ہے۔ محقق کی عقابی نظر کا راز اس مضمون سے افشا ہوتا ہے۔ خواجہ محمد شاہ معروف شاہد کے نادر چکی نامے کو محقق نے نمونے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ خواجہ محمد شاہ کون ہیں اور ان کی بے لوث خدمات کیا ہیں اور ان کے چکی نامے کی اہمیت کیا ہے، ان سب سوالوں کا جواب کتاب کے مطالعے کے بعد مل جاتا ہے۔ چکی نامے کیا ہے؟ اس مسئلے کو بھی محقق نے آسان سے آسان تر انداز میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

'عبدالقادر سامی اورنگ آبادی کی غزل گوئی ایک بازیافت' ایک کارآمد اور تحقیقی مضمون ہے۔ عبدالقادر سامی اورنگ آبادی کے بارے میں عام تاثر ہے کہ ان کے ساتھ تاریخ نے انصاف نہیں کیا۔ حالانکہ اردو شاعری کے گیسو سنوارنے میں ان کی ابتدائی کوششوں سے انکار ناممکن ہے۔ محقق کے مطابق یہ مضمون دو اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ ایک یہ کہ عبدالقادر سامی اولین میں سے ہونے کے باوجود علمی التفات سے محروم کیوں رہے اور زمانہ نے انھیں نظر انداز کیوں کیا۔ محقق نے اس پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ دوسرا یہ کہ عظیم محقق ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور سے کچھ تسامحات سرزد ہو گئے تھے، جن کی نشاندہی محقق نے کی ہے اور انھیں مدلل انداز سے دور کرنے کی سعی کی ہے۔

ان کے علاوہ دیگر مضامین 'اردو کی پہلی خاتون نثر نگار: منور بیگم'، 'دکن و گجرات کے چند اہم صوفی شعراء (اردو)'، 'علامہ اقبال، ڈاکٹر عبدالحق اور سید عبداللطیف'، 'مولانا آزاد اور غالب کے کلام کی بازیافت'، 'غالب شناسی کے فروغ میں فرزندان جامعہ عثمانیہ'، 'مغنی تبسم اسلوبیات کا اہم نقاد' اور 'اسلم مرزا دکنی کا ایک محقق'۔ ڈاکٹر حبیب نثار کی عرق ریزی اور بزرگان ادب کے سرمایے کو حرز جاں سمجھ کر یکجا کرنے کی کاوش لائق تحسین ہے۔ لیکن محقق کی ایک بات سے مجھے ذاتی طور پر اختلاف ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلم مرزا ایک محقق ہیں مگر ان کو مولانا امتیاز علی عرشی، قاضی عبدالودود، مالک رام، رشید خان اور ڈاکٹر جمیل کا ہم پلہ قرار دینا اور ان کی صف میں کھڑا کرنا غیر موزوں معلوم ہوتا ہے۔

اس مجموعے کا دوسرا حصہ 'بحوالہ موسیقی' ہے۔ جس میں ادب اور موسیقی کے باہمی رشتے کو تحقیق کی روشنی میں محقق نے بیان کیا ہے۔ موسیقی اور ادب کے باہمی ارتباط پر شامل پانچوں مضامین خوب تر ہیں۔ ان میں سے ایک مضمون 'شاہان عادل اور ذوق وشوق موسیقی' خاصا سودمند اور ولولہ انگیز ہے۔ یہ بات اردو کے ہر طالب علم کو معلوم ہے کہ اردو کی پرورش و پرداخت میں شاہان عادل کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد یوسف عادل شاہ نے خود مختار حکومت قائم کر لی۔ عادل شاہی دور میں کئی بادشاہ تخت نشیں ہوئے لیکن ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دور حکومت میں ادب اور علم و ہنر نے خوب فروغ پایا۔ بادشاہ کو شعر و سخن، علم و ادب، تاریخ اور خاص کر موسیقی سے بے حد شغف تھا۔ موسیقی سے خاص لگاؤ کا ثبوت اس کی کتاب 'نورس' ہے۔

مجموعے کا تیسرا حصہ 'اردو صحافت اور طنز و مزاح' ہے۔ جس میں چار مضامین شامل ہیں اور چاروں مضامین محنت اور جانفشانی سے لکھے گئے ہیں۔ صحافت اور حیدرآباد، حیدرآباد اور طنز و مزاح، طنز و مزاح اور شگوفہ، سب ایک دوسرے کے لیے جزو لاینفک ہیں۔

مجموعے کا چوتھا حصہ 'فکشن' ہے، جس میں چار مضامین کو جگہ دی گئی ہے۔ پہلا مضمون داستان، دوسرا افسانہ، تیسرا پاپولر ناول اور چوتھا مشہور ناول 'ایوان غزل' کے کردار کے حوالے سے ہے۔ محقق نے چاروں مضامین میں قطعیت اور تحقیق کے دامن کو نہیں چھوڑا ہے۔

الغرض، کتاب کے مطالعے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر حبیب نثار کو تحقیقی زبان پر مکمل دسترس حاصل ہے، جس کی وجہ سے وہ طولانی عبارت آرائی سے بچتے ہیں۔ ان کا اسلوب بیان دلکش ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ موسیقی فہمی کے لیے 'المیز ان' کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ امید کہ باذوق اور سنجیدہ قارئین اسے اپنے مطالعے کا حصہ بنائیں گے۔

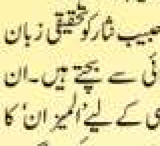

پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار

مصنف: پروفیسر شمیم نکہت

صفحات: 296، قیمت: 94 روپے

ناشر: اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

مبصر: ڈاکٹر ریحان حسن، شعبۂ اردو فارسی، گرونانک دیو یونیورسٹی، امرتسر

بیسویں صدی میں جن قلمکاروں نے مختلف ادبی حوالوں سے اپنی شناخت بنائی ہے ان میں پروفیسر شمیم نکہت کا نام انتہائی اہم ہے کیونکہ وہ محض معروف افسانہ نگار ہی نہیں بلکہ کامیاب معلّمہ، باشعور نثر نگار، اور بے مثل محققہ بھی ہیں۔ ظاہر ہے کہ پریم چند اور پریم چند شناسوں کی ایک طویل فہرست ہے لیکن ان میں چند ہی افراد ایسے ہیں جنھیں ید طولی کی حیثیت حاصل ہے ان چند میں پروفیسر شمیم نکہت ایسی ادیبہ ہیں جنھیں اردو میں پروفیسر قمر رئیس کے بعد پریم چند پر کام کرنے کے سلسلے میں اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں جس عمیق مطالعے، غور و فکر، تجزیہ و تحقیق کا ثبوت دیا ہے اس کی ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ہوئی۔

پروفیسر شمیم نکہت کی مندرجہ بالا کتاب 'پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار' کے حوالے سے ہی اردو زبان میں 'نسوانی کردار' کی ترکیب پہلے پہل استعمال ہوئی۔ سات ابواب پر مشتمل یہ کتاب محض پریم چند پر کام کرنے کے حوالے سے ہی اہم ماخذ کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ تانیثیت کے موضوع پر تحقیق کرنے والوں کے لیے بھی یہ کتاب نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں، کتاب کے شروع میں خواتین کے متعلق افلاطون کے نظریے نیز معاشرتی، اخلاقی، تہذیبی اور سماجی زندگی کے مختلف ادوار میں عورت کے مقام و مرتبے کا جس تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے وہ عصر حاضر کے خواتین کے لیے خاص چیز ہے۔ اس کتاب میں مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان عورتوں کی آزادی، سماجی مقام اور خواتین پر ہونے والے مظالم کے ذکر کے ساتھ ساتھ عورتوں سے متعلق مختلف مذاہب کے قوانین اور ان قوانین پر عمل آوری کے نتیجے میں طبقہ نسواں پر ہونے والے مظالم پر بھی سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز عورت کی پستی کے سیاسی اور سماجی اسباب اور عورتوں کی آزادی اور ان کے حقوق کے سلسلے میں کی جانے والی کوششوں کا بھی تفصیلاً ذکر ہے۔ ہندوستان میں عورتوں کی تعلیم کے متعلق رجحانات اور ان کو زیور تعلیم سے آراستہ کی جانے کی سعی جمیلہ کے تذکرے کے ساتھ ساتھ مختلف میدانوں میں خواتین کی مختلف فتوحات اور ان کے بیش بہا کارناموں کی بھی تحسین کی گئی۔

دوسرے باب میں کردار نگاری کا عام مفہوم اور معیار نیز ناول کے اجزائے ترکیبی کی اہمیت وضرورت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ پریم چند سے پہلے اردو ناول میں نسوانی کردار کی صورت حال کا تجزیہ اس طرح کیا گیا ہے کہ نذیر احمد سے مرزا محمد ہادی رسوا تک جو ناول تخلیق ہوئے ان ناولوں کے نسوانی کرداروں پر روشنی پڑ سکے خصوصاً امراؤ جان ادا پر جس انداز سے ناقدانہ نگاہ ڈالی گئی ہے وہ خاص ہے۔ نیز منشی پریم چند کے تخلیق کردہ ناولوں کے کرداروں پر ناقدانہ نگاہ ڈالتے ہوئے بحیثیت کردار نگار پریم چند کے مقام و مرتبے کا تعین کیا گیا ہے۔

تیسرے باب میں مشترکہ خاندان کی خوبیوں اور خامیوں کا ذکر کرتے ہوئے خود پریم چند کی زندگی میں جو جوار بھاٹا آیا اور اس سے انھوں نے جو نتائج اخذ کیے اس کا بے حد خوب صورت انداز میں ذکر ہے۔ اس کے علاوہ مشترکہ خاندان میں عورت کو کن مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور پریم چند کے ناولوں خصوصاً ہم خرما و ہم ثواب، بیوہ، جلوۂ ایثار، اور غبن میں مشترکہ خاندان اور بیوگی کے مسائل اور ان کے حل کی جانب توجہ مبذول کرانے کی سعی پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔

چوتھے باب میں طوائف کے مسائل اور نفسیاتی پہلوؤں کی روشنی میں معاشرے کی خرابیوں اور ان کے اسباب وعلل پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔ خصوصاً پریم چند کے ناول 'بازار حسن' کے حوالے سے اس باب میں جس انداز سے تنقیدی بحث کی گئی ہے وہ ناقدین کے لیے مشعل راہ ہے۔

پانچویں باب میں پریم چند کے مشہور زمانہ ناول چوگان ہستی، غبن اور میدان عمل کے توسط سے عورت کو سماجی کارکن کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے جبکہ چھٹا باب عورتوں کے عام مسائل اور کردار سے مخصوص ہے۔ پریم چند نے بارہ ناول تخلیق کیے جن میں سے دس ناولوں کے حوالے سے اس باب میں بحث کی گئی ہے۔ ان کے تخلیق کردہ کرداروں کے حوالے سے مدلل انداز سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ان کے ناولوں کے کردار کو کردار نگاری کے اعتبار سے کمزور قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ساتواں باب خلاصہ اور نتائج پر مبنی ہے۔ اس طرح اس کتاب میں پریم چند کے عورتوں کے تئیں مثبت نظریات اور عملی اقدام کا بھی ذکر ہے نیز سماجی و اصلاحی کاوشوں کے تذکرے کے ساتھ ساتھ پریم چند کے تحریر کردہ ناولوں کے توسط سے ان کو ترقی پسند ادیب کی حیثیت سے بھی متعارف کرایا گیا ہے۔ پریم چند کے ناولوں میں جو طبقاتی کشمکش، ظلم وجبر کے خلاف احتجاج اور حریت پسندی کے نظریات ملتے ہیں ان کو بے حد حسین پیرایے میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب سے عورت کی معاشی آزادی اور مساوات کے سلسلے میں پریم چند کی کاوشوں کا بھی بخوبی علم ہوتا ہے۔

مجموعی طور پر پریم چند شناسی نیز تانیثیت کے حوالے سے یہ کتاب اہم ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ کتاب کی ترتیب وپیشکش نیز ڈیزائن بھی جاذب نظر ہے۔ کتاب کی افادیت وضخامت کے پیش نظر قیمت بہت ارزاں ہے۔ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ نے اس کتاب کو شائع کرکے پریم چند کے پرستاروں کو ایک انمول خزانے سے اکتساب کا موقع فراہم کیا ہے۔

شکست کا تنقیدی جائزہ

مصنفہ: شاذیہ رئیس

صفحات: 136، قیمت: 200/روپے

ناشر: براؤن پبلی کیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ، نئی دہلی

مبصر: عائشہ شاہین

شاذیہ رئیس کی کتاب 'شکست کا تنقیدی جائزہ' کرشن چندر کے ناول پر مبنی تنقیدی کتاب ہے۔ اس کتاب میں کرشن چندر کی گھریلو زندگی، ترقی پسند تحریک سے ان کی وابستگی اور ان کی ادبی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے جس کے پہلے باب میں کرشن چندر کی شخصیت، ان کا ماحول، تعلیم اور ملازمت اور ترقی پسند ادیب کی حیثیت سے ان کے مقام کا تعین کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں ابتدا سے اردو ناول کا جائزہ لیتے ہوئے کرشن چندر کے تمام ناولوں پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ تیسرے باب میں انھوں نے کرشن چندر کے ناول 'شکست' کا مطالعہ موضوع، پلاٹ، کردار نگاری، زبان واسلوب کے حوالے سے کرتے ہوئے ان کی خوبیوں اور خامیوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ چوتھے باب میں موضوع کے اعتبار سے تمام ترقی پسند ناولوں کا جائزہ لیتے ہوئے کرشن چندر کے ناول کے موضوع اور مواد کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

کرشن چندر کا یہ ناول 1943 میں شائع ہوا۔ اس وقت ترقی پسند تحریک کا زمانہ تھا۔ کرشن چندر کا یہ ناول دوسرے ناولوں کی طرح اس دور کی حقیقی زندگی پر مبنی ہے اور اس دور کے سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل کو ہی اس ناول کا موضوع بنایا گیا ہے مگر اس میں شیام اور ونتی، چندر اور موہن کی داستان محبت اس کے رومانی عنصر کو اجاگر کرتی ہے۔ اس ناول کے مطالعے میں رومانی اور حقیقی جو ایک دوسرے کی ضد ہیں دونوں نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کے موضوع کا جائزہ لیا گیا ہے جو کرشن چندر کی رومانی حقیقت نگاری کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔

کرشن چندر کے ناول پر مبنی اس کتاب میں ناول کے پلاٹ، کردار نگاری، زبان اور اسلوب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس ناول میں مرکزی کردار کے ساتھ ضمنی کردار بھی ہیں جن کے تمام جذبات وخیالات، اعمال وافعال کا تفصیل سے جائزہ لیتے ہوئے مرکزی کردار شیام اور ونتی، چندر اور موہن کی داستان محبت اور اس محبت کے سبب پیدا ہونے والی ذہنی کشمکش اور اس دور کی تمام مذہبی وسماجی مشکلات ومسائل کا بھی مطالعہ پیش کیا گیا جو ان کی محبت میں رکاوٹ کا سبب بنتی ہیں۔ فرسودہ روایت کے سبب محبت کا استحصال کیا جاتا ہے۔

اس ناول کے موضوع پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے اس کا مطالعہ ایک ترقی پسند ناول کی حیثیت سے بھی کیا ہے۔ کرشن چندر نے اس دور کے طبقہ وارانہ معاشی مسائل و کشمکش کو اس ناول میں بڑی خوبی سے پیش کیا ہے جو اس ناول کو بہترین ترقی پسند ناولوں

کی فہرست میں شامل کرتا ہے۔

جہاں تک ناول 'شکست' میں موضوع اور مواد کا تعلق ہے، تو اس کتاب میں ناول کے موضوع اور اس کے سیاسی، سماجی اور رومانی عنصر کے ساتھ کرشن چندر کے حالات زندگی، ناول نگاری کی روایت، کردار نگاری پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے، مگر ناول کے دوسرے پہلو مثلاً بیانیہ کی نوعیت اور مصنف اور راوی کی تفریق اور ناول میں مصنف کے غیر ضروری تبصرے جو ناول میں مصنف کی موجودگی کا واضح ثبوت فراہم کرتے ہیں، کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا۔ کرشن چندر کا یہ ناول اگرچہ زبان و بیان کے اعتبار سے عمدہ ناول ہے اور اس کتاب میں ناول کی زبان و اسلوب، تشبیہات اور استعارات کا جائزہ لیا گیا ہے، مگر کرشن چندر کا ناصحانہ انداز اس ناول کو فنی اعتبار سے کمزور بنا دیتا ہے۔ وہ کرداروں کے ساتھ غیر جانب داری کا ثبوت فراہم نہیں کر پاتے۔

زیر نظر کتاب میں کرشن چندر کے اس ناول کا عمدہ تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے جو ان کی تنقیدی نگاہ کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔

شعور نغمہ

مصنف: ارشد نیاز

صفحات: 128، قیمت: 70 روپے

مبصر: شاہد اقبال، F-43/11، دوسری منزل

جوگا بائی ایکسٹینشن، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025

زیر تبصرہ کتاب شعور نغمہ (مضامین کا مجموعہ) ہے۔ اس کتاب میں چودہ (14) مضامین شامل ہیں جو موضوع کے اعتبار سے ایک دوسرے سے منفرد ہیں۔ ارشد نیاز اپنے آپ کو بنیادی طور پر افسانہ نگار تسلیم کرتے ہیں لیکن ان کے مضامین کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے اندر تنقیدی صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ارشد نیاز اردو زبان و ادب کے علاوہ مغربی زبان و ادب پر بھی عبور رکھتے ہیں۔

ان کے مضامین کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ارشد نیاز پر کلیم الدین احمد کا اثر زیادہ ہے کیونکہ ارشد نیاز نے اپنی بات کو دوٹوک لفظوں میں کہنے کی کوشش کی ہے۔ جس طرح کلیم الدین احمد نے صاف صاف لفظوں میں بات کہی ہے۔ اسی طرح ارشد نیاز نے بھی کوشش کی ہے۔ ایک مضمون جس کا عنوان 'افسانہ اور شاعری' ہے اس مضمون میں انھوں نے صاف لفظوں میں افسانہ نگار کو جھوٹا اور فریب کار کہا ہے۔ بقول ارشد نیاز:

''افسانہ نگار اکثر جھوٹا اور فریبی ہوتا ہے۔''

اسی طرح شاعر کو افسانہ نگار سے معتبر کہا ہے اور شاعر کو سچ سے تعبیر کیا ہے۔

اسی طرح ایک مضمون 'اردو کے ادبی سائنٹسٹ یا مغرب کے حاشیہ بردار' میں اردو تنقید کے ابتدائی نقوش کے ساتھ ساتھ تنقید کے معنی و مفہوم پر بھی بات کی ہے اور ساختیات اور پس ساختیات کو فرائڈ کی تھیوری نفسیاتی تنقید کی اگلی کڑی بتایا ہے۔ حالانکہ ان دونوں مضامین میں اختلاف کی گنجائش باقی ہے۔ اسی طرح ایک مضمون 'فن، فنکار اور قاری' ہے جس میں ان تینوں کے مفہوم کو واضح کرتے ہوئے ان کے آپسی تعلقات کو پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر فن کے ساتھ فنکاری کا اور قاری کا کس طرح تعلق ہوتا ہے۔ ان تینوں میں قاری کو زیادہ اہم بتایا گیا ہے۔

ایک مضمون جس کا عنوان 'مابعد جدیدیت کے انسان اور ادب' ہے اس میں انھوں نے خیالی ادب تخلیق کرنے پر زور دیا ہے اور خارجی ادب پر خیالی ادب کو ترجیح دی ہے۔ اس کتاب میں شخصی مضامین بھی شامل ہیں 'شمس الرحمٰن فاروقی ایک مختصر جائزہ' میں فاروقی صاحب کی مختصر Monography کے ساتھ ساتھ ان کے کارنامے کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ مظفر حنفی کی نظموں کا مجموعہ 'یا اخی' کا تجزیہ بھی کیا ہے جس کا عنوان 'یا اخی۔ ایک مطالعہ' ہے۔ اس طرح بنگال کا ایک معتبر شاعر خالق عبداللہ کی ایک مشہور و مقبول نظم 'ایک نظم' کا تجزیہ کیا ہے، جس کا عنوان 'خالق عبداللہ اور ایک نظم' ہے۔ اسی مضمون میں خالق عبداللہ کی شخصیت پر بھی بات کی گئی ہے۔

شعور نغمہ کے عنوان سے گیارہ مضامین بھی اسی کتاب میں شامل ہیں جس میں بہت ہی فلسفیانہ اور عالمانہ گفتگو ہوئی ہے۔

ممبئی عظمیٰ کی مختصر تاریخ

تحقیق و تصنیف: توفیق احسن برکاتی

صفحات: 464، قیمت: نامعلوم، سنہ اشاعت: دسمبر 2015

ناشر: مکتبہ طیبہ، 126 کامبیکر اسٹریٹ، ممبئی

مبصر: ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری

گورنمنٹ ڈگری کالج، ماگام کشمیر 193401

زیر تبصرہ کتاب پر کوئی رائے قائم کرنے یا اس کتاب پر کوئی تبصرہ کرنے سے قبل میں یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں جیسا کہ کتاب کے مصنف جناب توفیق احسن برکاتی صاحب نے بھی اس کتاب کے دیباچے میں تحریر کیا ہے کہ تاریخ نگاری اور تذکرہ نویسی کوئی آسان کام بالکل نہیں ہے اور ان مشکلوں کا اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے، جو اس کانٹوں بھرے راستے پر خود گزر چکا ہو۔ زیر نظر تاریخ بلاشبہ مصنف کی انتھک جدو جہد، سخت تحقیق اور عرق ریزی کا ثمرہ ہے۔

یہ ضخیم کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب کے مواد کو ذیلی عنوانات کے تحت ڈسکس کیا گیا ہے۔ ابواب کی ترتیب، بیانات اور تفصیلات حوالہ جات اور کتابیات سب کچھ جامعات کے تحقیقی اصولوں پر کیا گیا۔ کتاب کے باب یکم میں مہاراشٹر کی تاریخ محل وقوع اور جغرافیائی خد و خال بیان کیے گئے۔ وہ بلا تردد مصنف کی دقیق تحقیق کا ایک برملا ثبوت ہے۔ کتاب میں ہندوستان میں اسلام کی آمد سے لے کر ممبئی کے مذہبی حالات، ممبئی کے سرکردہ علما و مشائخ اور ممبئی کے مشہور بزرگان دین کی سوانح بڑی تفصیل کے ساتھ رقم کی گئی۔ بات حاجی علی شاہ بخاری سہروردی کی ہو یا مولانا منصور علی رضوی کی، شاندار تحریری انداز اور تحقیقی مواد اس تصنیف کی جان ہے۔

امام احمد رضا بلاشبہ ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ پورے برصغیر میں اہل سنت والجماعت کے عقیدوں کے ایک بہت بڑے شارح ہیں تو غلط نہیں ہوگا۔ امام احمد رضا کے بارے میں کافی تحقیق کی گئی اور ان کے بارے میں جو کچھ بھی اس کتاب میں مصنف نے تحریر کیا ہے وہ قابل تحسین ہے۔ کتاب کے صفحہ 75-74 پر درج ہے:

''اعلیٰ حضرت کی ولادت 1272ھ میں ہوئی۔ پندرہ برس کے ہوتے ہوتے آپ کی علمی شہرت اطراف ہند میں پھیل چکی تھی۔ ممبئی سے بھی ان کے پاس استفتیٰ اور سوالات آنے لگے تھے اور علما و عوام ممبئی سے رابطے استوار ہو چکے تھے۔''

کتاب میں نہ صرف ممبئی کے علما بزرگان دین اور مشائخ وغیرہ کا تفصیلاً تذکرہ کیا گیا ہے، بلکہ اس میں عروس البلاد کی سنی تنظیمیں، مدارس اہل سنت، سنی صحافت، یہاں تک کہ ممبئی کے سنی نشریاتی اداروں کی بھی بات پرکشش انداز میں کی گئی جو کہ ہر طرح کے قارئین کے لیے کافی کارآمد اور مفید ثابت ہوگی۔ یہ کتاب اگرچہ اسلامی عقائد کے بنیادی اصولوں، خاص کر ممبئی کے بارے میں کافی معلومات فراہم کرتی ہے، دوسری طرف اس کتاب میں کئی ایسی باتوں کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے، جن سے تعصب اور بدگمانی کی دھول آنکھوں سے چھٹ جاتی ہے۔

اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ کتاب کا انداز تحریر بھی بڑا شاندار اور متاثر کن ہے اور مجھے امید ہے کہ جغرافیہ، تاریخ، اسلامیات، تعلیم، ساجیات وغیرہ کے طالبانِ علم اس کتاب کے مطالعے سے نہ صرف لطف اندوز ہوں گے، بلکہ علمی معاملات میں مستفید بھی ہوسکتے ہیں۔

فکشن

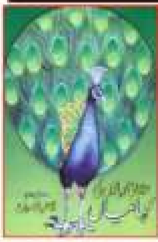

علاقائی زبانوں کی کہانیاں

مترجم: ڈاکٹر بانو سرتاج

صفحات: 360، قیمت: 139 روپے، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر رضاء الرحمن عاکف میاں سرائے سنبھل، یوپی 244302

زیر نظر کتاب 'علاقائی زبانوں کی کہانیاں' کے نام سے ہے۔ یہ مجموعہ ہندوستان کی علاقائی زبانوں کی کہانیوں کے اردو ترجمے پر مشتمل ہے۔

اس کتاب میں 22 زبانوں کی 42 کہانیاں شامل کی گئی ہیں۔ جن میں آسامی، اڑیہ، اردو، کنڑ، کشمیری، کوکنی، گجراتی، ڈوگری، تمل، تیلگو، نیپالی، پنجابی، بوڈو، بنگالی، منی پوری، ملیالم، مراٹھی، میتھلی، سندھی، سنسکرت، ہندی زبانیں شامل ہیں۔ مترجم نے کہانی کی مناسبت سے زبان کی وضاحت فہرست میں ہی کردی ہے۔ جس سے قاری کو بہ آسانی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کون سی کہانی کس زبان سے متعلق ہے۔ عموماً ہر زبان کی دو دو کہانیاں لی گئی ہیں۔ کتاب کے شروع میں 'میری بات' کے عنوان سے خود ڈاکٹر بانو سرتاج صاحبہ کی تحریر ہے جس میں کتاب کی غرض وغایت اور اس کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس تحریر سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کہانیوں میں سے ہندی اور مراٹھی کہانیوں کے ترجمے تو براہ راست انھیں زبانوں سے لیے گئے ہیں جبکہ بقیہ دیگر کہانیوں کو ان کے ہندی ترجمے کے ذریعے اردو قالب میں ڈھالا گیا ہے۔ اردو کی کہانیاں بعینہ شامل کردی گئی ہیں۔ جن میں ایک کہانی اردو کے مشہور قلم کار 'غیاث احمد گدی' اور دوسری خود ڈاکٹر بانو سرتاج صاحبہ کی ہے۔ اس کتاب کی خوبی یہی ہے کہ اس میں اکثر علاقائی زبانوں کو جگہ دے دی گئی ہے۔ صرف 'سنتھالی' زبان کی کہانی (دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے) شامل کتاب نہیں ہوسکی ہے۔ اس کی فراہمی کے لیے موصوفہ نے حتی المقدور کوشش بھی کی مگر وہ کامیاب نہ ہوسکیں۔

''قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی'' کے مالی تعاون سے اشاعت پذیر ہونے والی اس کتاب کا انتساب اردو کے معروف ادیب منشی پریم چند کے فرزند 'شری پت رائے' کے نام پر بڑی عقیدت واحترام کے ساتھ کیا گیا ہے۔ جیسا کہ کہا جاچکا ہے کہ یہ کہانیاں دوسری زبانوں کے ترجموں پر مشتمل ہیں مگر ترجمہ نگار کی صلاحیت وذہانت کا یہ خاص پہلو ہے کہ انھوں نے ترجمے کو اصل کا رنگ دے دیا ہے اور کہانی پر اردو کا رنگ پوری طرح چڑھا دیا ہے۔ اسی وجہ سے پڑھنے والے کو کسی طرح کی لسانی اجنبیت یا طرز تحریر کی غیریت محسوس نہیں ہوتی بلکہ وہ فطری دلچسپی اور طبعی لگاؤ کے ساتھ ہی کہانی کا مطالعہ کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ ڈاکٹر بانو سرتاج کی تحریر کی خوبی ہے کہ انھوں نے ترجمے کو بھی اصل کا روپ دے دیا ہے۔ ان کے اس وصف کو اچھی طرح سے سمجھنے کے لیے کشمیری زبان سے لی گئی کہانی 'یوٹرن' کا ایک اقتباس نذر قارئین کیا جارہا ہے۔ جس سے آپ کی قلمی صلاحیت اور اسلوب ترجمہ نگاری کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

''جب وہ کار سے نکل کر جواہر نگر کی طرف اپنے گھر جارہے تھے تب سارا نے پوچھا۔''

''کیسا رہا آپ کا لیکچر؟''

''ٹھیک۔''

''مطلب؟''

''بہت اچھا... یہ دیکھو اخبار میں تصویر اور خبر۔''

انھوں نے ہینڈ بیگ کی زپ کھول کر ''ہیمبرگ ایکسپریس'' کا تازہ شمارہ نکالا اور سارا کو تھما دیا۔

''اووونڈرفل! ایک ہفتے تک گھر میں آرام کریں گے آپ۔''

''ہاں... مگر کل جانا ہوگا۔''

''کہاں؟''

''کل ایک ہائی لیول میٹنگ ہونے والی ہے۔ جس میں چند اعلیٰ افسران اور بزنس مین شریک ہوں گے۔''

''اور آپ کو ایکسپرٹ کے طور پر مدعو کیا گیا ہے؟''

''ہاں۔''

''آپ نے پہلے بتایا نہیں؟''

''بتایا ہوگا میں نے اس میٹنگ کی تاریخ تو تین مہینے پہلے طے ہوئی تھی۔''

''ایک دن بھی چین نہیں آپ کو۔ آرام بھی کرلیا کریں۔''

''کل کی میٹنگ کے بعد آرام ہی آرام ہے۔''

اس اقتباس میں پیش کیے گئے ڈائیلاگس کی زبان اور طرز تکلم میں کہیں بھی ترجمے کی نشاندہی اور زبان کی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا بلکہ قاری کو یہی محسوس ہوتا ہے کہ وہ اردو کی ہی کوئی کہانی پڑھ رہا ہے۔ دراصل 'ڈاکٹر بانو سرتاج' کے ترجمے کی یہی خوبی ہے جو اس کتاب میں شامل ہر کہانی کے اندر نظر آتی ہے۔

کتاب میں کہانیوں کے بعد 'ملحقات Appendices' کے عنوان سے ایک گوشہ دیا گیا ہے، جس میں کہانیوں کے قلم کار حضرات کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اس گوشے میں مذکورہ شخصیت کا مکمل پتہ اور رابطہ نمبر بھی دیا گیا ہے۔ اس سے کتاب کی افادیت میں غایت درجہ اضافہ ہو جاتا ہے اور قاری ان حضرات سے بآسانی رابطہ کرسکتا ہے۔ آگے ان حضرات کی تصاویر بھی دی گئی ہیں۔ بعدۂ علاقائی زبانوں کے ترجمہ نگار حضرات کا تعارف دیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں 'ڈاکٹر بانو سرتاج' کے قلمی اثاثے جو زیادہ تر ترجمے پر مشتمل ہیں، دیے گئے ہیں۔

زیر نظر کتاب لسانی اور ادبی خوبیوں کے ساتھ ظاہری وصوری محاسن سے بھی مالا مال ہے۔ معیاری کاغذ نے بھی کتاب کی افادیت میں اضافہ کیا ہے۔

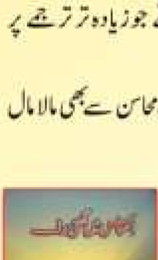

احساس میں گھلتی برف

مصنف: اشفاق برادر

صفحات: 160، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: اشفاق برادر

مبصر: اسعد اللہ، ریسرچ اسکالر، شعبۂ تعلیم جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

زیر نظر افسانوں کا مجموعہ اشفاق برادر کا ہے۔ اس مجموعے میں ان کے انتالیس افسانے شامل ہیں۔ اور ہر افسانہ کہیں نہ کہیں قاری کو اس بات کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ زندگی اسی کا نام ہے اور ہم اس دنیا میں مجبور محض ہیں لیکن اگر زندگی کو خوشگوار بنانا چاہتے

ہیں تو ہمیں ان چیزوں کی طرف بھی توجہ کرنا چاہیے جسے ہم غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ پوری کتاب آپ پڑھتے چلے جائیے کہیں سے بھی آپ کو اکتاہٹ یا جھول محسوس نہیں ہوگا اور افسانہ کی جو اہم خصوصیات ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک ہی مجلس میں اسے پڑھ لیا جائے۔

اس افسانوی مجموعے میں تین باتیں بہت ہی اہم ہیں ایک تو یہ کہ مصنف نے اپنے تمام افسانوں کا محور اس زمین سے جوڑ رکھا ہے۔ دوم یہ کہ اس کے تمام کردار ہمارے آپ کی طرح چلتے پھرتے نظر آتے ہیں مافوق الفطری عناصر Superstitious سے پرہیز کیا گیا ہے۔ سوم یہ کہ افسانے کو ہر حال میں افسانہ ہی رہنے دیا گیا ہے۔ داستان سرائی یا ضمنی قصوں سے خانہ پری کے بجائے اصل بات کی طرف دھیان دیا گیا ہے۔

مثلاً 'دل کی شمع جلاؤ' کا عنوان قائم کرکے قاری کے ذہن کو اس بات کی طرف متوجہ کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح سے ہم مادیت کے پیچھے خود کو دھکیل رہے ہیں جس میں نہ انسانیت ہے نہ انسانیت نوازی۔ دولت کی ہوس نے ہمیں کس طرح سے ناکارہ کر دیا ہے کہ ہم اچھے اور برے میں کوئی فرق نہیں کر سکتے۔ مذکورہ افسانے میں شہری گندگی سے لے کر میونسپلٹی کے عہدیداروں اور ان کے کارناموں کو جس انداز سے پیش کیا گیا ہے اس کی مثال ہم آئے دن دیکھتے اور سنتے رہتے ہیں اسی طرح سے اس میں وکیلوں کی چالوں کے بارے ہمیں بتایا گیا ہے کہ ایک وکیل کے پاس جب کوئی اور مقدمہ نہیں ہوتا تو وہ پیسے کمانے کا کیا طریقہ نکالتا ہے۔ افسانے کا اختتام اس خوبصورت سوالیہ جملے سے کیا گیا ہے کہ "بیکاری کے بوجھ نے کیا ہمارے دل و دماغ پر کالی کمائی کا بھوت طاری کر رکھا ہے.....؟ کالی راتوں کے اس پار کیا سنہری کرنیں موجود نہیں ہیں....؟ پھر ایک امید ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "گھبراہٹ کے بادل بھی چھٹ سکتے ہیں پھر دیر کس بات کی.........؟

اشفاق برادر نے افسانہ 'برہنہ سچ' میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح سے دنیا ایک بات کہتی ہے اور خود اس کا عمل الٹا رہتا ہے اور آج یہ سب کچھ جو ہم مساوات کے نام پر کرتے ہیں یہ دراصل کچھ لوگوں کی سوچی سمجھی سازش ہے جس کے ہم لوگ شکار ہیں۔

اسی طرح انھوں نے 'احساس میں گھلتی ہوئی برف' میں انھوں نے اس بے کس آدمی کی ترجمانی کی ہے جو بے چارہ افلاس کا مارا ہوا ہے۔ ایسے میں اس آدمی کے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ وہ اپنا آبائی مکان بیچ دے اور اپنی زندگی کا سامان مہیا کرے لکھتے ہیں۔

'احساس میں گھلتی ہوئی برف' ان کے کامیاب افسانوں میں سے ایک ہے۔

اشفاق برادر کے اس مجموعے میں جہاں ماضی کے تابندہ نقوش کی کچھ مثالیں ہمیں مل جاتی ہیں وہیں انھوں نے حالات حاضرہ کے اہم موضوعات کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔

اشفاق برادر کا اس سے پہلے ایک اور مجموعہ "اپنی مٹی کی مہک" کے نام سے شائع ہوکر قارئین سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔

مذکورہ افسانوں کے مجموعے 'احساس میں گھلتی برف' کے مطالعے سے ہمیں اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اشفاق برادر نے اپنی افسانہ نگاری کے ذریعے معاشرہ کے ان تمام اسرار و رموز سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے جو پردے میں تھے اور ان کی کوشش رہی ہے کہ ایسے نکات کو قارئین کے سامنے لائیں جس سے ایک بہتر معاشرہ اور سماج کی تشکیل کی جا سکے۔ ان کے افسانے اسی کی عکاسی کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انھوں نے علامتی یا استعاراتی اسلوب کے بجائے آسان اور عام فہم لب ولہجہ اختیار کیا ہے جس سے کہ قاری کو الجھن محسوس نہ ہو اور وہ افسانے کی تہہ تک بآسانی پہونچ سکے۔ پروف ریڈنگ میں کہیں کہیں خامیاں ہیں امید ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی تصحیح کر دی جائے گی۔

شعری مجموعے

احساس و ادراک

ڈاکٹر مقبول احمد مقبول

صفحات: 158، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

مبصر: ابرار احمد اجراوی، مقام و پوسٹ اجرا، وایا ریام فیکٹری، مدھوبنی، بہار

ڈاکٹر مقبول احمد مقبول کرناٹک کے معاصر شعری منظر نامے کا ابھرتا ہوا نام ہے۔ انھوں نے 1981 میں ہی مشق سخن کا آغاز کر دیا تھا۔ اب تک ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، جن میں مضطر مجاز: شخصیت اور فن (2006)، آدمی لہولہو (2011) اور نقد و نظر (2012) شائع ہوکر اہل نظر سے داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ وہ درس و تدریس کے مقدس پیشے سے وابستہ ہیں۔ اور شعر و ادب کے حوالے سے ایک مخصوص افادی نقطۂ نظر کے حامی ہیں۔ انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں، قطعات اور نظمیں بھی، لیکن ان کا میدان خاص رباعی گوئی رہا ہے۔ زیر نظر رباعیوں کے مجموعے احساس و ادراک کو انھوں نے حروف تہجی کی ترتیب سے دیوان کی صورت میں شائع کرایا ہے۔

مقبول احمد کی رباعیوں کی یہ خاصیت ہے کہ انھوں نے اپنی رباعیوں میں سماجی، مذہبی اور سیاسی ہر قسم کے مضامین کو جگہ دی ہے، لیکن رباعی کا جو خاص مقصد پند و موعظت اور اخلاق و کردار سازی رائج رہا ہے، اس کے ارد گرد ہی مرکوز رہنے کی کوشش کی ہے۔ زبان بھی سادہ، عام فہم اور رواں استعمال کی ہے۔ موضوعات آسمان سے نہیں، بلکہ آس پاس سے اٹھائے گئے ہیں، جو کسی بھی تخلیق کو کامیابی کی ضمانت بخشتے ہیں۔ ان کی رباعیوں میں عصر حاضر کی شکست و ریخت، سیاسی بدعنوانی، سماجی برائیاں، اخلاقی زوال، تعلیمی انحطاط، وطن دوستی، حب الوطنی، انسانیت نوازی، قومی یک جہتی کا فروغ اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی تشہیر اور خیر و شر کی تمیز جیسے موضوعات کو مرکز سخن بنایا گیا ہے۔ رباعیوں کا جو مروجہ میدان اصلاح نفس اور اخلاق و آداب کی تعلیم رہا ہے، یہی کچھ ان کی رباعیوں کا بھی محور ہے۔ لیکن انھیں برتنے کا انداز ذرا منفرد اور اچھوتا ہے۔ انھوں نے اپنی رباعیوں میں اردو کی ضرب الامثال اور محاوروں کا بھی برمحل استعمال کیا ہے، جس سے رباعی کا اثر و تاثر دوچند ہو گیا ہے۔ منہ کی کھانا، دامن جھٹکنا، کنویں جھانکنا اور گریبان چاک کرنا وغیرہ ایسے محاورے ہیں، جن کی اثر انگیزی مضامین کو فرش سے عرش پر پہنچا دیتی ہے۔ وزن و قافیے کی پابندی کی وجہ سے کچھ متروک الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں، مگر انھوں نے شعری ضرورت کا عذر نکال کر حاشیے میں اس کی وضاحت کر دی ہے۔ دیکھیے ایک رباعی جس میں انھوں نے حالات حاضرہ پر کتنا تیکھا اور عبرت انگیز طنز کیا ہے:

ہر زخم کو سینے سے لگایا میں نے پابند وفا خود کو بنایا میں نے
سوچوں، تو سمجھ میں نہیں آتا کچھ بھی یہ سب کیا لیکن، کیا پایا میں نے

اس دور میں فن اور فن کار کی ناقدری عام ہے۔ جاہل مال دار سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے، اس کی تعریف و توصیف کے نغمے گائے جاتے ہیں، جب کہ بے چارا جینوئین تخلیق کار اور ماہر فن کار زندگی بھر اپنے خون جگر سے گلشن فن کو سینچتا رہتا ہے، مگر معاشرے میں اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ حکومت وقت بھی ان سے آنکھیں پھیر لیتی ہے۔ شاعر نے اس الم ناک صورت حال کی کتنی حسب حال عکاسی کی ہے:

اس گرمی بازار پہ رونا آیا ہر طبع خریدار پہ رونا آیا
گرنے لگی ہے فن کی قیمت ہر دن ناقدری فن کار پہ رونا آیا

کتاب کے آغاز میں روایتی قسم کی مدحیہ تحریریں بھی شامل ہیں۔

یوں بھی اردو شعر گوئی کی طویل تاریخ میں رباعیوں کے دواوین انگلیوں پر شمار کیے جاسکتے ہیں، ایسے میں مقبول احمد مقبول نے بلحاظ حروف تہجی تقریباً 250 رباعیوں پر مشتمل دیوان ترتیب دے کر رباعی گوئی کی تاریخ میں ایک سنگ میل کا اضافہ کردیا ہے۔ جب بھی اردو کے صاحب دیوان رباعی گویوں کا ذکر آئے گا، اس میں مقبول احمد کا نام بھی شمار ہوگا۔ کتاب کا ٹائٹل اور سرورق دیدہ زیب ہے۔ کاغذ بھی معیاری استعمال کیا گیا ہے۔ پروف ریڈنگ میں کافی دقت نظری سے کام لیا گیا ہے۔ جو قابل ستائش امر ہے۔ امید ہے کہ مقبول احمد کے غزلیہ مجموعے کی طرح اردو کے ادبی حلقوں میں اس دیوان کی بھی پذیرائی ہوگی۔

کلیات رہبر

شاعر: مولانا عبدالجبار رہبر اعظمی، مرتب: ڈاکٹر ارشد اعظمی

صفحات: 248، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: اپریل 2015

ناشر: رہبر فاؤنڈیشن خالص پور، اعظم گڑھ

مبصر: جاوید احمد ڈار، کہروٹ، کولگام، جموں وکشمیر 192231

مولانا عبدالجبار خان رہبر اعظمی ایک حساس طبیعت انسان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے ادیب بھی تھے، ان کی مفکرانہ ومصلحانہ عظمت اور اس کی وسعتیں، ان کا فلسفیانہ شعور، ان کی انسانیت اور انسان دوستی، ان کا پیغام زندگی، ان کا احترام آدمیت کے تعلق سے نظریہ اور اس کے لیے ایک روشن لائحہ عمل، اتفاق واتحاد کی تعلیم وفرقہ بندی کے اختلاف وانتشار سے نفرت رہبر صاحب کی زندگی، شخصیت اور تخلیقات کے ایسے تابناک پہلو ہیں جس سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔

زیر تبصرہ کتاب 'کلیات رہبر' 248 صفحات پر مشتمل ہے جسے ان کے بیٹے ڈاکٹر ارشد اعظمی نے مرتب کرکے رہبر فاؤنڈیشن خالص پور، اعظم گڑھ سے شائع کیا ہے۔ اس سے پہلے مولانا عبدالجبار خان رہبر اعظمی کا نعتیہ مجموعہ کلام 1955 میں اعظم گڑھ سے ہی شائع ہوچکا ہے۔ مولانا صاحب کو نہ صرف اردو بلکہ فارسی وعربی زبان پر بھی دسترس حاصل تھی۔ زیر مطالعہ کتاب میں بھی عربی وفارسی زبان کے بے شمار اشعار ملتے ہیں لیکن دیکھا جائے تو 'کلیات رہبر' اصلاً ان کے اردو کلام کا مجموعہ ہے۔ یوں تو انھوں نے اردو کی مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی لیکن نعت گوئی اور اردو غزل ان کا پسندیدہ میدان ہی رہا ہے۔ جس کا اعتراف بھی مولانا صاحب نے جگہ جگہ کیا ہے۔ غزل کے لیے انھوں نے چھوٹی بڑی ہر طرح کی بحروں کا استعمال کرکے ہر طرح کے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ علاوہ ازیں اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا کہ مولانا صاحب علامہ اقبال سے کافی زیادہ متاثر تھے، شاید یہی وجہ ہے وہ اقبال کی طرح اپنے اشعار میں ڈوب کر زندگی کی حقیقت کا پتہ لگانے کی کوشش کرتے رہے اور دوسروں کو بھی تلقین کرتے رہے۔

زیر تبصرہ کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ نعتیہ کلام پر مشتمل ہے جن میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف اور آپ کے اوصاف بیان ہوئے ہیں۔ نیز آپ سے التجا ودرخواست کی ہے، مثلاً:

خدا کا فضل ہے رحمت کے آستاں ہیں رسول — جو سب پہ سایہ کناں ہے وہ آسماں ہیں رسول
خدا بصیرتیں انساں کو بخش دے رہبر — زماں زماں ہیں رسول اور مکاں مکاں ہیں رسول

'کلیات رہبر' کا دوسرا حصہ غزل کے لیے مختص رکھا گیا ہے۔ تریسٹھ غزلوں کا یہ مجموعہ ایک اچھی شاعری اپنے بطن میں لیے ہوئے ہے جو عہد حاضر میں رونما ہونے والے واقعات، زندگی کے تضادات اور فرقہ وارانہ فسادات کے موضوعات سمیت غزل کے داخلی نظام اور دروبست پر محیط ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ شاعر اپنے شعری تجربات کو غزل کے پیراہن میں بخوبی ادا کرنے پر قادر ہے۔ لیکن مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ ساری غزلوں میں کہیں نہ کہیں تصوف کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔ آیئے اب اسی تناظر میں موصوف کے کچھ اشعار دیکھیں۔ پہلی غزل کے چند اشعار دیکھیے:

نہ ماہتاب میں جلوہ رہا، نہ نور کہیں — ضرور چھپ گئے مجھ سے میرے حضور کہیں
کبھی جو بولے ہوا بام پر ظہور کہیں — تو برق بن کے گری ہے نگہ ضرور کہیں

اور پھر اس کے بعد دوسری غزل کا یہ موضوع ہے کہ:

درد دل کا اس جہاں میں کون اب ہمراز ہے — رند یا ساقی یہاں پہ سب کا ٹوٹا ساز ہے
ہو ہی جائے گا کبھی انجام رہبر کام کا — آج کل یا بعد میں تیری جگہ شہباز ہے

تیسری غزل کا یہ انداز جہاں شاعر اپنا درد وکرب بیان کرتا ہے:

رنج سہتے رہے، دکھ اٹھاتے رہے — وہ ہمیں دیکھ کر مسکراتے رہے
عشق بڑھتا رہا حسن ڈرتا رہا — ہم لپکتے وہ دامن چھڑاتے رہے

زیر تبصرہ کتاب کا تیسرا حصہ نظموں پر مشتمل ہے، جس میں تقریباً گیارہ نظمیں مختلف موضوعات پر ہیں۔ نظموں کا یہ حصہ قدرے تفصیلی تذکرے کا متقاضی ہے۔ 'دیوالی پر ایک خط، آرزو، ایک دوست کی یاد میں پہلا خط، دوسرا خط، وغیرہ جیسی پر اثر نظمیں شامل ہیں جو شاعر کے ادبی قد کو بلند کرنے میں معاونت کرتی ہیں۔ مختلف نظموں کے جستہ جستہ اشعار پیش مطالعہ ہیں جن سے خود ہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ میرا دعویٰ دلیل تک رسائی رکھتا ہے یا نہیں۔ ان نظموں میں آج کی بدلتی قدروں کے فقدان پر بھی کچھ نظمیں ہیں اور دور حاضر کے سیاسی شعبدہ گروں کے کرتب پر بھی۔

کتاب کا آخری حصہ شاعر کے عربی وفارسی کلام پر مشتمل ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کس قدر زود گو اور انھیں عربی وفارسی زبان پر کتنی قدرت حاصل تھی۔ بحیثیت مجموعی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ 'کلیات رہبر' میں شاعری کے وہ تمام اوصاف پائے جاتے ہیں جس سے ایک اچھی شعری تخلیق منظر عام پر آتی ہے۔ کلیات رہبر میں کمپیوٹر کی غلطیاں نہ ہونے کے برابر ہیں جو ایک خوبی ہی ہے اور اشعار میں اعراب بالخصوص اضافت کا اہتمام کیا گیا ہے۔

معلومات عامہ

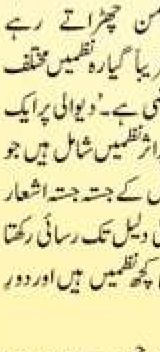

جنرل نالج کوئز

مرتب: کمال الدین محمود مانڈلیکر

صفحات: 164، سنہ اشاعت: مارچ 2016

ناشر: آئیڈیل فاؤنڈیشن، ممبئی

مبصر: محمد نصر اقبال، 101، پیریار ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی 67

آج دنیا ایک عالمی گاؤں بن گئی۔ جدید ٹکنالوجی عروج پر ہے۔ روز کچھ نہ کچھ نیا ہورہا ہے۔ تعلیمی ترقی بھی پروان چڑھ رہی ہے، اور ہر عام وخاص کو تعلیم کی اہمیت کا اندازہ بھی ہورہا ہے۔ ہر شخص ایک دوسرے سے آگے نکلنے میں سرگرداں ہے اور محنت وکوشش سے کامیاب بھی ہورہے ہیں، ہندوستان کی کوئی ریاست علاقہ ایسا نہیں ہے جہاں تعلیم کی گونج سنائی نہ دے رہی ہو، بلکہ اب تو بڑی تیزی سے گاؤں سے طلبا بڑے شہروں کی طرف رخ کرتے ہیں اور اچھی اور معیاری یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ اب چونکہ وقت مسابقے کا ہے۔ اس لیے ہر جگہ امتحان پاس کرکے آنا ہوتا ہے۔ کسی بھی اچھے ادارے میں انٹرنس میں کامیابی کے بغیر داخلہ پانا ممکن نہیں ہوتا ہے۔ اسی انٹرنس کی تیاری یا دیگر مقابلہ جاتی امتحانات کی تیاری کے لیے آئے روز مختلف زبانوں میں کوئی نہ کوئی کتاب بازار میں آتی رہتی ہے۔ بھارت میں انگریزی

اور ہندی زبان میں جنرل نالج کی کتابیں تو ہر جگہ دستیاب ہیں اس کے برعکس اردو زبان میں اس طرح کی معلوماتی کتابیں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں، اسی کمی کو محسوس کرتے ہوئے آئیڈیل فاؤنڈیشن نے ایک اچھی کوشش کی ہے۔

زیر نظر کتاب 'جنرل نالج کوئیز' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ کتاب 164 صفحات پر مشتمل ہے۔ کمال الدین مانڈلیکر نے اس کتاب کو بڑی محنت سے مرتب کیا ہے۔ کمال صاحب کا وطنی تعلق دابھول ضلع رتناگیری مہاراشٹر سے ہے۔ موصوف ایک کمپنی میں ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز ہیں۔ ان کی اردو سے حد درجہ محبت و لگن کا نتیجہ ہے کہ جس کتاب کی کمی اردو زبان میں شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ اس کو کمال صاحب نے ایک معروف ترین عہدے پر رہتے ہوئے کامیابی کے ساتھ انجام دینے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کو سات حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ مذہبی نوعیت کا ہے، جبکہ دوسرے حصے میں اردو ادب سے متعلق 198 سوالات ہیں تیسرے حصے میں جغرافیہ کے 251 سوالات ہیں، چوتھے حصے میں تاریخ و شہریت کے عنوان سے 305 سوالات قائم کیے گئے ہیں۔ پانچویں حصے میں سائنس کے 164 سوالات درج ہیں۔ چھٹے حصے میں معلومات عامہ کے 71 سوالات ہیں اور آخری حصے میں معلومات عامہ کے تحت ہی 'اسپیڈ راؤنڈ' کے بھی 19 سیٹ درج ہیں ہر سیٹ 10 سوالات پر مشتمل ہے۔ تمام حصوں میں پہلے سوالات ہیں۔ پھر جوابات درج ہیں اس کتاب میں تمام طرح کے سوالات موجود ہیں۔ جو عموماً مقابلہ جاتی امتحانات میں پوچھے جاتے ہیں۔ یہ کتاب ہر طرح کے طلبا کے لیے مفید ہے۔ خواہ وہ اسلامیات، اردو ادب، سائنس، تاریخ، جغرافیہ کے کسی بھی اسٹریم سے ہوں، اس میں اردو ادب کے حصے کے تحت کچھ اشعار بھی دیے گئے ہیں، جو کہ خاص طور سے یو جی سی کے امتحان کے لیے کارآمد ہو سکتے ہیں۔ یہ کتاب نہ صرف اسکولی طلبا کے لیے ہے، بلکہ اس سے یونیورسٹی اور کالجز کے طلبا بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ خصوصاً وہ بچے جو اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی بی ایڈ کے انٹرنس کے لیے بھی یہ کتاب مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک عام شہری بھی اپنی معلومات میں اضافے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ کر سکتا ہے۔

کتاب کے اندر کچھ خامیاں بھی ہیں جس کی نشاندہی ضروری ہے تاکہ آئندہ ایڈیشن میں ان کا ازالہ کیا جاسکے، اول تو یہ کہ ادب کے 198 سوالات ہیں، جبکہ جوابات 192 ہی درج کیے گئے ہیں۔ اسی طرح جغرافیہ کے سوالات کی تعداد 251 ہیں جوابات 241 ہی درج ہیں۔ ساتھ ہی صفحہ نمبر 88 اور 89 پر درج تمام جوابات مکرر شائع ہو گئے ہیں۔ دوسری یہ ہے کہ کچھ سوالات گنجلک ہیں اس کی وضاحت کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر صفحہ نمبر 146 پر پہلا سوال صفحہ نمبر 151 پر آخری سوال۔ اسی طرح سے صفحہ نمبر 95 کا 110واں سوال کا جواب غلط درج ہے۔ صفحہ 46 کا 26 نمبر کے سوال کا جواب بھی غلط درج ہے۔ اس طرح کی کچھ خامیاں ہیں جو کہ کسی غلطی کی بنیاد پر رہ گئی ہیں امید ہے آئندہ ایڈیشن میں ان کا ازالہ ہو جائے گا۔

تصوف

عکس سلک (منظوم ترجمہ) 'سلک السلوک'

مصنف / ناشر: دلکش بدایونی

صفحات: 408، قیمت: 214 روپے، سنہ اشاعت: 2015

مبصر: ایاز احمد، ریسرچ اسکالر، جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی

ترجمہ ایک دشوار ترین عمل ہے مگر اس کے بغیر زندگی کے ارتقا کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اقوام عالم میں ربط باہمی کا وسیلہ ترجمہ ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ قوموں کے افکار و نظریات کے ابلاغ و ترسیل میں ترجمہ کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ دنیا میں تمام علوم و فنون اور تہذیب و ثقافت کی ترقی کا دار و مدار ترجمے پر ہوتا ہے۔ دراصل ترجمے کی ضرورت زندگی کے ہر میدان میں ہوتی ہے چاہے وہ علوم و فنون اور زبان و ادب کا ہو یا تہذیب و ثقافت کا۔ البتہ ادبی تراجم کی مشکلیں دو چند ہوتی ہیں۔ اگر مترجم متعلقہ دونوں زبانوں پر مکمل دسترس اور ان کی تہذیبی روایات سے پوری واقفیت نہ رکھتا ہو تو وہ ترجمے کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ یہی سبب ہے کہ ادبی تراجم کی طرف کم توجہ دی گئی اور اردو میں یہ کام بیشتر معاشی ضرورتوں کے تحت کیا جاتا رہا ہے۔ تاہم اردو ادب میں ایک قابل لحاظ تعداد ایسے مترجمین کی بھی ہے جنھوں نے صلہ و ستائش کی تمنا کیے بغیر ترجمے کی دولت سے اردو ادب کو مالا مال کیا ہے۔ ایسے ہی لوگوں میں ایک معتبر نام جناب دلکش بدایونی کا بھی ہے۔

دلکش بدایونی کا میدان عمل ادب کی متنوع جہات کا احاطہ کرتا ہے۔ انھوں نے غزل، نظم، قطعہ، رباعی اور مثنوی کے علاوہ طنز و مزاح میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اب تک ان کی بارہ کتابیں شائع ہو کر منظر عام پر آچکی ہیں۔ اس کے علاوہ پانچ کتابیں ہندی رسم الخط میں بھی چھپ چکی ہیں۔ ان کا قلم نثر و نظم دونوں میدانوں میں یکساں طور پر رواں دواں رہتا ہے۔ ان کے موضوعات میں بھی طرفگی پائی جاتی ہے۔ پیش نظر کتاب 'عکس سلک' علامہ نخشبی کی ایک نایاب فارسی تصنیف 'سلک السلوک' کا منظوم اردو ترجمہ ہے۔ جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں اکیاسی (81) اور دوسری جلد میں ستر (70) سلکوں کا منظوم ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ تصوف کے موضوع پر مبنی اس فارسی تصنیف کا ترجمہ کر کے جناب دلکش بدایونی نے بزرگوں سے اپنی عقیدت اور گہرے مذہبی تعلق کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا، مذکورہ کتاب تصوف کے مختلف موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ ہر سلک میں ایک الگ موضوع پر بات کی گئی ہے۔ موضوع کو دلکش بنانے کے لیے اکثر مقامات پر قصص و حکایات کا انداز اپنایا گیا ہے۔ کتاب کا آغاز بالکل روایتی انداز میں حمد پاک سے ہوا ہے جس کا لہجہ اول تا آخر دعائیہ ہے۔ حمد کے بعد ایک طویل نعت بحضور سرور کائنات نہایت ملتجیانہ انداز میں پیش کی گئی ہے۔ نعت کے آخر میں بغیر کسی عنوان کے پہلے جلد اول کی کیفیات کا ذکر کیا گیا اور آخر میں کچھ لوگوں کے اظہار تشکر کے طور پر ان کے لیے دعا کی گئی ہے۔ اس کے بعد سلک بیاسی (82) کی تمہید کے تعلق سے چودہ اشعار درج کرنے کے بعد اصل کتاب کا آغاز ہوتا ہے۔

ستر سلکوں پر مشتمل یہ کتاب تصوف کے مختلف موضوعات کا احاطہ کرتی ہے، جنھیں مثنوی کی ہیئت میں پیش کیا گیا ہے۔ زبان نہایت سادہ اور رواں ہے۔ جگہ جگہ حکائی انداز بیان مثنوی کو اور زیادہ دلچسپ بنا دیتا ہے۔ بزرگوں کے اقوال اور ان کے حالات کا بیان کتاب مذکور کو مذہبی حیثیت عطا کر دیتے ہیں۔ اس کتاب میں حضرت رابعہ بصریؒ، حضرت حسن منصورؒ، حضرت بایزید بسطامیؒ اور حضرت حسن بصریؒ وغیرہ کے حالات تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ کتاب کے آخر میں عبدالحسیف صاحب (موذن میر سرائے بدایوں) کے قلم سے دلکش بدایونی کو منظوم خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد 'سلک کا شاعر' کے عنوان سے دلکش بدایونی کا تعارف کروایا گیا ہے۔ بعدہٗ 'نذر دلکش بدایونی' کے عنوان سے ایک غزل نما نظم عبداللطیف خاں کے قلم سے ہے۔ آخر میں علامہ نخشبی کی شان میں ایک مختصر منقبت بھی شامل کتاب ہے، اور سب سے آخر میں عنوانات کی فہرست درج کی گئی ہے۔

دلکش بدایونی کا یہ منظوم ترجمہ ایک ادبی کارنامہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے علامہ نخشبی کی کتاب کا ترجمہ کر کے بزرگوں سے اپنی والہانہ عقیدت کا ثبوت دیا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ بغیر سچی لگن اور عقیدت کے اس قدر وقیع اور بسیط ترجمے کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔ ترجمے میں زبان و بیان اور فن کی نزاکتوں کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ تقریباً چار سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب اردو ادب کے سرمائے میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

رسائل وجرائد

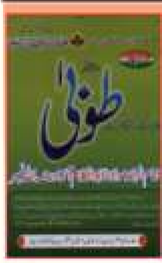

ماہنامہ مجلہ **طوبیٰ** مشرقی چمپارن (مولانا ابوالکلام آزاد نمبر)
مدیر: ارشد فہیم المدنی
جلد نمبر: 16، شمارہ نمبر: 11-9 (ستمبر نومبر 2016)
صفحات: 264، قیمت: 25 روپے
ناشر: علامہ عبدالعزیز بن باز اسلامک اسٹڈیز سنٹر، مشرقی چمپارن،
مبصر: حقانی القاسمی

مولانا ابوالکلام آزاد (پ: 11 نومبر 1988، و: 22 فروری 1958) جیسی عبقری اور نابغہ شخصیت پر ماضی میں بہت سے علمی اور ادبی رسالوں کے خصوصی شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ ان خصوصی شماروں میں مولانا کی شخصیت اور افکار کی تمام تر جہتوں اور زاویوں کے احاطے کی کوشش کی گئی ہے۔ پھر بھی مولانا ابوالکلام آزاد پر کتابوں اور خصوصی شماروں کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے۔ تو اس کا واضح مطلب ہے کہ مولانا آزاد کی شخصیت ایک بحر بے کراں ہے جس کی بہت سی موجوں اور لہروں سے آشنائی کے سلسلے مستقبل میں بھی جاری رہیں گے۔ اسی خصوص میں جامعہ ابن تیمیہ کے فکری ترجمان ماہنامہ 'طوبیٰ' کا ایک خصوصی شمارہ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے تعلق سے شائع کیا گیا ہے جس میں مولانا آزاد کے تعلق سے بیش قیمت مضامین شامل ہیں اور ان مضامین کی خاص بات یہ ہے کہ ان کے زیادہ تر لکھنے والے مدارس کے فیض یافتہ ہیں اور مولانا آزاد کی شخصیت اور افکار سے والہانہ عقیدت رکھتے ہیں۔ اس خصوصی شمارے سے ان علما کے زاویہ نظر کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کو کس تناظر اور سیاق وسباق میں دیکھتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد لقمان سلفی نے جہاں ان کے 'تجدید احیائے دین' کو اپنا موضوع بنایا ہے وہیں اشتیاق عالم تیمی نے 'تحریک آزادی میں مولانا آزاد کے قائدانہ کردار' کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافتی خدمات کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ اس تعلق سے اشفاق سجاد سلفی، شفقت فاطمہ تیمی، سندس ابوالقیس تیمی کی تحریریں شامل کی گئی ہیں۔ مولانا آزاد اور آزاد ہندوستان کے تعلق سے جو مضامین شامل کیے گئے ہیں ان میں اسدالرحمٰن تیمی، نورالاسلام شفیع مدنی، عقیل ساجد تیمی، شمشاد عالم سعیدالرحمٰن تیمی کے مضامین خیال افروز ہیں۔ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی اور مولانا آزاد کے تعلیمی وژن اور مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کے تعلق سے شکیل احمد عصری، محمد ذبیح اللہ عبدالرؤف تیمی کی نگارشات قابل قدر ہیں۔ ان کے علاوہ ابوالقیس عبدالعزیز مدنی، فیصل عزیز مدنی، عبدالرحمٰن عبیداللہ تیمی، شفیق اسماعیل سلفی، نصرت وصی اختر تیمی، زبیر عالم تیمی وغیرہ کے مقالات بھی اس میں شامل کیے گئے ہیں۔

ماہنامہ 'طوبیٰ' میں مولانا آزاد کی مشہور تصانیف کے حوالے سے بھی مضامین کی شمولیت ہوئی ہے۔ ان میں 'غبار خاطر' اور 'تذکرہ' شامل ہیں۔ ارشد فہیم مدنی نے جہاں 'ترجمان القرآن کی معنویت واہمیت' کے حوالے سے نہایت معنی خیز گفتگو کی ہے وہیں صادق جمیل تیمی نے 'تذکرہ' کے حوالے سے مولانا آزاد کے اسلوب نگارش کا جائزہ لیا ہے۔ ذبیح اللہ نوراللہ تیمی نے مولانا آزاد کی تالیفات وتصنیفات کے آئینے میں مولانا کی علمی اور تصنیفی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔ اس کے علاوہ محمد ابراہیم سجاد تیمی، کوثر اعظمی تیمی، عبدالصمد ضمیر، ناہد سفیان تیمی، محمد عزیز سجاد ماجدی کے مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو آزاد شناسی کے باب میں 'طوبیٰ' کا یہ خصوصی شمارہ ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ اس کے مدیران ارشد فہیم مدنی، محمد ابراہیم سجاد تیمی اور متعلقین مبارک باد کے مستحق ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے حوالے سے ایک ایسا شمارہ مرتب کیا ہے جس کی علمی اور ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

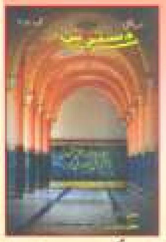

سہ ماہی **دسترس** دھنباد (مولانا انوارالحق شہودی نازش سہرامی نمبر)
مدیر: ڈاکٹر رونق شہری، معاون مدیران: ڈاکٹر حسن نظامی، احمد نثار
شمارہ: 6-5، اکتوبر تا دسمبر 2015
صفحات: 250، قیمت: 100 روپے، سنہ اشاعت: 2015
ناشر: ڈاکٹر رونق شہری، واسع پور، دھنباد، جھارکھنڈ
مبصر: محمد اشرف یاسین،
D-103، زہرہ پبلک اسکول، شاہین باغ نئی دہلی 110025

اردو ادب کی ترویج واشاعت میں یوں تو بہت سارے ادبی رسائل وجرائد آئے دن جاری ہوتے ہیں لیکن ان میں سے بعض کو ہی شہرت وناموری حاصل ہوتی ہے اور عوام الناس کی پزیرائی ملتی ہے۔

دسترس دھنباد جھارکھنڈ سے شائع ہونے والا شاید یہ پہلا اردو کا شمارہ ہے جس نے اتنی قلیل مدت میں اپنی ایک الگ شناخت قائم کی اور پانچویں شمارے کی شکل میں ایک عظیم عالم وداعی مولانا انوارالحق شہودی المتخلص نازش سہرامی پر خصوصی گوشہ نکالنے کا شرف حاصل کیا۔

دسترس کے اس خصوصی شمارے کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں نازش سہرامی کی شاعری کے حوالے سے خصوصی اور سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے اس حصے میں پروفیسر علی احمد فاطمی، ڈاکٹر قاسم فریدی اور ڈاکٹر شاہد رضوی سمیت کل گیارہ لوگوں کے مقالات شامل ہیں۔

واضح رہے کہ یہ خصوصی شمارہ مولانا کی صدی تقریبات کے سلسلے کی ہی ایک کڑی ہے۔ اسی حصے میں مولانا کی نثر نگاری کے تعلق سے کل آٹھ مقالے شامل ہیں اور مولانا موصوف کی تصنیف کردہ دسوں کتابوں کا تذکرہ بھی موجود ہے۔

مولانا محترم کے تعلق سے پانچ سوانحی مضامین بھی شامل اشاعت کر کے ان کی سوانح عمری پر بھی کامیاب روشنی ڈالی گئی ہے، جس میں مولانا کے اسلاف، مولانا انوار شہودی خوشبودار روشنی کا مینار، حافظ انوار الحق شہودی اور مشاہیر بہار جیسے سوانحی مضامین ہیں۔

دوسرے حصے میں لوگوں کے تاثرات ہیں جن میں مولانا شاہ اعوان احمد، مولانا منت اللہ رحمانی، مولانا ہشام الدین فریدی، پروفیسر عنوان چشتی، مولانا شفیق فریدی، ڈاکٹر شاہ اکمل اجملی جیسے قد آور علما، وسجادگان شامل ہیں۔ نثری تاثرات میں حفیظ بناری، احمد یوسف، مقیم شاد سمیت کل گیارہ لوگوں کے مزید تاثرات شامل ہیں۔ جب کہ منظوم تاثرات میں بھی گیارہ شعراء شامل ہیں۔

تیسرے حصے میں مولانا کی لگ بھگ چار درجن مختلف غزلیں شامل کر کے قارئین کو مولانا کی غزلیہ شاعری سے روشناس کرانے کی ایک مستحسن کوشش کی گئی ہے۔

چوتھے حصے میں مولانا کے کل پانچ نثر پارے درج کیے گئے ہیں تاکہ قارئین آپ کے نثری اسلوب سے بھی آشنا ہو جائیں۔ مولانا کے یہ نثر پارے پڑھنے ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسلوب انتہائی شستہ اور سادہ، عمدہ اور بہترین ہے اس میں سلاست اور روانی اس حد تک پائی جاتی ہے کہ اکتاہٹ بالکل بھی نہیں ہوتی۔ نظم ونثر پر مشتمل دو خطوط مولانا ہی کی ہینڈ رائٹنگ (رسم الخط) میں پیش کیے گئے ہیں۔ کل ملا کر شمارہ نہایت عمدہ ہے۔

عالمی اردو نامہ

قطر میں اردو کا بین الاقوامی سیمنار

دوحہ: یہ صحیح ہے کہ ہجرت کرتے وقت مہاجرین خوش نہیں

تھے لیکن گذشتہ دہائیوں میں ان مہاجرین نے اردو ادب میں جو وقیع سرمایہ یادگار چھوڑا ہے، اُس سے اردو بہت خوش ہے۔ اگر ہجرت نہ ہوئی ہوتی تو ہجری ادب کا ایسا قیمتی سرمایہ سامنے نہیں آتا۔ اس میں روایت کی آمیزش اور برصغیر کی ادبی سمت و رفتار کی آمیزش بھی ہے لیکن حالات اور وقت کی ضرورت کے اعتبار سے برصغیر کے ادب سے آویزشیں بھی نظر آتی ہیں۔ انھی دونوں کیفیات سے اردو کی نئی بستیوں کا نیا ادب فروغ پاتا ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے بزمِ صدف انٹرنیشنل کے بین الاقوامی سیمنار بعنوان 'اردو میں ہجری ادب' اور تقسیم انعامات کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے یہ بھی اعلان کہ انشاء اللہ آئندہ سال وہ عالمی اردو کانفرنس کا انعقاد خلیج کے کسی ملک میں کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں کیونکہ ان نئی بستیوں کے وقار اور عظمت کے عین مطابق ہمیں نئے منصوبے بھی بنانے ہوں گے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم اس عالمی سیمنار کی صدارت کرتے ہوئے مذکورہ باتیں پیش کر رہے تھے۔ مشہور برطانوی شاعر باصر سلطان کاظمی جو معتبر جدید شاعر ناصر کاظمی کے صاحب زادے نے سیمنار کا کلیدی خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے اپنی بات اس شکایت سے شروع کی کہ برصغیر کی ادبی تنقید اردو کی عالمی بستیوں کے ادبی سرمائے سے بالعموم اغماض برتتی ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی سے آئے ڈاکٹر واحد نظیر نے اپنے مضمون 'ہجری ادب: چند بنیادی باتیں' میں ہجری ادب کے سلسلے سے بعض بنیادی باتیں پیش کیں جن سے اس صنف کے دائرۂ کار کا تعین ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ کناڈا سے آئے جاوید دانش نے اپنے مضمون 'ہجری ڈراموں میں شفا بخش عناصر' میں ڈراموں کے حوالے سے جدید طرز پر نفسیاتی علاج میں کس طرح ڈرامے کارگر ہو رہے ہیں، ان امور کی وضاحت کی۔ پروگرام کی نظامت پروفیسر صفدر امام قادری نے کی۔ قطر میں ہندوستانی سفیر پی کمارن کے ہاتھوں سے بزمِ صدف بین الاقوامی ایوارڈ کا مومنٹو، شال اور ایک لاکھ روپے کی رقم ممتاز ڈراما نگار اور شاعر جاوید دانش کو پیش کی گئی۔ ڈاکٹر واحد نظیر کو بزمِ صدف نئی نسل ایوارڈ مومنٹو، شال اور اکیاون ہزار روپے کے ساتھ پیش کیا گیا۔ تقریب کا آخری حصہ بین الاقوامی مشاعرے پر مشتمل تھا جس میں ہندوستان، پاکستان، برطانیہ، کناڈا، قطر اور ظہبی کے شعرائے کرام شامل تھے۔ نظامت انجم بارہ بنکوی، بھوپال نے کی اور صدارت محمد صبیح بخاری نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 22 دسمبر 2016

جشن منور رانا

دوحہ: دوحہ کی ادبی تنظیم 'کاروانِ اردو قطر' کے زیر اہتمام ڈی پی ایس ایم آئی ایس اسکول، الوکرہ (دوحہ) کے آڈیٹوریم میں 'جشن منور رانا' کے عنوان سے عالمی مشاعرے کا انعقاد ہوا، جس میں صاحب جشن اور ممتاز شاعر منور رانا کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی خدمت میں حاصل حیات ایوارڈ برائے اردو شاعری اور ایک لاکھ ہندوستانی روپے کا چیک پیش کیا گیا۔ آڈیٹوریم میں موجود برصغیر سے تعلق رکھنے والے 1200 سے زیادہ محبان اردو نے کھڑے ہوکر تالیوں کی گونج میں صاحب جشن کی تائید وتکریم کی۔ قطر میں ہندوستانی سفارت خانے کے تھرڈ سکریٹری اور مہمان خصوصی ڈاکٹر محمد علیم، مہمان اعزازی اور بزرگ شاعر حبیب ہاشمی، ہندوستانی کمیونٹی کی معروف سماجی شخصیت اور کاروان اردو کے چیئرمین عظیم عباس اور کاروان اردو کے بانی وصدر اور جدید لب و لہجے کے معروف شاعر عتیق انظر کے ہاتھوں ایوارڈ کی یہ پروقار تقریب عمل میں آئی۔ اس مناسبت سے کاروان کی سرگرمیوں اور مشاعرے میں شریک تمام شعرا کے کلام پر مشتمل مجلّے کا اجرا بھی ہوا۔ صاحب جشن اور صدر مشاعرہ منور رانا نے ایوارڈ حاصل کرنے کے بعد کاروان اردو اور اہالیان قطر کا شکریہ ادا کیا۔ محفل کا آغاز کاروان کے نائب میڈیا سکریٹری رمیض احمد تقی کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ اس کے بعد کاروان کے جنرل سکریٹری محمد شاہد خان نے انسان کی زندگی میں مادری زبان کی اہمیت اور اردو کی ترویج وترقی پر مختصر گفتگو کی۔ اس عالمی مشاعرے کے لیے ہندوستان سے عظیم عباس کی والدہ محترمہ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر ڈاکٹر ہمایوں اختر نظمی بطور خاص تشریف لائے۔ عتیق انظر نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا جبکہ عظیم عباس نے مشاعرے کے تمام معاونین، اسپانسرس اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر محمد علیم اور مہمان اعزازی حبیب ہاشمی نے صاحب جشن کو مبارکباد پیش کی اور کاروان اردو

کے ذمے داروں کا شکریہ ادا کیا۔ معروف شاعر منصور عثمانی نے اپنی سحر انگیز نظامت سے مشاعرے کو بلندی اور ادبی وقار عطا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 دسمبر 2016

کراچی میں عالمی اردو کانفرنس

کراچی: کراچی میں نویں عالمی اردو کانفرنس میں مشتاق یوسفی،

اسد محمد خاں، آئی اے رحمٰن، زہرا نگاہ، پیرزادہ قاسم، رضا علی عابدی، حسینہ معین، نورالہدیٰ شاہ، فاطمہ حسن، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، آصف اسلم فرخی، پروفیسر سحر انصاری، شہناز صدیقی، احمد شاہ، زاہدہ حنا، امداد حسینی، پروفیسر اعجاز فاروقی، اطہر وقار عظیم اور دیگر سیکڑوں نامور ادیب و شعرا شریک رہیں۔ کانفرنس میں ہر روز مختلف موضوعات پر مختلف سیشن کا اہتمام کیا گیا ہے۔ پاکستان بھر سے اور تمام مقامی زبانوں سے تعلق رکھنے والے ادیب کانفرنس میں شریک رہیں۔ کانفرنس کے پہلے دن کے تیسرے سیشن میں 'ذکر یار چلے' کے عنوان سے شیما کرمانی کی تحریک نسواں کے زیر اہتمام فیض احمد فیض کی زندگی اور شاعری کے بارے میں تمثیل اور رقص پر مبنی شاندار پرفارمنس پیش کی گئی جسے خوب عوامی پذیرائی ملی۔ اس کی ہدایات انور جعفری نے دیں۔ فیض احمد فیض کی زندگی اور ان کے اشعار کو نوجوان آرٹسٹوں نے رقص اور تمثیل کے ذریعے شرکا کے سامنے پیش کیا۔

کانفرنس کے دوسرے دن کے پہلے سیشن میں 'نعت اور ادبی روایات' پر تبادلہ خیال ہوا۔ پروفیسر سحر انصاری کا کہنا تھا کہ ''نعت گوئی حمد و نعت لکھنے والوں کے لیے انتہائی معتبر ہے۔ نعت گوئی پر اب بھی کام کرنے کی بہت ضرورت ہے۔'' اس سیشن میں رؤف پاریکھ، ڈاکٹر جہاں آرا لطفی، عزیز احسن، شاداب احسانی، تنظیم الفردوس اور عنبرین حسیبن عنبر نے بھی خطاب کیا۔ دوسرے سیشن کا موضوع 'زبان و ادب کا فروغ اور نصاب تعلیم' تھا جس سے ڈاکٹر پیرزادہ قاسم نے صدارتی خطاب کیا۔ تیسرے سیشن کا موضوع 'چہ مستانہ می رود!... غالب سے اقبال تک' تھا جس پر ڈاکٹر نعمان الحق نے لیکچر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ''غالب اور اقبال کی پہچان مشترکہ جدید شاعری ہے اور جدید شاعری کی روایت میں حالی کے کردار کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔'' چوتھا سیشن 'نئے سماجی ذرائع اور ابلاغ کی صورت حال' کے موضوع پر تھا۔ اس کے شرکا میں رضا علی عابدی، غازی صلاح الدین، مظہر عباس، نورالہدیٰ شاہ، ڈاکٹر نعمان نقوی، وسعت اللہ خان اور ڈاکٹر محمد ایوب شیخ شامل تھے۔ پانچواں سیشن 'پاکستانی زبانیں اور قومی ہم آہنگی' پر رکھا گیا جس سے خطاب میں ڈاکٹر قاسم بگھیو نے کہا کہ ''ہمیں اپنے کلچر کو آگے بڑھانے کے لیے خود جدوجہد کرنا ہوگی۔ لوگ مرجاتے ہیں، ثقافتیں زندہ رہتی ہیں۔'' چھٹا سیشن مایہ ناز ناول اور افسانہ نگار مرزا اطہر بیگ سے ملاقات پر مشتمل تھا جس کی میزبانی ڈاکٹر آصف فرخی نے انجام دی۔

مرزا اطہر بیگ نے کہا کہ میرے ناول میں میرا تنقیدی نقطہ نظر بھی موجود ہے۔ میری ناول نگاری کا سفر جاری ہے۔ ٹی وی ڈرامہ میری تسکین نہیں، میں نے ڈرامے آمدنی کی غرض سے لکھے۔ اس سے ادب کا کوئی تعلق نہیں تھا لیکن ڈرامے سے میری ناول نگاری کو بہت فائدہ ہوا۔ میرا ہر سیریل ایک ناول نظر آتا ہے، میں ڈرامہ لکھتا تھا تو لوگ کہتے ہیں فلسفہ لکھتا ہے، میرا ڈرامہ 'دوسرا آسمان' ایک مقبول ڈرامہ تھا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 4 دسمبر 2016

رضا لائبریری کی طرف سے مسقط میں نمائش کا انعقاد

رام پور: فیسٹول آف انڈیا کے تحت رضا لائبریری نے

مرکزی حکومت کے محکمۂ ثقافت کے ساتھ عمان کی راجدھانی مسقط میں نمائش لگائی ہے، جس میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ہاتھ سے لکھا ہوا قرآن پاک سمیت 40 اسلامی طغرے اور کیلی گرافی کے عکس لگائے گئے ہیں۔ 21 نومبر کی شام عمان کے وزیر وراثت و ثقافت حسان بن محمد علی الواتی مسقط میں فیتہ کاٹ کر افتتاح کیا۔ اس موقعے پر رضا لائبریری کی ڈائرکٹر و محکمۂ ثقافت حکومت ہند کی سکریٹری دیپکا پوکھرن اور رضا لائبریری کے سینئر تکنیکی ریسٹورر سید طارق اظہر موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 نومبر 2016

ٹورنٹو میں سیدہ سیدین کا استقبال

ٹورنٹو: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی سابق چانسلر ڈاکٹر سیدہ سیدین کی کنیڈا آمد پر ان کے اعزاز میں ٹورنٹو میں معروف اسکالر، شاعر و ادیب ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنی رہائش گاہ پر شاندار تقریب کا اہتمام کیا۔ تقریب کی صدارت ٹورنٹو میں پاکستان کے قونصلر جنرل عمران احمد

صدیقی نے کی۔ اس تقریب میں ہندوستان سے تعلق رکھنے والے شاعر اعظم کوہلی اور سہیل رعنا بھی موجود تھے۔ ڈاکٹر تقی نے سیدہ سیدین کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ وہ مولانا الطاف حسین حالی کی پڑپوتی ہیں۔ انھوں نے اس موقعے پر ڈاکٹر سیدہ سیدین کا مکمل تعارف اور خاندانی پس منظر پیش کیا اور اس کے ساتھ ہی انھوں نے سیدہ سیدین کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ اس تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر سیدہ سیدین نے کہا کہ انھوں نے امریکہ میں تعلیم حاصل کی اور کنیڈا میں اپنی پی ایچ ڈی کی تکمیل کی۔ جس وقت انھوں نے اپنے وطن ہندوستان جانے کا فیصلہ کیا، یہ کافی مشکل وقت تھا۔ انھوں نے خواتین کے حقوق کے لیے کام کیے اور وہ سیاسی طور پر بھی متحرک رہیں۔ سابق وزیر اعظم اندر کمار گجرال نے انھیں قومی کمیشن برائے خواتین کے لیے نامزد کیا جبکہ وزیر اعظم منموہن سنگھ نے انھیں پلاننگ کمیشن کا ممبر بنایا۔ حاضرین مجلس نے بھی اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2016

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبرنامہ

قومی اردو کونسل صحافت اور ادب کے میدان میں دو انعامات دے گی

میرٹھ: شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے پریم چند سمینار ہال میں ایک پریس کانفرنس منعقد ہوئی جس میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے صحافیوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ایک سرکاری ادارہ ہے۔ اردو کی ترقی کے لیے پورے ہندوستان میں جو بھی خاکہ تیار ہوتا ہے اس میں اس ادارے کا اہم کردار ہے۔ مختلف اسکیموں کے تحت اردو کی ترقی کی کوششیں مسلسل جاری ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اس بار قومی کونسل دو بڑے ایوارڈ پانچ پانچ لاکھ کے شروع کرنے جارہی ہے۔ ایک صحافت کے لیے اور دوسرا ادب کے لیے۔ ساتھ ہی قومی کونسل اس بار بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد کسی باہری ملک میں کرے گی۔ انھوں نے صحافیوں کو مزید جانکاری دیتے ہوئے کہا کہ قومی کونسل کے سالانہ کتابی میلے میں نوٹ بندی کے باوجود امسال تقریباً ڈیڑھ کروڑ کی کتابیں فروخت ہوئی ہیں جو کہ ایک ریکارڈ ہے۔ علاوہ ازیں قومی کونسل کے تحت عربی، اردو اور فارسی کے سینٹر چلائے جاتے ہیں جن کو ادارہ دیگر فلاحی اداروں اور مدارس وغیرہ کے اشتراک سے چلاتا ہے اور ملک بھر کے طالب علم اس سے فیض یاب ہورہے ہیں اور دوسرا شعبہ کمپیوٹر لرننگ سے متعلق ہے جس کے تقریباً 1000 سینٹر ہے اور ہر سینٹر پر تقریباً چالیس طالب علم ہوتے ہیں۔ انگلش، اردو، عربی اور ہندی وغیرہ کی ٹائپنگ سکھائی جاتی ہے۔ یہ قومی کونسل کا وہ کارنامہ ہے جس نے بہت سے طلبہ کو روزگار سے وابستہ کردیا ہے۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 1 جنوری 2017

قومی اردو کونسل، نئی دہلی کا ادبی کلینڈر 2017: ایک تعارف

اردو کی مختلف کتابوں کے مصنف ومؤلف، شہرت کی بلندیوں اور اعلیٰ منصب پر فائز اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے قومی کونسل کے جس کلینڈر 2017 کو مرتب کیا ہے وہ صرف ایک کلینڈر ہی نہیں ایک تحقیقی کارنامہ بھی ہے جس کی افادیت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں ذہانت اور محنت دونوں کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

اس کلینڈر میں حسرت موہانی، نول کشور، زاہدہ زیدی، بسمل سعیدی، عرفان صدیقی، پیغام آفاقی، وہاب دانش، شاہد کلیم، عبدالحلیم شرر، ہاجرہ مسرور، چکبست، قرۃ العین حیدر، صفیہ اختر، شاذ تمکنت، انور سدید، جوش ملیح آبادی، ڈپٹی نذیر احمد، انتظار حسین، مولانا محمد علی جوہر، مولانا عبدالمجید سالک، اوپندر ناتھ اشک، جگن ناتھ آزاد، ساغر نظامی، خلیق انجم، رشید احمد صدیقی، خواجہ حسن نظامی، اسداللہ خاں غالب اور مخمور سعیدی جیسے ادیبوں اور شاعروں کی تصاویر کے ساتھ ان سب کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کا بھی ذکر ہے۔ جنوری 2017 تا دسمبر 2017 کے درمیانی عرصے میں پیدا ہونے اور وفات پانے والے ادیبوں اور شاعروں کا ذکر ہے۔ یہی نہیں بلکہ جس ماہ کی جس تاریخ میں ادیبوں کی پیدائش اور وفات عمل میں آئی ہے اسی ماہ کی اسی تاریخ کے خانے میں ان کا نام بھی درج ہے۔ انگریزی اور اردو دونوں زبان میں نمبر کا اندراج ہے۔ ادبی شخصیات کی تاریخ پیدائش اور وفات سے متعلق معلومات ممتاز محقق مالک رام کی کتاب تذکرہ ماہ وسال اور دیگر سوانحی دستاویزات پر مبنی ہیں۔ قومی کونسل کا نام ہندی میں بھی درج ہے۔ ہفتہ کے ایام کے لیے اردو اور انگریزی دونوں زبان کا استعمال ہوا ہے۔ جنوری 2017 تا دسمبر 2017 بارہ مہینوں کا نام بھی اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں تحریر ہے۔ یہی نہیں بلکہ الگ الگ مہینوں میں پیدا ہونے اور وفات پانے والے ادیبوں کا نام متعلقہ ماہ وسال کے خانے میں ہی درج ہے۔ اتنی ساری تصویروں کو یکجا کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس بنا پر اس ادبی کلینڈر کو ایک تحقیقی کارنامہ کہنا مناسب نہیں ہوگا۔ مختلف ادیبوں کی تصویریں حاصل کرنا اور ان سب کی تاریخ پیدائش ووفات کے ساتھ ایک خاص ترتیب اور سلیقہ مندی کے ساتھ پیش کرنا لائق تحسین عمل ہے۔ قومی کونسل کا یہ ادبی کلینڈر سہ رنگی اور دیدہ زیب ہے۔ اس ادبی کلینڈر 2017 کو تیار کرنے میں ذہانت اور محنت دونوں کی کارفرمائی ہے۔ صفحۂ اول پر فروغ اردو بھون و ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم اور مرکزی وزیر جناب پرکاش جاوڈیکر کی تصویریں ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔

——ڈاکٹر احمد حسین آزاد، سابق پروفیسر وصدر، شعبۂ فارسی، مرزا غالب کالج، گیا (بہار)

ادبی شخصیات کے انتقال پر قومی اردو کونسل میں تعزیتی نشستیں

بلراج مین را

نئی دہلی: ممتاز افسانہ نگار اور رسالہ 'شعور' کے مدیر بلراج مین را کے انتقال پر اپنے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ بلراج مین را کی وفات سے اردو افسانہ ایک توانا اسلوب

سے محروم ہوگیا۔ ان کے افسانے اپنے اسلوب کی وجہ سے اکثر بحث کا موضوع بنتے تھے۔ بلراج مین را نے اکثر تجریدی افسانے لکھے اور ان افسانوں میں جن مسائل اور موضوعات کا احاطہ کیا وہ اکثر چونکانے والے ہوتے تھے۔ اسی وجہ سے ناقدین کے حلقے میں ان کے افسانوں پر منفی اور مثبت بحثیں ہوتی رہتی تھیں۔ بلراج مین را کی کمپوزیشن سیریز کے افسانوں نے افسانوی دنیا میں ایک تحرک پیدا کیا تھا اور اس جمود کو توڑا جو افسانوی ادب پر طاری تھا۔

پروفیسر ارتضیٰ کریم نے بلراج مین را کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ان کا ایک بڑا کارنامہ ہندی داں حلقے کو منٹو کی تحریروں سے جہاں روشناس کرانا تھا وہیں ان کا اہم کارنامہ رسالہ 'شعور' کی اشاعت بھی ہے جس نے بہت کم عرصے میں ادبی صحافت میں اپنی مستحکم شناخت قائم کی تھی۔ انھوں نے کہا کہ 'دستاویزات' کے عنوان سے انھوں نے منٹو کی تمام تحریروں کو جمع کیا تھا اور ہندی میں منٹو کی تحریروں کا ترجمہ کیا جو چھ (6) جلدوں میں چھپا جسے ہندی حلقے میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔

پروفیسر ارتضیٰ کریم نے بلراج مین را کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ بلراج مین را بالغ فکر و شعور کے حامل تھے۔ مختلف ادبیات پر ان کی گہری نظر تھی اور تنقیدی مضامین میں بھی ان کی داخلی بصیرت جھلکتی تھی۔ انھوں نے دوغلے پن، ریاکریسی اور منافقت کے خلاف اپنے افسانوں اور تنقیدی تحریروں میں احتجاج کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک بڑا ادبی حلقہ ان سے خائف رہتا تھا۔ انھوں نے کہا کہ ان کی پہلی کتاب 'سرخ و سیاہ' اور کہانی کا مجموعہ 'مقتل' ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوئے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے بلراج مین را کے حوالے سے کہا کہ اردو افسانے کی تاریخ ان کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گی۔ انھوں نے 'ماچس' اور 'کمپوزیشن سیریز' جیسے کئی شاہکار افسانے اردو دنیا کو دیے ہیں، اردو فکشن کو ان کی یہ بڑی عطا ہے جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا!

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 16 جنوری 2017

شہباز ندیم ضیائی

نئی دہلی: دبستان دہلی کے معتبر شاعر شہباز ندیم ضیائی کے انتقال پر اپنے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ شہباز ندیم ضیائی کے انتقال سے اردو دنیا ایک توانا اور تازہ لہجے کے شاعر سے محروم ہوگئی۔ شہباز ندیم ضیائی کا شمار نئی نسل کے ان شعرا میں ہوتا تھا جنھوں نے اپنی شعری اور تخلیقی صلاحیتوں سے دنیائے شعر و ادب کو متاثر کیا اور شاعری کے سرمایے میں گراں قدر اضافہ کیا۔

پروفیسر ارتضیٰ کریم نے شہباز ندیم ضیائی کے شعری کمالات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اپنے شعری مجموعے 'جذبوں کی زبان'، 'شہباز'، 'وصال موسم'، 'ایک چراغ تنہا سا' اور 'معجزہ' کے ذریعے اپنی تخلیقی ہنرمندی کا ثبوت دیا۔ انھوں نے ضیا خورجوی کی صحبتوں سے فیض حاصل کیا اور شاعری کی دنیا میں اپنا اعتبار قائم کیا۔ وہ مشاعروں کے مقبول شاعر تھے۔ دلی کی ادبی اور شعری محفلوں میں اکثر شریک ہوتے تھے اور اپنی تخلیقی نگارشات سے اہل محفل کو محظوظ کرتے تھے۔ انھیں صرف دلی کے ادبی حلقے میں ہی اعتبار حاصل نہیں تھا بلکہ پورے ہندوستان میں ان کے چاہنے والوں کی ایک خاصی تعداد تھی جو انھیں بہت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ انھوں نے جدید لہجے میں شعر کہے مگر کلاسیکیت سے اپنا رشتہ نہیں توڑا۔ کلاسیکی شعر و ادب سے ان کا ایک خاص لگاؤ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں کلاسیکیت کا رنگ ملتا ہے۔

پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ شہباز ندیم ضیائی نہایت منکسر المزاج اور مخلص انسان تھے۔ وہ اپنے بزرگوں کا بہت احترام کرتے تھے۔ وہ ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ عمدہ انسان بھی تھے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 17 جنوری 2017

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے

’یوم اردو‘ اور ہماری ذمہ داریاں

نئی دہلی: مقبول ومعروف عالمی شخصیت علامہ محمد اقبال کے یوم پیدائش (9 نومبر 1877) کی مناسبت سے اب ملک ہی نہیں بلکہ بیرون ملک میں بھی عالمی یوم اردو کا جشن منایا جارہا ہے۔ مادری زبان اردو بولنے، لکھنے، پڑھنے کی ترغیب دی جارہی ہے۔ حسب روایت اس بار 9 نومبر 2016 کو نئی دہلی کے کانسٹی ٹیوشن کلب میں اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے اشتراک سے حکیم اجمل خاں کی ادبی خدمات کو اجاگر کرنے کے لیے ایک سیمینار منعقد کیا گیا۔ اس موقع پر عالمی یوم اردو یادگار مجلّہ کا اجرا بھی کیا گیا۔ یہ یادگار مجلّہ کسی نہ کسی ملی و دینی شخصیت کے حوالے سے شائع کیا جاتا ہے۔ ماضی میں قاضی عدیل عباسی، ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی، معروف صحافی محمد مسلم، مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا ثناء اللہ امرتسری کی خدمات کو اجاگر کیا گیا تھا۔ 9 نومبر 2016 کو آزاد ہندوستان کے پہلے امیر جماعت اسلامی مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی کی حیات وخدمات پر مشتمل یادگار مجلّہ کا اجرا کیا گیا۔ اس یادگاری مجلّہ کی مجلس ادارت میں سہیل انجم، محمد عارف اقبال، ڈاکٹر سیّد احمد خاں اور جاوید اختر شامل ہیں۔

پریس ریلیز: محمد عارف اقبال، ایڈیٹر: اردو بک ریویو نئی دہلی، 23 دسمبر 2016

عصمت چغتائی کے افسانے آج کے تناظر میں

نئی دہلی: عصمت چغتائی ہمارے عہد کی مقبول ناول نگار ہیں۔ ان کی ساری زندگی افسانوی ادب کی خدمت میں گزری۔ انھوں نے کئی کامیاب ناول اور متعدد شاہکار افسانے لکھ کر اردو ادب کے سرمایہ میں بیش قیمت اضافہ کیا ہے۔ البتہ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ موضوعات کے اعتبار سے عصمت کا دائرہ کار بہت وسیع نہیں تھا۔ محدود کینوس کے باوجود عصمت نے اپنے ناولوں میں فن کے کمال کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہ باتیں جعفرآباد کے پاکیزہ بارات گھر میں ’عصمت چغتائی کے افسانے آج کے تناظر میں‘ کے تحت منعقدہ سیمینار میں مقالہ نگاروں نے کہیں۔

اس سیمینار کا اہتمام موج پور کے وجے محلّہ کی تنظیم ’باغ ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان‘ کے مشترکہ تعاون سے کیا گیا جس کے کنوینر سید ریاض الحسن تھے۔ اس موقعے پر شیخ عقیل احمد، محمد معروف، محمد سلیم دہلوی، م ق نیر، اعجاز انصاری، ڈاکٹر شائستہ، ڈاکٹر اعجاز الحسن، ڈاکٹر نسرین، ڈاکٹر ذاکر حسین اور ڈاکٹر عظمیٰ زہرا نے اظہار خیال کیا۔

آخر میں اس پروگرام کے کنوینر و سوسائٹی کے صدر سید ریاض الحسن نے سوسائٹی کے اغراض و مقاصد بیان کیے اور تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ ’راشٹریہ سہارا‘ دہلی، 25 دسمبر 2016

ملک کی آزادی میں شعرا کا کردار

نئی دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ثقافتی وادبی تنظیم حسن آرا ٹرسٹ کی جانب سے ملک کی آزادی میں شعرا کا کردار عنوان سے ایک سیمینار کا انعقاد قومی کونسل برائے فروغ زبان کے اشتراک سے کیا جس میں نامور علمی ادبی شخصیات نے حصہ لیا اور عنوان مذکورہ پر تحقیقی مقالات پیش کیے۔ مولانا آزاد یونیورسٹی جودھ پور کے وائس چانسلر پروفیسر اختر الواسع کی صدارت میں منعقد ہوئے اس سیمینار میں مہمان خصوصی کے طور پر عالمی شہرت یافتہ دانشور ڈاکٹر تقی عابدی کنیڈا نے بطور مہمان خصوصی حصہ لیا۔ افتتاحی جلسے میں پروفیسر عراق رضا زیدی نے حصول آزادی میں شعرا اردو کا حصہ عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو ادب میں ایسے ادیبوں اور شاعروں کی کمی نہیں ہے جنھوں نے قوموں کی تقدیریں بدلنے مجاہدین آزادی میں انقلاب پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ شاہ فیصل یونیورسٹی سعودی عرب میں درس تدریس سے وابستہ پروفیسر علی الحسن رضوی نے شعرا اردو کی ضبط شدہ نظموں پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے اپنی تحقیق میں ان شعرا کرام کا کلام پیش کیا جن کی وطن پرست شاعری کو انگریزی حکومت نے ضبط کر لیا تھا۔ مولانا آزاد یونیورسٹی حیدرآباد کی سابق چانسلر ڈاکٹر سیدہ سیدین نے عصر حاضر میں اس طرح کی تقریبات کے انعقاد کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین وممتاز شاعر ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے عنوان مذکورہ کے تحت تقریر کرتے ہوئے کہا کہ عالمی تاریخ کا اگر جائزہ لیا جائے تو ہمیں دیکھنے کو ملے گا کہ دنیا کے اہم انقلابات میں ادب نے اپنا اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کے علاوہ دہلی یونیورسٹی کے شعبہ فارسی سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر حسن اختر، آئی سی سی آر کی ڈائرکٹر پروگرام محترمہ افشاں انجم، ڈاکٹر محمد احمد برنی نے بھی مقالات پیش کیے۔ حسن آرا ٹرسٹ کی کتاب ’جنگ آزادی میں شعرا کا حصہ‘ کی رونمائی کی گئی۔ مہمان خصوصی پروفیسر تقی عابدی نے 45 منٹ پر مشتمل اپنا خصوصی خطبہ آزادی پر پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ برصغیر کی آزادی میں سب سے زیادہ اشعار اردو شاعروں نے رقم کیے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ زمانہ قدیم میں یہ اشعار حکمرانوں کے جبر وتشدد سے شائع نہ ہو سکے۔ یہ سچ ہے کہ ایسے درجنوں گوہر آبدار کتابوں کے اندر دبے پڑے ہیں جن کو نکال کر آزادی کی مالا میں پرویا جاسکتا ہے۔

نظامت کے فرائض ڈاکٹر حسن اختر وسلیم امروہی نے مشترکہ طور پر انجام دیے، مہمانان کا خیر مقدم حسن آرا ٹرسٹ کے پیٹرن ڈاکٹر محسن ولی و جنرل سکریٹری حیدر کمال نے کیا۔

روزنامہ ’صحافت‘ دہلی، 28 دسمبر 2016

پریم چند کی افسانوی عظمت

بارہ بنکی: گاؤں کی سوندھی مٹی کی خوشبو کے مابین در آئی سماجی برائیوں کو لفظوں کا جامہ پہنا کر سماج اور انسانیت سے جھنجھوڑتے ہوئے سوال کرنے والے مصنف پریم چند انسانیت کے عظیم ترجمان تھے۔ ان کی دھاردار تحریریں آج بھی سماج کو مضبوط پیغام دیتی ہیں۔ ان خیالات کا اظہار پریم چند کی افسانوی عظمت کے موضوع پر منعقد سمینار میں کیا گیا۔ یہ سمینار رابطہ سیوا سنستھان کے زیر اہتمام این سی پی یو ایل کے اشتراک سے عمل میں آیا۔ دارالمصنفین شبلی اکادمی اعظم گڑھ کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر مولانا عمیر الصدیق نے اس موقعے پر کہا کہ پریم چند کے زیادہ تر ناولوں اور افسانوں میں محنت کش اور پسماندہ طبقات کی دشواریوں کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر صغیر افراہیم نے اپنے مقالے میں کہا کہ پریم چند نے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی۔ ظالم کسی بھی شکل میں کسی بھی طبقے میں ہو، پریم چند

نے اسے کٹہرے میں کھڑا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں برتی۔ جواہر لعل نہرو پی جی کالج کے صدر شعبۂ ہندی ڈاکٹر راجیش مل نے اس موقعے پر کہا کہ پریم چند عظیم انسانیت کے علم بردار تھے۔ وہ ایسے افسانہ نگار ہیں جو ہر گھر اور ہر دل کی دھڑکن سنتے ہیں اور اسے تحریری شکل میں ہمارے سامنے پیش کرکے ہمیں نئی طاقت اور توانائی دیتے ہیں۔ جواہر لعل نہرو ڈگری کالج کے سابق صدر شعبہ اردو ڈاکٹر احسن بیگ نے اس موقعے پر کہا کہ پریم چند نے دبے کچلے لوگوں کے درد کو محسوس کرنے والے ذہن کے ساتھ ادبی میدان میں قدم رکھا۔ ان کی وجہ سے اردو افسانہ پہلی بار لہلہاتے کھیت اور جھونپڑیوں تک پہنچا، جہاں سے ہمارا معاشرہ جنم لیتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ پریم چند نے اپنے افسانوں میں کسی نہ کسی نفسیاتی حقائق کو موضوع بحث بنایا ہے جس میں زندگی کی ہنستی، بولتی اور بلبلاتی تصاویر نظر آتی ہیں۔ پٹیل میہلا پی جی کالج کی صدر شعبہ اردو ڈاکٹر صفت الزہرہ زیدی نے پریم چند کی تخلیقات میں نسوانی کردار کے موضوع پر تحریر کردہ اپنے مقالے میں کہا کہ پریم چند کو ناول نگاری میں وہی درجہ اور اعتبار حاصل ہے جو شاعری میں میر تقی میر کو حاصل ہے۔ پریم چند نے اپنے ادب میں خواتین کے کردار کو ترجیح دی۔ انھوں نے کہا کہ پریم چند نے اپنی تخلیقات میں بیواؤں کے سانحے کو انتہائی موثر طریقے سے بیان کیا۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 31 دسمبر 2016

اردو ادب میں غیر کا تصور

نئی دهلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام غالب آڈیٹوریم میں بین الاقوامی غالب سمینار کا افتتاح ہوا۔

اس موقعے پر سالانہ غالب انعامات 2016 بھی تقسیم کیے گئے۔ ملک کے سابق چیف الیکشن کمشنر ایس وائی قریشی کے ہاتھوں ایوارڈ تقسیم کیے گئے۔ پروفیسر علی احمد فاطمی کو فخرالدین علی احمد غالب انعام برائے اردو تحقیق وتنقید، پروفیسر عبدالقادر جعفری کو فخرالدین علی احمد غالب انعام برائے فارسی تحقیق وتنقید، محترمہ ذکیہ مشہدی کو غالب انعام برائے اردو نثر، مرحوم بیکل اتساہی کو غالب انعام برائے اردو شاعری، جاوید دانش کو ہم سب غالب انعام برائے اردو ڈرامہ اور سنجیو صراف کو مجموعی ادبی خدمات کے لیے غالب انعام پیش کیا گیا۔ اس موقعے پر سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے ملک کے سابق چیف الیکشن کمشنر ایس وائی قریشی نے کہا کہ مجھے بہت خوشی ہے کہ مجھے ایوارڈ دینے کا شرف حاصل ہوا۔ تمام ایوارڈ یافتگان کو 75 ہزار روپے اور ٹرافی پیش کی گئی۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، سکریٹری، غالب انسٹی ٹیوٹ نے اپنی استقبالیہ تقریر میں کہا کہ یہ سالانہ سمینار ہمارے لیے بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اپنے کلیدی خطاب میں معروف ناقد ودانشور پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ ادب اور تاریخ کا ہر پس منظر ایک مخصوص دائرہ رکھتا ہے۔ غالب نے اپنے وجود سے خود کو الگ کرکے خود کو غیر کے طور پر دیکھنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ عشقیہ شاعری میں فیض کے علاوہ سب نے غیر کو رقیب کا نام دیا ہے۔ فیض نے اس رقیب کو اپنے گلے لگالیا ہے۔ اقبال نے اس سلسلے میں خود کو الگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنی صدارتی تقریر میں جسٹس آفتاب عالم نے کہا کہ اپنے زمانے میں یقیناً غالب عندلیب گلشن ناآفریدہ تھے۔ غالب کے یہاں آنے والے زمانے کے افکار پائے جاتے تھے اور غالب کی تشکیل پوری طرح ہندوستان میں ہوئی تھی۔ افتتاحی اجلاس کی نظامت کرتے ہوئے ڈاکٹر سید رضا حیدر نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سال بھر کے تمام پروگراموں کی تفصیلات پیش کی۔

بین الاقوامی سمینار بعنوان 'اردو ادب میں غیر کا تصور' کے دوسرے روز کے آخری اجلاس میں اپنی صدارتی تقریر میں معروف ادیب ودانش ور پروفیسر ہربنس مکھیا نے کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ غالب انسٹی ٹیوٹ نے نئی کھڑکیاں کھولی ہیں، جس کی وجہ سے ہمارے اذہان بھی وا ہوئے ہیں۔ آئندہ بھی اس طرح کے چیلنجنگ موضوعات پر سمینار ہونے چاہئیں۔

اس اجلاس میں مشرف عالم ذوقی، ڈاکٹر ابوبکر عباد اور پروفیسر علی احمد فاطمی نے مقالے پڑھے۔ سمینار کے دوسرے روز کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے ممتاز ادیب وناقد پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ اس موضوع کے بہانے زندگی، کائنات اور تمام تر حالات پر نظر ڈالنے کا موقع ملا ہے۔ ادب کا مقصود اصلی محض حظ کا حصول نہیں ہے۔ اس اجلاس میں پروفیسر انیس اشفاق، محترمہ ذکیہ مشہدی، ڈاکٹر خالد جاوید اور ڈاکٹر نجمہ رحمانی نے اپنے مقالے پیش کیے۔ سمینار کے دوسرے روز کے پہلے اجلاس میں صدارتی گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب نے کہا کہ اس اجلاس کے تمام مقالات دوبارہ بغور پڑھے جانے کے لائق ہیں۔ اس اجلاس میں پروفیسر قاضی جمال حسین، دیپک بدکی اور ڈاکٹر رانیہ محمد فوزی نے مقالے پیش کیے۔ سمینار کے دوسرے روز معروف مزاحیہ شاعر پاپولر میرٹھی کی کتاب بوم میرٹھی اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے ریسرچ ایسوسی ایٹ ڈاکٹر سہیل انور کے مضامین کا مجموعہ افکار ونظریات کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ سہ روزہ سمینار کے دوسرے روز شام کو ایک عالمی مشاعرے کا انعقاد بھی کیا گیا، جس کی صدارت معروف شاعر گلزار دہلوی نے کی۔

سمینار کے آخری اجلاس میں بطور مہمان خصوصی جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے سابق پروفیسر پرشوتم اگروال نے کہا کہ ہم نے یہاں غیر کے تصور پر معلوماتی اور فلسفیانہ مقالات سنے اور ان مقالات کو سن کر ہم نے اپنی الجھنیں اور پریشانیاں دور کیں۔ معاصر زمانے کی بدعنوانیوں اور سیاست کو ادب نے بہت پہلے درج دفتر کردیا ہے۔ پریم چند کے بعد ہندی ادب میں مسلم کردار تلاش کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے مگر اردو کی صورت حال ایسی نہیں ہے۔ زبان کا وجود ہی غیر کے وجود کا اثبات ہے۔ ترجمے عالمی انسانیت کے عکاس ہیں۔ ہر غیر میں اپنا کچھ ہوتا ہے یا اپنے جیسا کچھ ہوتا ہے۔ چھٹے اجلاس کی صدارت پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کی اور اس سیشن میں ڈاکٹر خالد قادری، ڈاکٹر یوسف عامر اور ڈاکٹر سرورالہدیٰ نے مقالات پیش کیے۔ پانچویں سیشن کی صدارت کرتے ہوئے ہندی کے معروف ادیب پروفیسر اپوروانند نے کہا کہ غیر کا تصور اس زمانے میں کچھ زیادہ ہی اپنے بال و پر بکھیر رہا ہے، اب یہ دیکھیں کہ میں خود آپ سب کے لیے غیر ہوں، ایسا بالکل نہیں ہے کہ غیر کا تصور کوئی نیا تصور ہے۔ زمانہ قدیم سے ہی یہ تصور ہمارے سماج میں پایا جاتا ہے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر قاضی افضال حسین نے اپنے مقالات پیش کیے۔

'اردو ادب میں قومی یکجہتی کی روایت' کے موضوع پر منعقدہ سیمینار کا منظر

معروف ناقد و فکشن نگار پروفیسر انیس اشفاق نے کہا کہ غیر کے تصور کے اتنے اطراف و جوانب ہیں، جن کا احاطہ ایک سیمینار کے ذریعہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس سیشن میں ڈاکٹر درگا پرشاد گپت نے معاصر دنیا کو پیش نظر رکھ کر غیر کے تصور کو پیش کیا۔ پروفیسر شافع قدوائی نے اردو اور دیگر زبانوں میں پائے جانے والے غیر کے تصور کا جائزہ لیا۔ کناڈا سے آئے جاوید دانش نے ڈراموں میں پائے جانے والے غیر کے تصور پر اپنے ڈراموں کے خصوصی حوالے سے گفتگو کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 24 تا 26 دسمبر 2016

اردو ادب میں قومی یکجہتی کی روایت

بجنور: بجنور کی معروف ادبی علمی وفلاحی انجمن خلیل میموریل سوسائٹی (رجسٹرڈ) کی جانب سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے مقامی ڈی ڈی پی ایس کالج میں اردو ادب میں قومی یکجہتی کی روایت کے موضوع پر ایک روزہ قومی سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں بجنور کی ایم ایل اے محترمہ کنور رانی روچی ویرا مہمان خصوصی اور بجنور کے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج نسیم احمد مہمان اعزازی کے طور پر تشریف لائے۔ سیمینار کی افتتاحی تقریب کی صدارت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے استاد پروفیسر صغیر افراہیم نے کی۔ سوسائٹی کی سکریٹری ڈاکٹر فرزانہ خلیل نے سیمینار کے عنوان کی مفصل وضاحت کرتے ہوئے سوسائٹی کے اغراض و مقاصد بھی بیان کیے انھوں نے سوسائٹی کی جانب سے تمام مہمانان گرامی اور حاضرین کو خوش آمدید کہا۔ سیمینار کا کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے پنجاب اردو اکادمی کے سابق سکریٹری پروفیسر محمد اقبال نے کہا کہ اردو کا خمیر صوفیائے کرام کی خانقاہوں میں تیار ہوا ہے۔ اردو زبان میں مختلف زبانوں کا شامل ہونا اس کی رواداری اور وسیع الظرفی کا ثبوت ہے۔ پروفیسر محمد اقبال نے کہا کہ ملک میں اردو زبان کا فروغ دراصل قومی یکجہتی اور جمہوری اقدار کا فروغ ہے۔ پروفیسر صغیر افراہیم نے اپنے منفرد انداز میں اردو زبان اور قومی یکجہتی کے حوالے سے گفتگو کی۔ تقریب میں سینئر صحافی اسد رضا نے مختلف شعری حوالوں سے اردو ادب میں اخوت و یکجہتی پر مشتمل گراں قدر ادبی سرمایے سے سامعین کو واقف کرایا۔ نظامت جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی سے وابستہ ڈاکٹر شکیل اختر نے کی۔ تحقیقی مقالے پیش کرنے والوں میں شیخ نگینوی، ڈاکٹر رباب انجم، ڈاکٹر سیدہ سبطین زہرہ نقوی، ڈاکٹر ثمینہ بی، امیر نہٹوری، زاہد حسن، محترمہ عمرانہ خاتون، ڈاکٹر فرزانہ خلیل قابل ذکر ہیں۔ شکیل بجنوری نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے اسے ایک تاریخی سیمینار قرار دیا۔ سوسائٹی کی صدر محترمہ ریحانہ فاطمہ نے تقریب کے آخر میں تمام شرکا اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 20 دسمبر 2016

قومی یکجہتی اور غیر مسلم شعرا

امروہہ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور آزاد ایجوکیشنل ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام قومی سیمینار قومی یکجہتی

اور غیر مسلم شعرا کرام کے حوالے سے ہاشمی گرلس ڈگری کالج میں منعقد کیا گیا۔ سیمینار میں ترنم پروین سابق صدر اترپردیش اردو اکادمی نے اپنے مقالے میں کہا کہ قومی یکجہتی اور غیر مسلم شعراء کرام ایک ایسا موضوع ہے جس پر جتنا بھی بولا جائے اور لکھا جائے وہ کم ہے۔ آج وقت کی ضرورت ہے کہ ہم قومی یکجہتی کو برقرار رکھیں۔ اردو کو کسی ایک مذہب یا کسی ایک فرقے سے نہیں جوڑا جائے۔ ڈاکٹر شیخ نگینوی نے اردو کے شاعروں برج لال آسامی، چند بھون، برج نارائن، فراق گورکھپوری، ہریش چندر اختر وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان شاعروں نے اردو کی بہت حفاظت کی ہے جن کا نام زندہ رہے گا، لیکن آج بھی موجودہ دور میں غیر مسلم شعراء کرام بڑی تعداد میں سامنے آرہے ہیں۔ مہمان خصوصی حکیم سراج الدین ہاشمی نے کہا کہ ہمیں خوشی ہورہی ہے کہ آج کے اس وقت میں ایسے موضوع پر سیمینار کرنے کا ہمیں موقع ملا ہے جو وقت کی ضرورت بھی ہے اور حالات کا تقاضہ بھی ہے۔ صدارت ترنم عقیل نے کی اور نظامت کے فرائض شیبان قادری نے انجام دیے۔ آزاد ایجوکیشنل ویلفیئر سوسائٹی کے صدر ترنم زاہد نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 18 دسمبر 2016

مرزا ہادی رسوا حیات اور خدمات

مراد آباد: گورنمنٹ خورشید گرلس انٹر کالج میں منعقدہ نہرو یووا کیندر ہاتھی پور چتو مراد آباد کے زیر اہتمام بہ اشتراک قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے یک روزہ سیمینار بعنوان مرزا ہادی رسوا حیات اور خدمات منعقد کیا گیا۔ سیمینار کی نظامت ڈاکٹر رباب انجم اور فائزہ زبیر نے مشترکہ طور پر کی۔ سیمینار میں مقررین نے مرزا ہادی رسوا کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے مقالات پیش کیے۔ مہمان خصوصی ممتاز عرشی نے کہا کہ ان کی جیسی لکھی گئی تصانیف کسی دیگر شاعر نے نہیں لکھی ہیں وہ ایک بے مثال شاعر و مصنف تھے۔ جواہر لعل نہرو، پی جی کالج بارہ بنکی کے پروفیسر سید سعید احمد نے کہا کہ مرزا ہادی رسوا ایک مصنف ہی نہیں بلکہ ایک بڑے سائنس داں بھی تھے۔ ایم ایچ ڈگری کالج مراد آباد کے پروفیسر شریف احمد قریشی وصولت لائبریری رامپور کے چیئرمین سین شین عالم نے کہا کہ مرزا ہادی رسوا کے ذریعے لکھا گیا امراؤ جان اردو کا پہلا اور مکمل ناول ہے۔ آج کے دور میں جو کمپیوٹر کا اردو کی بورڈ ہے وہ مرزا ہادی رسوا کی دین ہے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر مصباح الدین، ڈاکٹر انور وارثی، ڈاکٹر اطہر مسعود خاں، ڈاکٹر شاذیہ، ڈاکٹر غزالہ سعید وغیرہ نے مقالات پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 دسمبر 2016

اردو ادب کے فروغ میں علما کا کردار

نجیب آباد: ایم اے میموریل پبلک سوسائٹی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے 'اردو ادب میں علما کا کردار' کے موضوع پر ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس کو خطاب کرتے ہوئے مقررین نے اپنے خطاب میں اردو ادب میں علما کے کردار پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ بغیر علما کے اردو ادب کی تاریخ

مکمل نہیں کہی جاسکتی۔ اردو کی ترویج واشاعت میں علما کی قربانیوں کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ کانپا بینکوئٹ ہال میں منعقدہ سیمینار کو خطاب کرتے ہوئے انجینئر سمیع الدین (علی گڑھ) نے کہا کہ اردو ادب میں علماء دین کے کردار پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان کی تشکیل وترتیب میں علمائے دین کا مقام ریڑھ کی ہڈی جیسا ہے۔ انھوں نے کہا کہ بغیر علمائے کرام کے اردو ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ انھوں نے کہا مولوی چراغ علی، مولوی ذکاءاللہ، علامہ شبلی نعمانی، مولانا حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی، مولوی محمد علی جوہر، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا سید سلیمان ندوی، علامہ تاجور نجیب آبادی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا مناظر حسن گیلانی، سید ابوالحسن ندوی، وغیرہ ایسے روشن چراغ رہے ہیں جنھوں نے قابل فخر تصانیف وتالیف زبان اردو میں پیش کرکے مذہب کے ساتھ ساتھ زبان کو بھی فروغ دیا ہے۔ سیمینار کو خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر شیخ نگینوی نے کہا کہ اردو ادب میں نثر نگاری ہو، نظم ہو، یا شعر گوئی ہو، ناول نگاری رہی ہو، یا انشاپردازی، صحافت ہو یا افسانہ نگاری، سب ہی اصناف میں علما نے طبع آزمائی کی اور اردو ادب کو بام عروج پر پہنچایا۔ انجینئر سمیع الدین کی صدارت اور مولانا سلیم احمد کی نظامت میں منعقدہ سیمینار میں مہمان خصوصی راؤ شیر محمد چیئرمین حج کمیٹی اتراکھنڈ انجینئر شمیم احمد تھے۔ محمد اجمل نے سبھی کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ ’راشٹریہ سہارا‘ دہلی، 26 دسمبر 2016

اردو کے فروغ میں مدارس اسلامیہ کا کردار

آگرہ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے ایک روزہ سیمینار اردو کے فروغ میں مدارس اسلامیہ کا کردار کے عنوان پر مدرسہ معین الاسلام شاہ گنج میں منعقد ہوا جس کی صدارت مولانا قاری محمد نعیم قاسمی ناظم مدرسہ انوارالقرآن آگرہ نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ وطن عزیز ہندوستان میں مدارس اسلامیہ کا اردو کے فروغ میں جو کردار رہا ہے وہ قابل تحسین ہے مدارس اسلامیہ کی بنیاد ہی اردو پر قائم ہے اور مدارس نے اردو کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ سیمینار کے مہمان خصوصی آل انڈیا دینی مدارس بورڈ کے قومی صدر مولانا محمد یعقوب بلند شہری نے کہا کہ برصغیر کے مدارس میں اردو بنیادی زبان ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان زندہ جاوید، دلکش وشیریں، اتحاد پسندی اور رواداری سے بھرپور ایک اہم زبان ہے۔

پروگرام کے مہمان ذی وقار مولانا عقیل احمد نائب صدر جمعیۃ علما آگرہ نے کہا کہ اردو زبان ہندوستان کے مدارس اسلامیہ کی ہی پیداوار ہے۔ یہ زبان مدارس اسلامیہ میں ہی پلی بڑھی اور جوان ہوئی ہے جس کی وجہ سے وطن عزیز ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے اکثر وبیشتر ممالک میں بھی اس نے اپنی پہچان بنائی ہے۔ سیمینار میں قاری سعید الظفر، ماسٹر نعیم اختر، مولانا ضیاء الحق مظاہری، مولانا مسعود الظفر، قاری ضیاء الرحمٰن ربانی اور ماسٹر محمد شعیب خان نے اپنے پر مغز مقالے پیش کیے۔ نظامت کے فرائض ایم یو خان نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ سیمینار میں بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔

روزنامہ ’راشٹریہ سہارا‘ دہلی، 20 دسمبر 2016

اردو کا حکائی ادب

میل وشارم: سی عبدالحکیم کالج، میل وشارم، تمل ناڈو میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی

تعاون سے دو روزہ بین الاقوامی سیمینار بعنوان: ’اردو کا حکائی ادب - ایک تجزیاتی مطالعہ‘ 19 اور 20 دسمبر 2016 کو منعقد ہوا۔ سیمینار میں اردو کے حکائی ادب کے مختلف پہلوؤں پر تقریباً چالیس مقالات پیش کیے گئے۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت جناب الحاج ایس ضیاء الدین احمد، جنرل سکریٹری، میل وشارم مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی نے فرمائی۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ایس اے ساجد نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا اور سیمینار کے ڈائرکٹر قاضی حبیب احمد نے مہمانان گرامی کا تعارف پیش کیا۔ پروفیسر م ن سعید، سابق صدر شعبۂ اردو، بنگلور یونیورسٹی اور سابق چیرمین، کرناٹک اسٹیٹ اردو اکادمی نے کلیدی خطبہ پیش کیا جس میں موضوع کا بھرپور احاطہ کیا گیا۔ اس اجلاس سے خصوصی خطاب کرتے ہوئے ممتاز ادیب ونقاد پروفیسر ظفر احمد صدیقی، پروفیسر شعبۂ اردو، علی گڈھ مسلم یونیورسٹی نے کہا کہ اس عنوان پر اردو ادب کی پوری تاریخ میں کوئی سیمینار کہیں بھی منعقد نہیں ہوا۔ چونکہ یہ عنوان ادب کا ایک گنجلک اور پیچیدہ عنوان رہا ہے جس پر بحث ومباحثہ کی گنجائش ہے۔ پروفیسر سید سجاد حسین، مدراس یونیورسٹی نے بھی افتتاحی اجلاس سے خطاب کیا۔ پانچوں نشستوں کے منجملہ صدور میں پروفیسر شہپر رسول، پروفیسر سید سجاد حسین، علامہ اعجاز فرخ، پروفیسر م ن سعید، پرفیسر ظفر احمد صدیقی، پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی، پروفیسر قاسم علی خان، ڈاکٹر سید فضل اللہ مکرم کے نام قابل ذکر ہیں۔

پانچوں نشستوں میں جن جن مقالہ نگاروں نے اپنے مقالے پیش کیے ان میں قابل ذکر نام یہ ہیں: پروفیسر ظفر احمد صدیقی، ڈاکٹر راہی فدائی، ڈاکٹر ہمایوں اشرف، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، ڈاکٹر محمد امین اللہ، ڈاکٹر امان اللہ، پروفیسر شہپر رسول، علیم صبا نویدی، ڈاکٹر گل رعنا، محمد تقی اللہ خان، ڈاکٹر فہیم الدین احمد، ڈاکٹر رئیس فاطمہ، محترمہ مسعودہ تسکین، ڈاکٹر محمد نثار احمد، ڈاکٹر شیخ عبدالغنی، ڈاکٹر شیخ فاروق باشا عمری، ڈاکٹر محامد ہلال اعظمی، ڈاکٹر حامد مہتاب، ڈاکٹر محمد نشاط عمری، ڈاکٹر عطاء اللہ خان سنجری، ڈاکٹر کلیم اللہ، ڈاکٹر ایم سعید الدین، ڈاکٹر طیب خرادی، ڈاکٹر عبدالقوی، ڈاکٹر سلطان معین الدین حسینی، ابوبکر ابراہیم فارس عمری، محترمہ تزئین جمال ومحترمہ انیسہ بیگم، علامہ اعجاز فرخ، پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی، ڈاکٹر وصی اللہ بختیاری، ڈاکٹر زبیر شاداب خان، ڈاکٹر منظور دکنی۔

اختتامی اجلاس کی صدارت ساہوکار نثار احمد نے کی۔ ڈاکٹر وصی اللہ بختیاری نے اجلاس کی کارروائی چلائی۔ کنوینر سیمینار ڈاکٹر محمد یاسر کے ہدیۂ تشکر اور قومی ترانہ کے ساتھ یہ دوروزہ سیمینار نہایت کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر یاسر، میل وشارم، تمل ناڈو، 5 جنوری 2017

اردو اور تعلیم سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی :

دی پیپلز پریسیڈنٹ

نئی دھلی: نائب صدر جمہوریہ حامد انصاری کی رہائش گاہ پر منعقدہ ایک پروقار تقریب میں انڈین انفارمیشن سروسز میں

مختلف عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں اور فی الوقت رجسٹرار آف نیوز پیپر آف انڈیا کی سربراہی کرنے والے افسر ایس ایم خان کی تحریر کردہ کتاب 'دی پیپلز پریسیڈنٹ' کی رسم اجرا نائب صدر جمہوریہ حامد انصاری اور وزیر خزانہ ارون جیٹلی کے ہاتھوں انجام دی گئی۔ واضح ہو کہ ایس ایم خان نے سابق صدر جمہوریہ ابوالفاخر زین العابدین عبدالکلام کے ساتھ پریس سکریٹری کی حیثیت سے پانچ سال تک کام کیا تھا اور اس دوران انھوں نے سابق صدر جمہوریہ کی کرشماتی شخصیت کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو قلم بند کیا۔ اس کتاب میں مرحوم صدر جمہوریہ کی شخصیت کے بہت سے ان دیکھے پہلو سامنے آئے ہیں۔ کتاب میں تحریر کیا گیا ہے کہ مرحوم عبدالکلام صوم وصلوٰۃ کے پابند ہونے کے ساتھ ساتھ تلاوت کلام مجید پابندی سے کرتے تھے۔ اس کتاب میں مرحوم صدر کا وہ واقعہ بھی لکھا ہے جب انھوں نے روزہ افطار کرنے کے لیے بڑے بڑے لوگوں کو مدعو کرنے کے بجائے دریا گنج میں واقع بچوں کا گھر نام کے یتیم خانے میں مقیم بچوں کو اپنے ساتھ افطار کے لیے بلایا۔ ایس ایم خان نے یہ بھی لکھا ہے کہ راشٹرپتی بھون میں پہلی بار مسابقہ قرآن مرحوم کلام صاحب کے زمانے میں ہی ہوا۔ اس کتاب میں کلام صاحب کی سائنس کے میدان میں جو خدمات ہیں ان کو سراہنے کے ساتھ ساتھ ان کی سیاسی بصیرت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب میں ان کی سادگی، ان کی شرافت، عوام کے ساتھ ان کی وابستگی اور ایمانداری کے کئی واقعات درج ہیں۔ کتاب کا اجرا کرتے ہوئے نائب صدر جمہوریہ حامد انصاری نے کتاب میں تحریر کیے گئے کچھ دلچسپ واقعات کا ذکر کیا اور سابق صدر کی زندگی کی مختلف مصروفیات اور ان کی ہمہ جہت شخصیت کے کئی اہم پہلو عوام کے سامنے پیش کرنے کے لیے ایس ایم خان کو مبارکباد دی۔ کتاب کی رسم رونمائی میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کرتے ہوئے وزیر خزانہ ارون جیٹلی نے مرحوم عبدالکلام کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالکلام کی بے پناہ علمی صلاحیتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی سادگی سے بھرپور زندگی کا ذکر بھی کیا۔ اس موقعے پر مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کتاب کے مصنف ایس ایم خان نے اپنے خیالات پیش کیے۔ رسم اجرا کے موقعے پر کئی اہم سیاست داں، مشہور سماجی شخصیات اور سرکردہ صحافی حضرات بڑی تعداد میں موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 جنوری 2017

دھلی :

موجودہ قومی بحران اور ہماری ذمے داریاں

نئی دھلی: بستی حضرت نظام الدین میں واقع غالب اکادمی میں معروف صحافی محفوظ الرحمٰن (مرحوم) کی یاد میں 12 واں محفوظ الرحمٰن یادگاری لیکچر کا انعقاد ہوا جس کا موضوع موجودہ قومی بحران اور ہماری ذمے داریاں تھا جس میں مقررین نے ملکی وملی مسائل پر سنجیدگی کے ساتھ گفتگو کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کرتے ہوئے پروفیسر منیر عالم نے قومی و بین الاقوامی ملی مسائل کے تناظر میں پرمغز خطاب کیا۔ انھوں نے دوٹوک کہا کہ ہندوستان مزید ٹیکنالوجی آنے سے بیروزگاری کی طرف گامزن ہے، نوکریاں اور روزگار کے مواقع کم ہوتے جارہے ہیں۔ انھوں نے مسلمانوں کے مختلف مسائل کے حوالے سے کہا کہ تعلیم اور بہتر کونسلنگ نہ ہونے کے سبب مسلمان پسماندگی کا شکار ہیں۔ صدارت کرتے ہوئے پروفیسر خالد محمود نے مسلمانوں کو تعلیمی سرگرمی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کو اجتماعی عمل میں خاص طور سے بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ اردو ہماری مادری زبان ہے اس کے تحفظ کے لیے بھی تدابیر یں اور تحریکیں چلانے کی سخت ضرورت ہے۔ محفوظ الرحمٰن میموریل سوسائٹی کی جانب سے منعقدہ پروگرام کی نظامت کے فرائض سہیل انجم نے انجام دیے جبکہ اظہار تشکر جلال الدین اسلم نے ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 26 دسمبر 2016

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے

نئی دھلی: اردو اکادمی کے زیر اہتمام قمر رئیس سلور جوبلی آڈیٹوریم میں توسیعی خطبہ بعنوان 'پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے' کے مہمان خصوصی کناڈا سے آئے معروف

دانشور وادیب ڈاکٹر تقی عابدی نے خصوصی خطبہ پیش کیا۔ اس خطبے کے دوران عنوان 'پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے' کے لفظ 'وہ' پر زور دیتے ہوئے اس مصرعے کو مختلف لہجوں میں پڑھ کر یہ ثابت کیا کہ ہم غالب کے نہ صرف اس مصرعے کو بلکہ مختلف اشعار کو مختلف قرأتوں سے پڑھ کر ان کے معنی کی تبدیلی کو دیکھ اور سمجھ سکتے ہیں۔ کیونکہ غالب وہ عظیم شاعر ہے جس نے اپنا پورا تعارف مصرعوں میں پیش کردیا۔ انھوں نے غالب کے نسخۂ حمیدیہ کو مشعل راہ قرار دیا اور کہا کہ اگر نسخۂ حمیدیہ کی دریافت نہ ہوتی تو شاید غالب کی شکل مختلف ہوتی۔

پروگرام کے آغاز میں وائس چیئرمین اردو اکادمی، دہلی نے اکادمی کی مطبوعات اور گلدستہ پیش کر کے مہمانوں کا استقبال کیا جبکہ ایم ایل اے حاجی اشراق کو ڈاکٹر محمد عرفان اور اہل باچینی کو مطلوب احمد نے گلدستہ پیش کر کے ان کی عزت افزائی کی۔ ڈاکٹر ماجد دیوبندی، وائس چیئرمین اردو اکادمی نے سامعین اور مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے خصوصاً ڈاکٹر تقی عابدی کو اردو زبان کے پرچم کو دنیا بھر میں بلند کرنے والا محقق قرار دیا۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 دسمبر 2016

اتر پردیش:

گورکھپور میں بین الاقوامی سمینار

گورکھپور: الہ آباد ہائی کورٹ کے ریٹائرڈ جج جسٹس کلیم اللہ خان نے دھنپت رائے سریواستو عرف منشی پریم چند کی تخلیقات کو عوامی زندگی کا آئینہ بتاتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اپنی تحریروں میں جہاں عام آدمی کے دکھ درد اور ان کے مسائل کو پرزور انداز میں منظر عام پر رکھا ہے، وہیں سوراج کے اصل تصور کو پیش کر کے ذہنوں کو آزاد کرنے پر بھی زور دیا ہے۔ ہندوستان کی ترقی کے لیے اتحاد و سالمیت کو اشد ضروری قرار دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ منشی جی اسی تصور کو لے کر آگے بڑھے تھے۔ وہ سینٹ اینڈ ریوز کالج کے اسمبلی ہال میں گورکھپور کی جانب انفارمیشن اینڈ ٹریننگ سینٹر اور شعبہ اردو سینٹ اینڈ ریوز کالج کے اشتراک سے منشی پریم چند صدی تقریبات کے سلسلے میں منعقدہ ایک بین الاقوامی سمینار میں صدارتی خطبہ پیش کر رہے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ منشی پریم چند کی تخلیقات 'ورلڈ لٹریچر' ہیں جس کو کسی ایک زبان یا کلاس میں تقسیم کرنا درست نہیں ہے۔ نیپال کے خدیجۃ الکبریٰ گرلس اسکول کے ڈائرکٹر مولانا زاہد آزاد نے کہا کہ پریم چند کی شخصیت اردو دنیا کے لیے ناقابل فراموش ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے طوفان کو حقیقت پسندی سے دیکھا اور زندگی کی تحریروں کو اپنے تجربوں سے آشنا کیا اور اسے افسانوں کا حصہ بنایا، وہ واحد ایسے ادیب ہیں، جنھوں نے عام آدمی کے درد کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ اپنی کہانیوں کے ذریعے اس کا حل بھی پیش کیا۔ کویت کے ڈاکٹر سعید روشن نے پریم چند کے پندرہ ناولوں کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا کہ انسانیت کو بیدار کرنا اور اعلیٰ خیال کو پیدا کرنا ان کا مقصد تھا۔ نیپال اردو اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر ثاقب ہارونی نے کہا کہ منشی پریم چند اور فراق گورکھپوری نے اپنی تخلیقات سے گورکھپور کی تاریخ میں چار چاند لگائے ہیں۔ ڈی ڈی یو یونیورسٹی کے شعبہ ہندی کے پروفیسر انل رائے نے کہا کہ ہمارے ملک کی قوم پرستی روٹی اور بھوک پر مبنی ہوگی نہ کہ مذہب اور فرقہ واریت پر، کیونکہ ابھی تک کوئی ایسا انسان نہیں بنا ہے، جو روٹی کے بغیر زندہ رہ سکے۔ سینئر معالج اور پروگرام کے کنوینر ڈاکٹر عزیز احمد نے اس سے قبل تمام مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ گورکھپور وہ سرزمین ہے، جہاں فراق، مجنوں، پریم چند، ریاض خیر آبادی، ملک زادہ منظور احمد، ظفر گورکھپوری اور شمس الرحمٰن فاروقی جیسے نامور شعرا و ادبا پیدا ہوئے اور پوری دنیا میں نام روشن کیا۔ نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے بین الاقوامی شاعر ڈاکٹر کلیم قیصر نے پریم چند پر سمینار کی غرض و غایت بتاتے ہوئے اس بات کا عزم کیا کہ شہر کے ادیبوں اور شاعروں پر اسی طرح پروگرام منعقد کیے جائیں گے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 دسمبر 2016

اتر پردیش کے گورنر کی کتاب چریتی، چریتی پر مذاکرہ

لکھنؤ: گورنر رام نائک نے کہا کہ اگلے وائس چانسلر سمینار میں اردو کو یونیورسٹی سطح پر معقول جگہ دلوانے کے لیے بہت سنجیدگی سے بات کی جائے گی تاکہ اردو کو فائدہ ملے، اسے روزگار سے جوڑا جا سکے۔ اسی کے ساتھ ہی میں اپنے کام کی سالانہ رپورٹ بھی اردو میں بناؤں گا۔ گورنر رام نائک لکھنؤ یونیورسٹی کے مالویہ سبھا گار میں اردو رائٹرس فورم کے ذریعے ان کی کتاب چریتی چریتی کے اردو ایڈیشن پر ہو رہی گفتگو پر خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اردو میں ایک جوش ہے اور مٹھاس ہے اس کا ایک الگ انداز ہے۔ گورنر کے ناتے ان کی کوشش ہوگی کہ اردو کو پورا حق ملے۔ ہندی کے بعد سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان اردو ہے۔ اردو کو مذہب کی قید میں رکھنا غلط ہے۔ اس موقعے پر گورنر نے اپنی کتاب چریتی چریتی کے بارے میں بھی تفصیل سے بتایا۔ سابق وزیر ڈاکٹر عمار رضوی نے کتاب چریتی چریتی پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر فضل امام نے کہا کہ رام نائک جی نے اپنے گذشتہ وقت کو بہت بیباکی سے بیان کیا۔ اس موقعے پر دانشوروں، صحافیوں اور سماج کی خدمت کرنے والوں کو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے وی سی ایس پی سنگھ اور پروفیسر شارب ردولوی نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔ اس موقعے پر نظامت ڈاکٹر عباس رضا نیر جلال پوری نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 دسمبر 2016

امیر خسرو اور گنگا جمنی تہذیب

سہارنپور: اسلامیہ ڈگری کالج سہارنپور میں اتر پردیش اردو اکادمی کے اشتراک سے سماجی تنظیم پرچم کے زیر اہتمام خسرو پر سمینار کا انعقاد کیا گیا جس کے پہلے سیشن کی صدارت کالج کے کنٹرولر پروفیسر اختر علی خاں نے اور دوسرے سیشن کی صدارت سینئر ایڈووکیٹ اور سابق ڈی جی سی انور علی نے کی اور سمینار کی نظامت کنوینر ڈاکٹر قدسیہ انجم نے کی۔ سمینار میں پروفیسر تنویر چشتی، ڈاکٹر زیبا ناز صدر شعبۂ اردو، پروفیسر ضیغم عباس زیدی، ڈاکٹر شیخ نگینوی، ڈاکٹر جمیل مانوی اور شاہد زبیری نے امیر خسرو اور گنگا جمنی تہذیب پر اپنے مقالات پیش کیے۔ پروفیسر تنویر چشتی نے کہا کہ ہندی اور اردو آج جس مقام پر ہیں اس کی بنیاد امیر خسرو نے ہندوی کے نام سے رکھ دی تھی۔ انھوں نے کہا کہ امیر خسرو نے اس

وقت کی بولیوں کو زبان کے قالب میں ڈھالا اور یہ زبانیں 800 سال کا سفر طے کر کے آج ہندی اور اردو کہلائیں۔ ڈاکٹر جمیل مانوی نے امیر خسرو اور سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا کے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اگر خسرو اپنے مرشد کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دیتے تو خسرو نہ بنتے۔ ڈاکٹر شیخ نگینوی نے خسرو کی شاعری کو ہندو مسلمانوں کے جذبات کی ترجمان بتایا اور کہا کہ ان کی شاعری میں حب الوطنی کے نغمات بھی پائے جاتے ہیں۔ دریں اثنا مقالہ نگاروں کو اسناد کے علاوہ مومنٹو دے کر اعزاز سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 12 دسمبر 2016

اترا کھنڈ:

افضل منگلوری اترا کھنڈ اردو اکادمی کے نائب صدر نامزد

سہارنپور: معروف شاعر افضل منگلوری کو اترا کھنڈ سرکار نے اردو اکادمی اترا کھنڈ کا نائب صدر نامزد کیا ہے اور وزیر مملکت کے درجہ سے سرفراز کیا ہے۔ اس اعزاز پر اردو اور ادبی حلقوں میں مسرت ظاہر کی گئی ہے۔ وزیر اعلیٰ کی سرکاری رہائش گاہ دہرہ دون پر ایک خصوصی تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر وزیر اعلیٰ نے کہا کہ اترا کھنڈ کی خوش قسمتی ہے کہ افضل یہاں کے رہنے والے ہیں اور اپنی شاعری کے حوالے سے منگلور (اترا کھنڈ) کا نام ملک اور بیرون ملک میں روشن کرتے آرہے ہیں۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ ان کی سربراہی میں اترا کھنڈ میں اردو زبان کو مزید ترقی ملے گی۔ وزیر اعلیٰ نے کہا کہ اردو کسی مذہب یا کسی فرقے کی زبان نہیں بلکہ اس نے ہندوستان میں جنم لیا اور جدوجہد آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ انھوں نے اردو اور ہندی کو دو بہنیں بتاتے ہوئے کہا کہ ان دونوں زبانوں کی ترقی و ترویج کرنا ہماری ذمے داری ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 2 جنوری 2017

بہار:

اے۔ ایم۔ یو کشن گنج سینٹر میں ایک تقریب

کشن گنج: اے ایم یو کے کشن گنج سنٹر کو جس مقام پر ہونا چاہیے اس پر وہ نہیں ہے ہمیں اس کا شدت سے احساس ہے اور ہم اس کمی کو جلد از جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔ یہ یقین دہانی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر بریگیڈیئر (سبکدوش)، سید احمد علی نے گذشتہ رات اے ایم یو کشن گنج سنٹر میں منعقدہ ایک تقریب میں کرائی۔ انھوں نے کہا کہ مسائل درپیش ہوتے ہیں اور ان کا حل بھی کیا جاتا ہے اور اے ایم یو کشن گنج سنٹر کے مسائل بھی حل ہوں گے۔ اس سنٹر کا سب سے بڑا مسئلہ فنڈ کی کمی کا ہے اور حکومت ہند نے اب تک اس سنٹر کو محض دس کروڑ روپے دیے ہیں جبکہ تقریباً 135 کروڑ روپے کا اعلان کیا گیا تھا اس کے باوجود ہم اس سنٹر کو چلا رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس فنڈ کے حصول کے لیے ہمیں کوشش کرنی ہوگی ورنہ بارہویں پلاننگ کمیشن میں مختص یہ رقم بے کار ہوجائے گی۔ مہمان خصوصی اور اقلیتی فلاح و بہبود کے وزیر پروفیسر عبدالغفور نے اے ایم یو سنٹر کے لیے لائحہ عمل تیار کرنے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اس سنٹر کے تعمیراتی کام کے سلسلے میں مخیّر حضرات کو آگے آنا چاہیے تاکہ یہ سنٹر وسائل کی کمی کی وجہ سے بے سمتی کا شکار نہ ہوجائے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ یہ سنٹر بھی آگے بڑھے گا اور ترقی کی اونچائیوں کو چھوئے گا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ بہار میں ہمیشہ بہار کی کیفیت رہی ہے اور اے ایم یو کا یہ سنٹر بھی ایک تناور درخت کی شکل اختیار کرکے صرف کشن گنج ہی نہیں بلکہ پورے ملک کو سیراب کرے گا۔ انھوں نے کہا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وقت اور حالات کے مطابق اسباب مہیا ہوجاتے ہیں۔ اے یم یو الومنائی فورم متحدہ عرب امارات کے صدر سید محمد قطب الرحمٰن نے اے ایم یو سنٹر کشن گنج کی ہر ممکن امداد کی یقین دہانی کراتے ہوئے کہا کہ اس سرزمین سے ان کی وابستگی بہت پرانی ہے اور یہاں کے لیے کچھ کرکے انھیں خوشی ہوگی۔ اے ایم یو سنٹر کشن گنج کے ڈائرکٹر ڈاکٹر راشد نہال نے اپنی رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس سنٹر میں طلبہ کو تمام سہولت دی گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت ریلیز فنڈ دس کروڑ میں سے آٹھ کروڑ 59 لاکھ روپے خرچ ہوچکے ہیں۔ بی ایڈ کی منظوری مل گئی ہے اور ایم بی اے کا دوسرا بیچ شروع ہوچکا ہے۔ فنڈ آتے ہی دیگر کورسز شروع کیے جائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ سردست اس وقت اس سنٹر میں 135 طلبا زیر تعلیم ہیں۔ کٹیہار میڈیکل کالج کے چیئرمین ڈاکٹر احمد اشفاق کریم نے اس سنٹر کے مسائل پر اظہار خیال کیا۔ ہیومن چین کے صدر انجینئر محمد اسلم علیگ نے بھی خطاب کیا۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 12 دسمبر 2016

اردو سیل مونگیر کے زیر اہتمام فروغ اردو پروگرام کا انعقاد

مونگیر: میر قاسم ودان ویرکرن کی پاک سرزمین پر اردو ڈائریکٹریٹ پٹنہ کے تعاون سے ضلع اردو سیل مونگیر کے زیر انتظام 'فروغ اردو' کے موضوع پر جناب خلافت انصاری اقلیتی فلاح و نوڈل آفیسر کے کاوشوں، کوششوں اور خوب صورت انتظامی امور کی وجہ سے سیمینار و مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت قاسم خورشید صدر شعبہ ایس سی ای آر ٹی پٹنہ نے فرمائی۔ جبکہ نظامت کے فرائض جناب سہیل شمس یو ڈی سی بلاک آفس جمال پور مونگیر نے انجام دی۔ پروگرام مونگیر کے ٹاؤن ہال میں ہوا اردو شیدائیوں سے ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ پروگرام کا باضابطہ آغاز محمد وسیم صاحب ایس ڈی او کھڑگ پور مونگیر کے افتتاحی خطبہ سے ہوا موصوف نے اپنے ابتدائی خطبہ میں فروغ اردو کے سلسلے میں کہا کہ اردو ہماری تہذیب ہے، ہماری ثقافت ہے، ہمارا تمدن ہے اس کے فروغ کے لیے ہمیں ہر سطح پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد الحاج غلام محمد سبکدوش معاون ندیشک سماجی سرکھچا، مونگیر نے سیمنار کے موضوع پر گفتگو کی۔ پروفیسر جاوید اختر آزاد، محمد خالد شمسی نے مقالے پیش کیے۔ نظام الدین قاسمی نے اپنا مدلل مقالہ سامعین کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اردو نے پشتو، پنجابی، مارواڑی، کشمیری، عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت، ترکی، یونانی، لاطینی جرمن اور انگریزی زبانوں کے الفاظ کو اپنے دامن میں سمیٹ کر اس کے گیسوئے برہم کو سنوار کر خوشبوؤں کا گلدستہ پیش کیا۔ مہمان خصوصی پروفیسر راشد طراز نے اردو کے فروغ پر اپنے تجربے کو لوگوں کے سامنے پیش کیا کہ اردو قارئین کی تعداد دن بدن گھٹتی جارہی ہے ہم سب کو مل کر اس کے بارے میں غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر قاسم خورشید نے اپنے بیان میں کہا کہ کون کہتا ہے کہ اردو کا مستقبل روشن نہیں ہے ہم کہتے ہیں کہ جب تک ہندوستان میں جمہوریت باقی ہے اور باقی رہے گی۔ ہمیں جمہوریت پر اگر یقین ہے تو پھر اردو کی بقا اردو کی ترقی اردو کے فروغ پر یقین کرنا ہوگا۔ اخیر میں خلافت انصاری اقلیتی فلاح و نوڈل آفیسر مونگیر نے شکریے کی رسم انجام دی۔

پریس ریلیز: قاسم خورشید، مونگیر، 12 دسمبر 2016

فروغ اردو سمینار

دربھنگہ: اردو زبان کی بڑی اہم اور قدیم تاریخ ہے۔ اس کا علمی و ادبی سرمایہ بھی بڑا قیمتی ہے۔ اس زبان اور اس کے ادب نے پوری ترقی کرلی ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس کو مزید فروغ دیں اور لوگوں کو اس سے جوڑیں۔ یہ باتیں ضلع کلکٹر ڈاکٹر چندر شیکھر سنگھ نے محکمہ کابینہ سکریٹریٹ اردو ڈائرکٹوریٹ پٹنہ کے اردو سیل کے زیراہتمام منعقد ضلع فروغ اردو سمینار کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کلکٹریٹ کے کانفرنس ہال میں کہیں۔ ضلع کلکٹر نے ایک ماہر لسانیات کی طرح اردو زبان و ادب کی ترقی اور فروغ کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ماہرین زبان جانتے ہیں کہ ایک حد تک ترقی کرلینے کے بعد ایک زبان دوسرے اور بڑے لسانی خاندان سے رشتہ جوڑلیتی ہیں۔ اردو نے بڑی لمبی تاریخ متعین کی ہے۔ اردو کی اثر آفرینی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ زبان دلوں کو چھولیتی ہے۔ جب ہم کہتے ہیں اردو ایک تہذیب ہے تو یہ ہمارے دل کی آواز معلوم پڑتی ہے۔

زیڈ حسن نے پروگرام کے انعقاد اور موضوع پر روشنی ڈالی اور کہا کہ ریاست میں تمام طبقے کو مناسب حصہ داری مل رہی ہے اور اردو زبان اور اقلیتوں کو کہیں کسی چیز کی حصے داری میں پیچھے نہیں رکھا گیا ہے۔ مہمان خصوصی ڈی ڈی سی وویکانند جھا نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ناظم تقریب عبدالمتین قاسمی نے اردو زبان و ادب کے علمی و ادبی سرمایے پر روشنی ڈالی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 دسمبر 2016

ایک روزہ تربیتی اسکیم ورکشاپ

سہرسہ: تنظیم اصلاحی فاؤنڈیشن سہرسہ کی جانب سے شہر کے مولانا آزاد کمپیوٹر انسٹی ٹیوٹ میر ٹولہ میں ایک روزہ اقلیتی اسکیم ورکشاپ کا اہتمام کیا گیا جس میں بڑی تعداد میں طلبا و طالبات اور اہم شخصیات نے شرکت کی۔ اس موقعے پر بہار اردو اکادمی کی جانب سے سہرسہ کو کمشنری کے غیر اردو داں لوگوں کو اردو سکھانے کی پندرہ روزہ کلاسیز کا آغاز کیا گیا جس پر سبھی نے مسرت ظاہر کرتے ہوئے اردو اکادمی بہار کے سکریٹری مشتاق نوری کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اس کورس سے ان لوگوں کو کافی خوشی ہوئی ہے جو اردو سیکھنا چاہتے ہیں۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 26 دسمبر 2016

اردو فورم مونگیر کا سالانہ جلسہ

مونگیر: اردو فورم، مونگیر کا سالانہ جلسہ 27 نومبر 2016 کو نہایت تزک و احتشام کے ساتھ منعقد کیا گیا جس میں جناب پروفیسر حسین الحق، سابق صدر شعبۂ اردو مگدھ یونیورسٹی نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت فرمائی اور جلسہ کی

نظامت جناب ظفر حبیب، سابق صدر شعبۂ اردو، متھلا یونیورسیٹی نے کی۔ جلسے کا آغاز کرتے ہوئے کنوینر، اردو فورم ڈاکٹر سہیل نے مہمانوں کا خیر مقدم اور سامعین کا استقبال کرتے ہوئے اردو فورم کا تعارف پیش کیا اور اردو فورم کی پچھلی 45 برسوں کی ادبی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اس فورم نے اردو زبان و ادب کی آبیاری میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ پروفیسر مہدی علی مرحوم نے اپنے ہم نواؤں کے ساتھ اردو فورم کی بنیاد ڈالی۔ اس کی پرورش کی۔ پروفیسر مہدی علی کی نیک نیتی اور اپنی زبان سے بے لوث محبت کی بنیاد پر قائم یہ اردو فورم 45 سال پورے کرکے اپنی بلند قامتی کے ساتھ آج بھی سرسبز و شاداب ہے۔ ان 45 برسوں میں اردو فورم کی بلا ناغہ 577 نشستیں ہو چکی ہیں۔ اردو کے بڑے شاعروں اور ادیبوں نے اس کی نشستوں میں شریک ہوکر اسے عزت بخشی ہے۔

کنوینر کی استقبالیہ تقریر کے بعد فورم کے رکن سید شاہ مصطفوی نے اپنی ترنم ریز آواز میں 'ترانۂ اردو' سنایا اور اس کے بعد پروفیسر مہدی علی کا تحریر کردہ 'فورم نامہ' سنایا۔ فورم کے دوسرے رکن پرویز اقبال نے اپنی نظم 'بنام اردو فورم' سے سامعین کو نوازا۔ کنوینر اردو فورم، مونگیر ڈاکٹر سہیل کے شکریے کے ساتھ جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

پریس ریلیز: اقبال حسن، مونگیر، 13 دسمبر 2016

فروغ اردو کے عنوان پر سمینار

جہان آباد: زبان اردو سے انسیت کا اظہار اس کی ترقی کا پہلا زینہ ہے۔ اس خیال کا اظہار اردو ڈائرکٹوریٹ بہار کے زیراہتمام گرام کمپلیکس بھون جہان آباد میں فروغ اردو کے عنوان پر منعقد سمینار کے صدارتی خطاب میں سابق ہیڈ ماسٹر الحاج ڈاکٹر ظفراللہ پالوی نے کیا۔ انھوں نے فروغ اردو کے سلسلے میں دانشوروں اور ماہرین تعلیم کی جانب سے پیش کردہ تجاویز پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ان پر عمل درآمد کرکے اردو کے فروغ کی راہ ہموار کی جاسکتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہاں موجود اہل اردو کی کثیر تعداد اس بات کی ضامن ہے کہ زبان اردو کا مستقبل ماضی کی طرح ہی شاندار ہے۔ اردو کے مستقبل کو لے کر فکر کی ضرورت نہیں ہے۔ سمینار کا باضابطہ آغاز ضلع مجسٹریٹ منوج کمار اور پولیس کپتان آدتیہ کمار نے مشترکہ طور پر شمع روشن کرکے کیا۔ بعدازاں ضلع مجسٹریٹ منوج کمار نے اپنے مختصر خطاب میں اردو کے فروغ کے تئیں اپنی جانب سے ہر ممکن تعاون کی یقین دہانی کرائی۔ انھوں نے کہا کہ اردو گنگا جمنی تہذیب کی مشترکہ علامت ہے۔ اس کا فروغ ہم سب کی ذمہ داری ہے۔ پولیس کپتان آدتیہ کمار نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو کے فروغ سے نفرت کی دیواریں منہدم ہوں گی اور محبت عام ہوگی۔ سمینار کی نظامت پروفیسر غلام اصدق نے کی۔ اس موقعے پر ماہر تعلیم پروفیسر عقیل احمد، کائنات فاؤنڈیشن کے چیئرمین شکیل احمد کاکوی، سید تابش امام، طارق فتح، نسیم زیدی، حسنین دیوانہ اور غلام اصدق نے اپنے مقالے پیش کیے۔ پروگرام کے کامیاب انعقاد میں اردو سیل کے افسر روی شنکر پرساد کا مکمل تعاون حاصل رہا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 دسمبر 2016

اردو میری زبان اور میرا مستقبل

آرہ: عبدالقیوم انصاری اردو یوگ ودیالیہ وتربیتی مرکز کے بینر تلے مہیشوری مارکیٹ، نوادہ چوک کے اڈیٹوریم میں 'اردو میری زبان اور میرا مستقبل' کے موضوع پر ایک سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت مرکز کے

ڈائرکٹر محمد یاسین انصاری نے کی۔ سمینار سے خطاب کرتے ہوئے مقرر خصوصی مدرسہ شمس الہدیٰ، پٹنہ کے سابق پرنسپل مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی نے کہا کہ اردو کی ترقی کے لیے لوگوں کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ افسوس کی بات ہے کہ بہار حکومت اردو کے لیے جو بھی نوٹیفکیشن جاری کرتی ہے، اس کا نفاذ نہیں ہو پا رہا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو دوسری سرکاری زبان سے متعلق تمام احکامات پر حکومت عمل درآمد کرائے۔ انجمن ترقی اردو بہار، پٹنہ کے سکریٹری عبدالقیوم انصاری نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔ مقامی ممبر اسمبلی ڈاکٹر انور عالم نے تنظیم کے ذریعے سونپے گئے 24 نکاتی مطالبات کو پورا کرنے کے لیے ایوان کے اندر اور ایوان کے باہر کوشش کرنے کا وعدہ کیا۔ اپنے صدارتی بیان میں محمد یاسین انصاری نے اردو کو روزگار سے جوڑنے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ جب تک اردو کو روزگار کے ساتھ نہیں جوڑا جائے گا تب تک اردو کی ترقی ممکن نہیں ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 دسمبر 2016

پنجاب:

اقبال کوئز اور پوسٹر میکنگ

مالیرکوٹلہ: پنجاب اردو اکادمی میں پہلی مرتبہ صوبائی سطح کا 'اقبال کوئز' اور 'پوسٹر میکنگ' مقابلوں کا انعقاد کیا گیا جس میں پنجاب کے مختلف اسکولوں سے بالترتیب 15 اور 17 ٹیموں نے حصہ لیا۔ پرنسپل محمد خلیل نے بطور مہمان خصوصی اس تقریب میں شرکت کی جبکہ 'اقبال کوئز' علامہ اقبال ایجوکیشن سینٹر کے سابق ڈائرکٹر طاہر حلیم اور 'پوسٹر میکنگ' مقابلے جناب ماسٹر عبدالعزیز اور جناب ماسٹر محمد امین چوہان کی زیرنگرانی منعقد کروائے گئے۔ پنجاب اردو اکادمی کے سکریٹری پروفیسر منظور حسن نے معزز مہمانان کا خیر مقدم کیا۔ مہمان خاص پرنسپل محمد خلیل نے پنجاب اردو اکادمی کی مکمل فعالیت پر تشفی کا اظہار کیا اور جیتنے والی ٹیموں کو پیشگی مبارکباد بھی دی۔ اقبال کوئز کے جج جناب طاہر حلیم نے علامہ اقبال کی شاعرانہ عظمت پر مختصراً روشنی ڈالی اور اقبال کوئز میں شامل ٹیموں کی مجموعی کارکردگی پر اپنی مسرت کا اظہار کیا اور اقبال کوئز کی فاتح ٹیموں کے ناموں کا اعلان کیا۔ اوّل: سرکاری ہائی اسکول، جمالپورہ، دوئم: الفلاح پبلک سینئر سیکنڈری اسکول، مالیرکوٹلہ اور سوم: اسلامیہ ہائی اسکول، قلعہ رحمت گڑھ، ماسٹر عبدالعزیز نے روزمرہ زندگی میں پوسٹر میکنگ مقابلوں کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور پوسٹر میکنگ مقابلوں کی فاتح ٹیموں کے ناموں کا اعلان کیا۔ اوّل: اسلامیہ گرلز سینئر سیکنڈری اسکول، مالیرکوٹلہ، دوئم: سرکاری ہائی اسکول، رڑکا اور سوم: سرکاری ہائی اسکول، خانپور۔ معروف ادیب ایم انوار انجم نے نظامت کے فرائض بحسن وخوبی انجام دیے۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 16 دسمبر 2016

ہریانہ:

حالی کے خوابوں کا ہندوستان

ہریانہ: خواجہ الطاف حسین حالی نے علم وادب کے میدان میں غیر معمولی خدمات انجام دیں۔ انھوں نے لڑکیوں

میں تعلیم عام کرنے کے لیے کوشش کی نیز سماج کے اندر خواتین کو مستحکم پوزیشن پر پہنچانے اور عورتوں کو استحصال کرنے والی مختلف رسومات کے خلاف حالی نے اپنی شاعری کو استعمال کیا۔ ان خیالات کا اظہار دارالمصنفین شبلی اکادمی کے ڈائرکٹر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے ہریانہ کے جشن زریں کے موقعے پر ہریانہ اردو اکادمی کے زیراہتمام ایس ڈی (پی جی) کالج کے تعاون سے حالی کے خوابوں کا ہندوستان کے موضوع پر منعقد سمینار میں صدارتی خطاب کے دوران کیا۔ حالی کے یوم وفات کی مناسبت سے دوروزہ ادبی تقریب کا آغاز 31 دسمبر مشاعرہ سے ہوا اور یکم جنوری کو حالی کے خوابوں کا ہندوستان پر مقالے پڑھے گئے۔ محکمۂ اطلاعات و رابطہ عامہ والسنہ کی ریاستی وزیر محترمہ کویتا جین بہ طور مہمان خصوصی شریک ہوئیں۔ سناتن دھرم پوسٹ گریجویٹ کالج کے پرنسپل انوپم اروڑا نے مہمانوں اور حاضرین کا خیر مقدم کیا۔ سمینار کی نظامت راجیو رنجن نے کی۔ صدارتی خطاب کو جاری رکھتے ہوئے پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے کہا کہ پانی پت اور حالی لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس موقعے پر انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ پانی پت تین جنگوں کی وجہ سے جانا جاتا ہے مگر حالی نے تعلیم نسواں اور آزادی نسواں کے لیے پانی پت کی چوتھی جنگ شروع کی تھی۔ اس جنگ کو ہمیں کامیاب کرنا ہے تاکہ خواتین کا کسی شکل میں بھی استحصال نہ ہو سکے۔ مہمان خصوصی کے طور پر اپنے خطاب میں ریاستی وزیر محترمہ کویتا جین نے کہا کہ انھیں گرچہ شعروادب سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی ہے، مگر ایک سماجی خدمت گار کے طور پر اور اب ایک ریاستی وزیر کی حیثیت سے میرا یہ احساس ہے کہ ادب سماج کا صرف آئینہ دار ہی نہیں ہوتا بلکہ اس سے سماج کو ایک نئی سمت دی جاسکتی ہے۔ مولانا حالی ایسے ہی ادیب تھے جنھوں نے ادب کے ذریعے سماج کو ایک نئی سمت دینے کی کوشش کی۔ ہماری کوشش ہوگی کہ ان کی خدمات کو ہم عام کریں اور خواتین خصوصاً ان کی ترقی اور تعمیر کے لیے ان کے جو خیالات تھے انھیں ہم اپنے منشور میں شامل کریں تاکہ ہریانہ کی بیٹیاں ایک سرگرم سماج کا حصہ بن سکیں۔ اس موقعے پر دوسرے شرکا نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 جنوری 2017

اعزاز و اکرام:

سید محمد اشرف

علی گڑھ: مدھیہ پردیش حکومت نے اپنے باوقار ادبی انعام 'اقبال اعزاز' کے لیے معروف افسانہ نگار سید محمد اشرف کو منتخب کیا ہے۔ یہ اطلاع البرکات انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر احمد مجتبیٰ صدیقی نے دی ہے۔ مدھیہ پردیش

حکومت کا محکمہ ثقافت اردو ادب میں گراں قدر خدمات انجام دینے والے ادیبوں کو 'اقبال اعزاز' سے نوازتا ہے۔ سید محمد اشرف کا انتخاب سال 13-2012 کے انعام کے لیے کیا گیا ہے۔ اقبال اعزاز کے تحت 2 لاکھ روپے نقد، ایک سپاس نامہ اور شال دی جاتی ہے۔ واضح ہو کہ سید محمد اشرف نہ صرف ہندوستان بلکہ برصغیر کے ممتاز افسانہ

نگاروں میں شامل ہیں۔ ابھی حال ہی میں ان کا ناول 'آخری سواریاں' ادبی دنیا میں بے پناہ داد و تحسین حاصل کر چکا ہے۔ اس کے علاوہ 'نمبردار کا نیلا' اور 'بادِ صبا کا انتظار' وغیرہ ان کی تخلیقات کے لیے ساہتیہ اکادمی سمیت مختلف اداروں اور تنظیموں کی جانب سے اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 دسمبر 2016

نظام صدیقی

نئی دھلی: اردو کے ممتاز نقاد اور دانشور نظام صدیقی کو ان کی تنقیدی کتاب 'مابعد جدیدیت سے نئے عہد کی تخلیقیت تک' پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ 2016 دینے کا اعلان

کیا گیا۔ اردو کے معاصر تنقیدی منظر نامے پر نظام صدیقی کا نام محتاج تعارف نہیں۔ الہ آباد کے رہنے والے ڈاکٹر نظام صدیقی کی کئی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ انھیں کئی اداروں نے اپنے انعامات و اعزازات سے بھی نوازا ہے۔ وہ 2013 کے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ برائے ترجمہ سے بھی نوازے جا چکے ہیں۔ نظام صدیقی 'اکیڈمی لا نیو ایج کریٹیوٹی' کے چیئرمین، وشو بھاشا پریشد کے مغربی شعبے کے صدر اور فرنچ اکادمی پانڈیچری کے نائب صدر رہ چکے ہیں۔ وہ اردو کے ایک اہم ناقد، کئی زبانوں کے مترجم، فکشن نگار اور ڈراما نگار بھی ہیں۔ ایوارڈ کا فیصلہ جیوری کی میٹنگ میں ہوا جس کی صدارت اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینر اور معروف شاعر چندر بھان خیال نے اور جیوری ممبران میں پروفیسر عتیق اللہ، کرشن کمار طور اور ف س اعجاز شامل تھے۔ یہ ایوارڈ ساہتیہ اکادمی کے امتیازی نشان اور ایک لاکھ روپے پر مشتمل ہے جو 22 فروری 2017 کو نئی دہلی میں منعقد ہونے والی ایک پروقار تقریب میں پیش کیے جائیں گے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 22 دسمبر 2016

محمد علی جوہر کا 28 واں سالانہ جلسہ اور تقریب تقسیم انعامات

نئی دھلی: سرکردہ مجاہد آزادی مولانا محمد علی جوہر کے

138 ویں یوم ولادت پر مولانا محمد علی جوہر اکادمی نئی دہلی کے زیر اہتمام 28 واں سالانہ جلسہ اور تقریب تقسیم انعامات کے پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے انصاری آڈیٹوریم میں منعقدہ اس پروگرام کی صدارت سابق وزیر اور جھارکھنڈ کے سابق گورنر سید سبط رضی نے کی۔ سید سبط رضی نے اپنے صدارتی خطاب میں مولانا محمد علی جوہر کی قربانیوں کو یاد کیا اور کہا کہ جس طرح انھیں ہندو مسلم اتحاد بہت عزیز تھا اسی طرح آج بھی اس کی بہت ضرورت ہے۔ سید سبط رضی نے مسلمانوں میں تعلیم کے گرتے معیار پر اظہار تشویش کیا اور مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ علم کے میدان میں آگے آئیں۔ مہمان خصوصی پروفیسر ایم اسلم وائس چانسلر اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی نے بھی مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کا ذکر کیا اور کہا کہ آج زیادہ تعلیمی ادارے کھولنے کے بجائے تعلیم کے معیار کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ جامعہ ہمدرد یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر سید احتشام حسنین نے کہا کہ آج ہم بہت نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ صرف سیاسی اعتبار سے نہیں بلکہ ہر اعتبار سے بڑا نازک وقت آ پڑا ہے۔ ایسے موقعے پر ہم لوگوں کو بہت سوجھ بوجھ سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے مولانا محمد علی جوہر کو یاد کرتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ذکر کیا اور کہا کہ مولانا جوہر کو سچا خراج عقیدت یہی ہوگا کہ ہم ان کے تعلیمی نظریات کو آگے بڑھائیں۔ اس موقعے پر صحافی سہیل انجم نے کہا کہ مولانا محمد علی جوہر نے اپنے اخبار کامریڈ اور ہمدرد کے ذریعے صحافت کو جس اعلیٰ مقام پر پہنچایا تھا آج بھی اسی معیار کو بحال کرنے کی ضرورت ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر سید احتشام حسنین، اے جے چودھری او ایس ڈی ایل جی دہلی، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر کملیش ورما، شکیل حسن شمسی ایڈیٹر انقلاب اور کالی کٹ یونیورسٹی کی وائس چانسلر پروفیسر انور جہاں زبیری کو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اکادمی کے نائب صدر اے ایم کے شیروانی نے آخر میں شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 12 دسمبر 2016

بچوں کا سالانہ جشن

نئی دھلی: سروودیہ بال وِدیالیہ نمبر 1 اردو میڈیم اسکول میں سالانہ جشن جوش و خروش کے ساتھ منایا گیا۔ اسکول کے طلبا نے شاندار کلچر پروگرام پیش کر کے ناظرین کو خوب محظوظ کیا۔ گذشتہ سال تعلیمی و دیگر سرگرمیوں میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے طلبا کو مہمان کے

ہاتھوں اسناد و انعامات سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر اسکول کی سالانہ میگزین 'آئینہ' کا رسم اجرا بھی عمل میں آیا۔ ڈائرکٹر جی ای اوئل اینڈ گیس نوید اقبال نے کہا کہ آج کے دور میں کچھ بننے کے لیے تعلیم ہی واحد ذریعہ ہے۔ اپنی زندگی کو خوش حال اور معیاری بنانا ہے تو بنیادی طور پر ضروری چیز تعلیم ہے۔ انھوں نے والدین سے خصوصی درخواست کی کہ وہ اپنے بچوں کی رہنمائی کریں۔ انجمن منہاج رسول رجسٹرڈ کے صدر مولانا اطہر حسین دہلوی نے کہا کہ حضرت علی کا قول ہے کہ عقل علم کی محتاج ہے۔ اپنے اساتذہ سے علم حاصل کریں اور صرف اس لیے نہیں کہ پڑھ لکھ کر اچھی نوکری کرنی ہے بلکہ اس لیے کہ ایک اچھا انسان بننا ہے۔ اسکول کے وائس پرنسپل غیور احمد نے کہا کہ اس پروگرام کے کامیاب انعقاد میں ایس ایم سی ممبران، اسکول کے اساتذہ اور بچوں کا بڑا کردار رہا ہے۔ مہمان خصوصی جامع مسجد پولیس اسٹیشن کے ایس ایچ او انل کمار نے کلچرل پروگرام کی خوب تعریف کرتے ہوئے سالانہ جشن کی بچوں و اساتذہ کو جامع مسجد پولیس اسٹیشن اور دلی پولیس کی طرف

سے مبارک باد پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ یہ اردو میڈیم اسکول ہے اردو زبان بہت میٹھی ہے اسکول میں اگر اساتذہ کی کمی ہے کہ تو میں بطور استاد اپنی خدمات دینے کو تیار ہوں۔ میں نویں اور دسویں جماعت کو ریاضی پڑھا سکتا ہوں مگر اس کے عوض میں اسکول کے پرنسپل کو مجھے یقین دلانا ہوگا کہ وہ مجھے بطور ایک طالب علم اردو زبان سکھانے کا انتظام کریں گے۔ میری خواہش ہے کہ میں اردو زبان سیکھوں۔ اس موقعے پر ڈی ڈی ای چترا گپتا، اکالامبا کے نمائندے اصغر علی نے بھی اظہار خیال کیا۔ تقریب میں ایس ایم سی ممبران کے علاوہ بڑی تعداد میں والدین نے شرکت کی۔ نظامت کے فرائض آصف اقبال نے بحسن وخوبی انجام دیے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 23 دسمبر 2016

جلسہ تقسیم اسناد

حیدرآباد: تعلیم سے زیادہ دنیا میں کچھ بھی اہم نہیں

ہے۔ جو کوئی تعلیم حاصل کرتا ہے وہ قابل فخر ہے۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز فلم اداکار شاہ رخ خان نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے چھٹے جلسۂ تقسیم اسناد سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ اس موقعے پر شاہ رخ خان کو یونیورسٹی نے اعزازی ڈاکٹریٹ سے سرفراز کیا۔

ظفر یونس سریش والا چانسلر اردو یونیورسٹی نے جلسے کی صدارت کی۔ جلسۂ تقسیم اسناد میں ایک اور ممتاز شخصیت اور محب اردو ریختہ فاؤنڈیشن کے بانی سنجیو صراف کو بھی اعزازی ڈاکٹریٹ سے نوازا گیا۔ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز، وائس چانسلر نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا اور یونیورسٹی کی کارکردگی کی رپورٹ پیش کی۔ شاہ رخ خان نے سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اردو یونیورسٹی آکر وہ جذباتی ہوگئے ہیں کیونکہ یہاں آنے سے ان کے والد مرحوم کی یاد تازہ ہوگئی ہے۔ شاہ رخ کے والد اردو کے زبردست دلدادہ اور مولانا ابوالکلام آزاد کے مداح تھے۔ شاہ رخ نے اردو یونیورسٹی کی اعزازی ڈگری قبول کرتے ہوئے ازراہ انکساری کہا کہ وہ اس اعزاز کے قابل ہیں کہ نہیں، یہ سمجھنے سے قاصر ہیں۔ البتہ ان کے والد مرحوم تعلیم کی اہمیت ہمیشہ اجاگر کرتے تھے اور بہت دلکش اردو میں بات کیا کرتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اعزازی ڈاکٹریٹ کے حصول نے مجھے اس بات کا پابند کردیا ہے کہ میں اپنے کام کے ذریعے تعلیم کے شعبے میں بھی خدمت انجام دوں۔ اس موقعے پر سنجیو صراف، بانی ریختہ فاؤنڈیشن نے اپنی تقریر میں یونیورسٹی کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا کہ انھیں اعزازی ڈاکٹریٹ کے لائق سمجھا گیا۔ انھوں نے اردو زبان کی خدمت کو اپنی خوش بختی قرار دیا اور کہا کہ اردو زبان کی رگوں میں ہندو ویدانت اور اسلامی تصوف کا خون دوڑ رہا ہے۔ ہندوستان اور ساری دنیا میں اردو کے ایسے کروڑہا چاہنے والے ہیں جو اردو رسم الخط نہ جاننے کے باوجود اس سے محظوظ ہوتے ہیں۔ ریختہ ڈاٹ کام ویب سائٹ ایسے ہی شائقین اردو کے لیے قائم کی گئی ہے۔

ظفر سریش والا، چانسلر نے اپنی صدارتی تقریر میں طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ان کی محنت کے نتیجے کے طور پر سند اور تمغے عطا کیے گئے ہیں۔ سریش والا نے اعتراف کیا کہ مولانا ابوالکلام آزاد جیسی عظیم شخصیت سے موسوم یونیورسٹی سے وابستگی ان کے لیے قابل فخر ہے۔ ان کے والد مرحوم مولانا آزاد کے زبردست مداح تھے۔ اردو یونیورسٹی سے وابستگی کے بعد اس بات کا انکشاف ہوا کہ اردو اب صرف شعر وادب کی زبان نہیں رہی بلکہ اس کے ذریعے جدید علوم بھی سیکھے جاسکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے فروغ میں ہندی فلموں نے اہم رول ادا کیا ہے اور اس کام میں شاہ رخ خان کا بھی اہم کردار ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 دسمبر 2016

اترپردیش سرکار کے ملازمین کو اعزازات

لکھنؤ: اترپردیش کے ریاستی ملازمین کو ادبی خدمات کے لیے انعام سے نوازنے کی حکومت کی اسکیم کے تحت 'راجیہ کرم چاری ساہتیہ سنستھان اترپردیش، لکھنؤ کے ذریعے مالیاتی سال 17-2016 میں جن ادیبوں کو انعامات سے نوازنے کا فیصلہ کیا گیا ہے ان میں محمد انیس انصاری سبکدوش زرعی پیداوار کمشنر کو میر تقی میر انعام، سید اسرار حسین سبکدوش ڈپٹی ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ کو جوش ملیح آبادی، سید امجد حسین جوائنٹ ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ لکھنؤ کو مرزا اسداللہ خاں غالب انعام، ڈاکٹر تنویر احمد ریویو افسر اردو یچی والے کو امیر خسرو انعام، محمد علی ساحل ڈی آئی ویمن پاور لائن لکھنؤ کو فراق گورکھپوری انعام، محمد سلیم خاں جونیر ہندی مترجم کیرل کو شرد چندر چٹوپادھیا انعام۔ مذکورہ لوگوں کو 51 ہزار روپے کے انعامات سے نوازا جائے گا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 31 دسمبر 2016

بیرونِ ملک سے آئے اردو کے نمائندگان کو استقبالیہ

نئی دهلی: اردو اکادمی، دہلی کے زیر اہتمام سعودی عرب، کویت، نیپال وغیرہ سے آئے ہوئے اردو کے شعرا اور ادیبوں کے اعزاز میں ایک استقبالیہ کا اہتمام کیا گیا جس میں مہمانِ خصوصی کے طور پر دہلی کے ایم ایل اے اہل واجپئی اور حاجی اشراق نے شرکت کی۔ مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے کہا کہ اردو کے سلسلے میں ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے بلکہ سچائی یہ ہے کہ پوری دنیا میں اردو کی جڑیں مضبوط ہیں اور وہاں اردو کے فروغ کے لیے بہت کام ہو رہا ہے۔ افروز عالم (کویت)، ثاقب ہارونی (نیپال)، محمود شاہد (سعودی عرب) اور سعید روشن (کویت) کا استقبال کرتے ہوئے ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے کہا کہ یہ لوگ اپنے اپنے ملکوں میں اردو کے لیے جو کام کررہے ہیں وہ قابل ستائش ہے۔ انھوں نے اردو اکادمی کی طرف سے ان مہمانوں کو پھولوں کا گلدستہ دے کر استقبال کیا اور اکادمی کی طرف سے کتابوں کا ایک ایک سیٹ بھی پیش کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 8 دسمبر 2016

اجرا:

جرنی آف فیتھ

نئی دهلی: ''مولانا عبدالماجد دریابادی مجدد عصر تھے۔ انھوں نے قرآن مجید کے اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ترجمہ اور تفسیر کے ذریعے غیر معمولی خدمت

انجام دی۔ وہ اور میرے والد دونوں تحریک خلافت میں

نائب صدر جمہوریہ حامد انصاری کے ہاتھوں مرکز المعارف کی مطبوعات کا اجرا

ایک دوسرے کے ساتھ شریک تھے۔'' ان خیالات کا اظہار نائب صدر جمہوریہ نے اپنی رہائش گاہ پر پروفیسر اختر الواسع اور پروفیسر عبدالرحیم قدوائی کی مرتب کردہ کتاب 'Journy of Faith' کا اجرا کرتے ہوئے کیا۔ یہ کتاب شپرا پبلی کیشنز، نئی دہلی نے شائع کی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ میں پروفیسر اختر الواسع اور پروفیسر عبدالرحیم قدوائی کو مبارک باد دیتا ہوں کہ مولانا پر انگریزی زبان میں ابھی تک کوئی کام نہیں ہوا تھا اور انھوں نے اس کتاب کی ترتیب کے ذریعے بڑا کام کیا ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ مولانا کی شخصیت بہت دل نواز اور ہمہ جہت تھی۔ انھوں نے یقین کی منزل کو تشکیک کے راستے سے پایا اور ایک دفعہ جب ایمان اور یقین کی نعمتوں سے بہرہ مند ہوگئے تو پھر انھوں نے راسخ العقیدگی کا دامن کبھی نہیں چھوڑا۔ وہ جدید تعلیم یافتہ عالموں میں اس اعتبار سے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں کہ انھوں نے علم دین کی خدمت کسی مدرسے کے فاضل سے کم درجے کی نہیں کی۔ کتاب کے دوسرے مرتب پروفیسر عبدالرحیم قدوائی نے اپنے استقبالیہ کلمات میں کہا کہ مولانا دریابادی علم وعمل، فضل وکمال اور دین و دنیا سب کا ایک جامع پیکر تھے۔ انھوں نے مولانا دریابادی کی تصنیفات کا ایک جامع تعارف بھی پیش کیا۔ جلسے کی صدارت مولانا عبدالماجد دریابادی کے بھتیجے اور داماد جناب عبدالعلیم قدوائی نے کی۔ کتاب کے ناشر شپرا پبلی کیشنز کی طرف سے محترمہ رشمی اگروال نے نائب صدر جمہوریہ اور تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 دسمبر 2016

مرکز المعارف

نئی دھلی: نائب صدر جمہوریہ ہند عالی جناب حامد انصاری نے اپنی رہائش گاہ پر مرکز المعارف کی حالیہ تین مطبوعات (1) Prophet Muhammad's Life: An Introspection on Present Day Conditions (2) Common Mistakes among Muslims (3) The Elevation of Woman in Islam کا اپنے ہاتھوں سے اجرا کیا۔ مرکز کے طریقۂ تعلیم اور اس کی حصولیابیوں کا ذکر کرتے ہوئے نائب صدر جمہوریہ نے مولانا بدرالدین اجمل کی مساعی کو بھرپور سراہا اور ان کا انقلابی کارنامہ قرار دیا۔ اجرا کی اس پروقار تقریب میں مرکز المعارف کے صدر اور آسام کے ڈھوبری حلقے سے لوک سبھا ایم پی مولانا بدرالدین اجمل، مولانا برہان الدین قاسمی ڈائرکٹر مرکز المعارف ایجوکیشن اینڈ ریسرچ سنٹر، مفتی عبیداللہ قاسمی اسسٹنٹ پروفیسر ذاکر حسین دہلی کالج، مفتی محمد اللہ قاسمی کوآرڈی نیٹر انٹرنیٹ ڈپارٹمنٹ دارالعلوم دیوبند اور مولانا منظر بلال قاسمی پرسنل سکریٹری مولانا بدرالدین اجمل کے علاوہ مذکورہ کتابوں کے مصنف/مترجم مولانا مدثر احمد قاسمی، مولانا توقیر احمد قاسمی اور مولانا حفظ الرحمٰن قاسمی اور مولانا عبدالصمد رحمانی نے شرکت کی۔ اس موقعے پر نائب صدر محترم نے مرکز کی ہمہ جہت سرگرمیوں اور خدمات پر مسرت واستعجاب کا اظہار کرتے ہوئے مندرجہ بالا کتابوں کے مشمولات، زبان اور پیشکش کو بھی سراہا اور امید ظاہر کی کہ مرکز کی جانب سے شائع ہونے والی کتابیں علم وفکر کے میدان میں وقیع اضافے کے ساتھ ساتھ محققین اور ریسرچ اسکالر کے لیے بھی معاون ثابت ہوں گی۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 14 دسمبر 2016

بھگوت گیتا قرآن کی روشنی میں

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام اردو کتاب میلہ (رئیس ہائی اسکول، بھیونڈی) میں کونسل کے ہی مالی تعاون سے شائع شدہ ڈاکٹر ساجد صدیقی (مالیگاؤں) کی کتاب 'بھگوت گیتا قرآن کی روشنی میں' کا اجرا کونسل کے ڈائرکٹر ارتضیٰ کریم کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ آپ نے یہ عزم ظاہر کیا کہ وہ اس کتاب کو ہندوستان کے سربراہان تک ضرور پہنچائیں گے۔ اس کتاب کا ہندی ترجمہ 'بھگوت گیتا قرآن کے پرکاش میں' کا اجرا پچھلے مہینے ماؤنٹ آبو (راجستھان) کی عظیم الشان سنستھا 'پرجاپتی برہم کماری' کی بزرگ و مذہبی قائد وادی جانکی ودادی ہردے موہنی کے ہاتھوں عمل میں آیا اور ایک اجرا گاندھی وادی ڈاکٹر پرکاش آمٹے (پدم شری، آنندون مہاراشٹر) کے ہاتھوں بھی ہوچکا ہے۔ اس کے باوجود پروفیسر ارتضیٰ کریم نے 'اردو میلہ' کے اسٹیج سے اسلم فقیہ (صدر کوکن مسلم ایجوکیشن سوسائٹی بھیونڈی) کے ہاتھوں ہندی کتاب کا اجرا بھی اس بات کو عام کرنے کے لیے کروایا کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان صرف اردو کے فروغ کے لیے ہی نہیں بلکہ ہر زبان کے فروغ کے لیے ہے کیونکہ تمام زبانیں اللہ کی نشانی ہیں اور کہا کہ جب ہم مسلمان بھارت دیش کی سلامتی کے لیے ہندو بھائیوں کی مذہبی کتاب بھگوت گیتا کی اصل تعلیمات کو قرآن کے نظریات کی روشنی میں عام کرنے کی سعی کرسکتے ہیں تو اپنی قومی زبان 'ہندی' کو فروغ دینے کی کوشش کیوں نہیں کرسکتے۔ (1) بھگوت گیتا قرآن کی روشنی میں (اردو)، (2) بھگوت گیتا قرآن کے پرکاش میں (ہندی) یہ دونوں کتابیں 594 صفحات کی ہیں جو کہ بھارت دیش میں موجود تمام ہندو و مسلم بھائیوں اور بہنوں کو قرآن اور گیتا کی مشترک بنیادی تعلیمات کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے لکھی گئی ہیں تاکہ دونوں مذاہب کی پیروی کرنے والے انسانوں کو ان کے ایک ہی خالق مالک (توحید) سے جوڑ کر تمام ہندو اور مسلم بھائیوں میں اتحاد، محبت اور امن وسلامتی پیدا کرکے بھارت ملک کو روحانی ترقی میں بھی سب سے آگے لایا جاسکے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 22 دسمبر 2016

چوڑی والا

نئی دھلی: کرن شبنم کے افسانوں کا مجموعہ 'چوڑی والا' کی رسم اجرا 5 دسمبر 2016 کو گاندھی پیس فاؤنڈیشن میں ہوا۔ اس دوران افسانہ نگار نے اپنی تقریر میں سماجی نابرابری اور غریبوں کی بری حالت کی طرف سے ہر ادارے کی بے توجہی کا معاملہ اٹھایا اور کہا کہ ان کے افسانوں کے موضوعات میں صرف غریبی نہیں بلکہ غریبی دور کرنے کے نام پر دولت مندوں کو مزید دولت کے حصول کی سہولتیں فراہم کرنے کی روش کے خلاف بیداری پر شامل ہیں۔ دہلی جیسے بڑے شہر کی ترقی کے نام پر اس تبدیلی سے پیدا شدہ سماجی مثال ان کے افسانوں کا موضوع بنے ہیں۔ رسم اجرا کے موقعے پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ وہ کہانیوں کے اس مجموعے کا اس اعتبار سے بھی خیر مقدم کرتے ہیں کہ اب اردو میں لکھنے والی خواتین کی تعداد بہت کم ہوگئی ہے اور نئی شخصیتیں سامنے نہیں آرہی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ اپنی

راج نرائن راز کی کلیات اوران کی شاعری اور شخصیت پر مشتمل کتاب کا اجرا

مصروفیات سے کچھ وقت چرا کر اس تقریب میں شرکت کے لیے اس لیے بھی آئے ہیں کہ انھیں سماج میں عورت کا احترام لازمی نظر آتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کرن شبنم نے چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھی ہیں ان سے دل متاثر ہوتا ہے۔ کہیں کسی کہانی سے دل ٹوٹتا ہے کہیں کسی کہانی سے دل سنبھل جاتا ہے۔ انھوں نے چوڑی والا، لفٹ اور خالی گملا کا حوالہ دیا اور کہا کہ ہم جس سماج میں آج رہ رہے ہیں اس میں بہت کچھ چھوٹ رہا ہے۔ خاص کر دکھ سکھ میں حصہ داری کا جذبہ۔ اقتصادی بھاگ دوڑ میں انسان انسان سے دور ہوگیا۔ دولت کمانے اور جمانے کی حوس میں انسانی رشتے ٹوٹ رہے ہیں اور کرن شبنم کی کہانیوں میں انھیں انسانی رشتوں کے ٹوٹنے کا نوحہ ہیں۔ ضیاء الرحمٰن غوثی نے تقریب کی نظامت کی اور تہذیب انٹر پرائز کے زیراہتمام یہ تقریب منعقد ہوئی جس میں شہباز حسین، عبدالمنان، فاروق ارگلی، منصور عثمانی، نگار عظیم، ظفر انور، ابرار رحمانی، ایم آر قاسمی، شکیل رحمانی ودیگر نے شرکت کی۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 6 دسمبر 2016

راج نرائن راز کی کلیات اوران کی شاعری اور شخصیت پر مشتمل کتاب کا اجرا

نئی دهلی: یہاں ماہنامہ آج کل کے سابق مدیر راج نرائن راز کی حیات وخدمات پر خورشید اکرم کی تالیف 'نئی رتوں میں: راج نرائن راز اور راز کے تینوں شعری مجموعوں کے مطبوعہ کلام پر مشتمل ان کی کلیات کی رسم اجرا کی تقریب دہلی میں منعقد کی گئی۔ اس موقعے پر کلیات راج نرائن راز اور نئی رتوں میں راج نرائن راز ان دونوں کتابوں کی رسم رونمائی پروفیسر شمیم حنفی نے ادا کی۔ تقریب کی صدارت نند کشور وکرم نے کی۔ دیگر اہم شرکا میں سرکردہ افسانہ نگار رتن سنگھ اور قومی کاؤنسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائریکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم بھی شامل تھے۔ تقریب کی نظامت خورشید اکرم نے کی اور اظہار تشکر مدبرہ عثمانی نے۔ نگار عظیم نے راج نرائن راز پر لکھے ہوئے اپنے مضمون کا ایک اقتباس پڑھ کر سنایا۔ مقررین میں، شمیم حنفی، ارتضیٰ کریم، رتن سنگھ، نند کشور وکرم، خورشید اکرم، نگار عظیم، مدبرہ عثمانی، راج نرائن راز کے بیٹے اجے بابر اور ان کے داماد وینا ش پانڈے نے راز صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا۔

پریس ریلیز: خورشید اکرم، صادق نگر، نئی دہلی، 10 جنوری 2017

دور زیاں کا ثقافتی بیانیہ

علی گڑھ: یوجی سی ایچ آر ڈی سی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے زیراہتمام ممتاز فکشن نگار سید محمد اشرف کے ناول 'آخری سواریاں' پر مشتمل تنقیدی مقالات کے مجموعے 'دور زیاں کا ثقافتی بیانیہ' مرتبہ ڈاکٹر سیما صغیر کی رسم اجرا اکیڈمک اسٹاف کالج میں پروقار تقریب میں عمل میں آئی۔ پروفیسر صغیر افراہیم نے ابتدائی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ سید محمد اشرف کا ناول تہذیبی، ثقافتی اور لسانی اعتبار سے تو اہم ہے ہی ساتھ ہی فکری سطح پر بحث کے نئے در بھی وا کرتا ہے۔ ڈاکٹر سیما صغیر نے ناول کے تعلق سے جو مقالات ترتیب دیے ہیں وہ اس کی کامیابی کے غماز ہیں۔ صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے معروف فکشن نگار پدم شری پروفیسر قاضی عبدالستار نے بے جھجک 'آخری سواریاں' ناول کو صفحہ اول کا ناول قرار دیتے ہوئے کہا کہ انھیں فخر ہے کہ ان کے شاگرد اس قدر لائق ہیں۔ 'آخری سواریاں' کے مصنف اور ممتاز فکشن نگار سید محمد اشرف نے کہا کہ بے حد کشیدہ ماحول میں بھی علیگڑھ میں تہذیب اور الفاظ کی حرمت کے امین ادبی گفتگو میں مصروف ہیں تو یہ ادب کی فتح کے مترادف ہے انھوں نے کہا کہ پروفیسر قاضی عبدالستار نے تین نسلوں کی رہنمائی کی ہے اور ان کا یہ ماننا برحق ہے کہ شاعری کے اوزاروں پر فکشن کا بھی پورا پورا حق ہے۔ پروفیسر اے آر قدوائی نے کہا کہ سید محمد اشرف مٹتی ہوئی گنگا جمنی تہذیب اور دور حاضر کی تلخ صورت حال کی عکاسی اپنی تحریروں میں کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے تاریخ کی ستم ظریفیوں کو اپنے فکشن میں خاصی جگہ دی ہے۔ سید محمد اشرف بھی ان فنکاروں میں شامل ہیں جن کو اعلیٰ قدروں کا زوال پریشان کرتا رہتا ہے۔ ڈاکٹر سیما صغیر نے کتاب 'دور زیاں کا ثقافتی بیانیہ' کو مرتب کرنے کی وجوہ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ملک اور بیرون ممالک کے متعدد قلم کاروں کے تعاون سے یہ کام انجام پایا۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 18 دسمبر 2016

10 کتابوں کا اجرا

رامپور: احباب رامپور انٹرنیشنل اور صولت پبلک لائبریری کے زیراہتمام ایک پروقار ادبی تقریب گورنمنٹ خورشید انٹر کالج میں منعقد ہوئی جس میں 7 مصنفین کی 10 کتابوں کا رسم اجرا بھی عمل میں آیا۔ یہ رامپور کی تاریخ میں پہلا موقع ہے کہ جب بڑی تعداد میں اتنی کتابوں کا ایک ہی تقریب میں اجرا عمل میں آیا۔ اگر ہم اس تقریب کو جشن کتب

کہیں تو بے جا نہیں ہوگا۔ تقریب کی صدارت ڈاکٹر رخشندہ مبین (مرادآباد) نے کی جبکہ مہمانان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر سعیدہ رضوی (رامپور) اور مہمان اعزازی کے طور پر ثروت عثمانی (اسٹیشن ڈائریکٹر آکاشوانی رامپور)، ڈاکٹر ترانہ حسین خان اور محمد زبیر شمسی موجود تھے۔ اپنے صدارتی خطبہ میں ڈاکٹر رخشندہ مبین نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میری زندگی میں یہ پہلا موقع ہے کہ جب ایک ادبی تقریب میں اتنی بڑی تعداد میں کتب کا اجرا ہو رہا ہے۔ اس موقعے پر صولت لائبریری اور احباب رامپور انٹرنیشنل کی جانب سے مہمان کو دوشالہ اعزاز اور سپاس نامے پیش کیے گئے۔ اس تقریب میں جن کتابوں کی رونمائی عمل میں آئی ان میں رقص صدا: معظم علی خاں (علی گڑھ)، فن اور فنکار: ڈاکٹر شریف احمد قریشی، زرد پتے: چشمہ فاروقی (دہلی)، فرہنگ باغ و بہار: ڈاکٹر ساجدہ قریشی، رامپور کے چند قلم کار: ڈاکٹر شریف احمد قریشی، دامن اور کانٹے: محترمہ خلیق النسا، ڈاکٹر حسن احمد نظامی حیات و خدمات، موم کا دل، غریب شہزادی: ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں، سنہری فیصلے: آنسہ ایمن تنزل کے نام قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 12 دسمبر 2016

آخری میل کا سفر

نئی دهلی: اردو کسی ایک فرقہ یا مذہب کی زبان نہیں ہے۔ اردو ایک تہذیب کا نام ہے۔ ان خیالات کا اظہار ممبر پارلیمنٹ اور معروف وکیل مجید میمن نے جگدیش پرکاش کے مجموعہ کلام 'آخری میل کا سفر' کی تقریب رسم اجرا میں

بحیثیت مہمان خصوصی خطاب کرتے ہوئے کیا۔ آئیڈیا کمیونیکیشنز کے زیر اہتمام انڈیا نیشنل سینٹر میں منعقد اس تقریب کی صدارت آل انڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل فیاض شہریار نے کی۔ جبکہ ہندی ادیب و مورخ وی کے برنیوال نے مہمان اعزازی کی حیثیت سے شرکت کی۔ اردو ادیب و دانشور ڈاکٹر سید تقی عابدی نے کلیدی خطبہ اور آئیڈیا کمیونیکیشنز کے ڈائرکٹر آصف اعظمی نے تعارفی کلمات پیش کیے۔ مہمان خصوصی مجید میمن نے کہا کہ جگدیش پرکاش کی شاعری امیدوں اور حوصلوں کی شاعری ہے۔ اس لیے ان کے مجموعہ 'آخری میل کا سفر' سے لفظ 'آخری' ہٹا کر پڑھنا چاہیے۔ اپنے صدارتی خطاب میں فیاض شہریار نے کہا کہ اردو زبان کی شیرینی، شستگی اور روانی میں ایک بڑا اہم کردار اردو رسم الخط کا ہے۔ اردو سے صحیح طور سے استفادہ کے لیے اس کے رسم الخط سے واقفیت ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ جگدیش پرکاش کی خوبی یہ ہے کہ وہ اردو رسم الخط اور اس کے اعراب سے کما حقہ واقف ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ سہل ممتنع کی شاعری میں کمال رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اردو کی چار سو سالہ تہذیبی روایات اور اردو کے فروغ میں غیر مسلم شعرا و ادبا کی خدمات پر روشنی ڈالی اور کہا کہ جگدیش پرکاش اسی سنہری کڑی کا ایک حصہ ہیں جس میں چندر بھان برہمن، مہاراجہ چندو لال سے لے کر دیا شنکر نسیم، چکبست، رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری تک کے نام آتے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 جنوری 2016

اکبر

نئی دھلی: مشہور مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کی زندگی پر لکھی گئی درجنوں کتابوں کے درمیان ایک ایسا ناول شائع

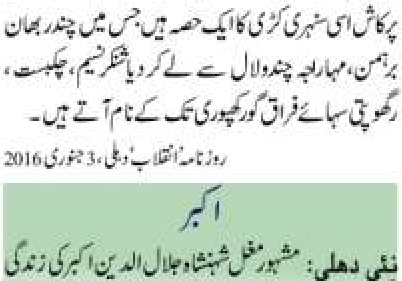

ہوا ہے، جس میں اکبر 'زندہ' نظر آئیں گے۔ پیشے سے صحافی شاذی زماں نے اکبر کے نام سے ایک ہندی ناول لکھا ہے، جس میں افسانوی انداز میں اکبر کے ان گوشوں کو نمایاں کیا گیا ہے جسے چھوڑ دیا گیا۔ انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں اپنی کتاب کے رسم اجرا کے موقعے پر شاذی زماں نے کہا کہ ''20 سال کی محنت کا نتیجہ ہے کہ آج میری یہ کتاب آپ پڑھ پائیں گے۔'' انھوں نے کہا کہ ''اکبر پر زیادہ تر حوالے فارسی اور عربی تواریخ میں ملتے ہیں، میں نے اس کا گہرائی سے مطالعہ کیا، خاص کر اس عہد کے تصویری نقشوں کا بہت باریکی سے معائنہ کیا۔ تب جا کر میں اکبر کو اس طرح سے محسوس کر پایا جس طرح کے اکبر کے عہد کے لوگ اسے سمجھ پائے تھے۔'' انھوں نے مزید کہا کہ ''اکبر کے 50 سالہ دور اقتدار میں معرکہ آرائیوں اور انتظامی صلاحیتوں کے بارے میں تاریخ نگاروں نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن اکبر کی ذہنیت کے بارے میں پڑھنے کو کافی کم ملتا ہے۔ انھوں نے جودھا کے حوالے سے کہا کہ ''مجھے اپنے مطالعہ کے دوران اکبر کی بیوی کے طور پر جودھا کا کوئی ذکر نہیں ملا۔''

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 جنوری 2017

خواجہ حسن نظامی: بحیثیت صحافی

میرٹھ: شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کے پریم چند سیمینار ہال میں شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر آصف علی کی تحقیقی و تنقیدی کتاب خواجہ حسن نظامی بحیثیت صحافی کا اجرا عمل میں آیا جس میں مہمان خصوصی کے طور

پر پروفیسر احمد محفوظ شریک ہوئے اور مجلس صدارت پر پروفیسر تنویر چشتی، ڈاکٹر عابد حسین حیدری، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، رونق افروز ہوئے۔ نظامت کے فرائض آفاق احمد خاں نے انجام دیے۔ کتاب اور مصنف پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر احمد محفوظ نے کہا کہ میرا تعلق ڈاکٹر آصف علی سے زمانہ طالب علمی سے ہے۔ انھوں نے مزید کہا گرچہ کتاب محض 196 صفحات پر مبنی ہے مگر اس میں اختصار کے ساتھ اردو صحافت کی تاریخ، خواجہ کی شخصیت و اعتقادات اور ان کے صحافتی کارناموں کا ایسا جامع نقش پیش کیا ہے جو ہزار صفحے پڑھنے پر بھی تشنگی کا احساس باقی رہ جاتا ہے۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ خواجہ حسن نظامی کے صحافتی کارناموں کی لمبی تاریخ ہے جس پر تحقیقی کام نہ ہونے کی وجہ سے رفتہ رفتہ ان کی خدمات پردۂ خفا میں چلی جا رہی ہیں۔ ڈاکٹر آصف علی نے یہ خوب صورت کام انجام دے کر بہت سی حقیقتوں کو واضح کر دیا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 6 دسمبر 2016

افسانے کی تلاش میں

مالیگاؤں: پرنسپل رحیم رضا کی مرتب کی گئی کتاب 'افسانے کی تلاش میں' کا اجرا یکم جنوری 2017 اردو سوشل ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی یاول کے زیر اہتمام مولانا آزاد لائبریری یاول میں منعقد کیا گیا، جس کی صدارت مدیر جناب خیال انصاری نے کی۔ اس کا اجرا روزنامہ ترجمان اردو کے مدیر محمد یوسف انصاری نے کی۔ رسم اجرا کے بعد ایس ایم انور اس کتاب پر تبصرہ کیا۔ ڈاکٹر مناف شیخ (جلگاؤں) نے اس کتاب میں شامل 16 افسانوں پر اپنا تبصرہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ ایک اچھی کوشش ہے۔ اس کے بعد خیال انصاری خطبہ صدارت سے قبل اس کتاب میں شامل افسانوں پر تبصرہ کیا۔ خیال انصاری نے مزید کہا کہ رحیم رضا نے کچھ نئے اور کچھ پرانے قلمکاروں کو ایک جگہ جمع کر کے ان کے افسانوں کا مجلہ شائع کر کے ایک تاریخ مرتب کی ہے۔

پریس ریلیز: عقیل شیخ، مالیگاؤں، 5 جنوری 2017

کٹورے میں چاند

نئی دہلی: شکیل جمالی نے ہمارے عہد کی حسیت اور کرب کو بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے۔ انھیں اپنی زبان کے تخلیقی استعمال پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ وہ اردو غزل کی عزت و عفت کی حفاظت کرتے ہیں۔ ان کی شاعری مسرت سے بصیرت تک کا سفر ہے۔ کٹورے میں چاند کو اتارنے کا سلیقہ اگر کسی کو سیکھنا ہو تو وہ شکیل جمالی سے سیکھے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر اختر الواسع نے مظہر فاؤنڈیشن انڈیا کے زیر اہتمام غالب اکادمی میں منعقد کیے گئے ایک جلسے میں شکیل جمالی کی کتاب کا اجرا کرتے ہوئے کہا۔ اس موقعے پر پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ شکیل جمالی کا لب و لہجہ بالکل منفرد ہے۔ ان کے یہاں جو طنز کی کاٹ ہے وہ اصلاح کے لیے ہے۔ مشہور اور منفرد لب و لہجے کے شاعر جناب فرحت احساس نے کہا کہ میں انھیں غزل کے رمز اور کنائے کو پروان چڑھانے والا اپنے قبیلے کا شاعر سمجھتا ہوں۔ وہ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں اور سنجیدہ ادبی حلقوں میں وہ اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہیں۔ شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدر پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ شکیل جمالی کے تخلیقی تجربات بہت اہم ہیں۔ وہ نہایت ہی مہذب، منکسر المزاج اور شائستہ انسان ہیں اور تمام اوصاف ان کی شاعری میں بھی نظر آتے ہیں۔ پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے کہا کہ شکیل جمالی بہت آہستگی سے شعر کہہ جاتے ہیں اور بڑے پتے کی بات کہتے ہیں۔

اس موقعے پر مظہر فاؤنڈیشن کے بانی صدر پروفیسر کوثر مظہری نے 'کٹورے میں چاند' کے اجرا پر شکیل جمالی کو مبارکباد پیش کی اور کہا کہ میں نے ان کی شاعری پر جو کچھ لکھا ہے وہ اس کتاب میں شامل ہے۔ انھوں نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ غزل جو امتحان لینے والی صنف سخن ہے، اس کو شکیل جمالی بڑی ہی خوش اسلوبی سے برت لے جاتے ہیں

اور سامنے کے الفاظ سے گھر آنگن اور رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ کو خوبصورتی سے پیش کر دیتے ہیں۔ حقانی القاسمی نے شکیل جمالی کو مبارک باد پیش کی اور 'کٹورے میں چاند' میں شامل اپنے مضمون کے کچھ حصے پڑھ کر سنائے جسے لوگوں نے خوب پسند کیا۔ دوسرے اظہار خیال کرنے والوں میں راشد جمال فاروقی، شہلا نواب، معصوم مراد آبادی بھی شامل تھے۔

واضح رہے کہ رسم اجرا کے بعد ایک شعری نشست بھی آراستہ کی گئی جس کی صدارت حضرت ابرار کرتپوری نے فرمائی۔ پہلے اور دوسرے دونوں حصوں کی نظامت جناب معین شاداب نے فرمائی۔ شعری نشست میں شریک ہونے والے شعرا کے اسمائے گرامی کچھ اس طرح ہیں: فرحت احساس، کوثر مظہری، اسرار جامعی، ڈاکٹر رحمٰن مصور، شکیل جمالی، معین شاداب، پروفیسر اختر، عدیل تابش، راشد جمال فاروقی، عادل رشید، خورشید حیدر، شناور کرتپوری، افضال احمد، جاوید قمر، ارشد ندیم، ارملا مادھو، متین امروہوی، سبھاش جاوا، سیتارام اگروال، ڈاکٹر سریندر سنگھل، خوشبو سکینہ، جنید اختر اُسامہ، ارشاد خان سکندر، مینا کشی جیجیو شا، سُشیلا شوانی، اطہر اعظمی، حامد علی اختر، بلجی وشِشٹ وغیرہ۔

پریس ریلیز: کوثر مظہری، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، 10 دسمبر 2016

شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی

پانی پت: یہاں منعقد ایک تقریب میں تحریک ریشمی رومال کے قائد مجاہد اعظم اور اسیر مالٹا مولانا محمود حسن کی حیات مبارکہ پر مشتمل ایک کتاب 'شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی' کا رسم اجرا عمل میں آیا، یہ کتاب مولانا حمید اللہ قاسمی کیر نگری نے لکھی ہے، جس پر دارالعلوم وقف دیوبند کے استاد مولانا نسیم اختر شاہ قیصر اور جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ کے استاد مولانا محمد ساجد کھجناوری جیسے اہل علم کی تقاریظ ہیں، کتاب پر فاضل مورخ مفتی مسعود عزیزی کا مقدمہ ہے۔ کتاب میں شیخ الہند لقب، ابتدائی تعلیم، حجۃ الاسلام مولانا قاسم نانوتوی کی خدمت میں دستار فضیلت اور دیگر امور پر تفصیلات درج ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 دسمبر 2016

وفیات

قاری محمد اسحاق

سہارنپور: ملک کے ممتاز بزرگ صحافی و ملی شاعر محترم قاری محمد اسحاق حافظ سہارنپور کا 7 دسمبر 2016 کو انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 91 سال تھی۔ مرحوم نہ صرف خوش مزاج شخصیت کے مالک تھے بلکہ انتہائی دیندار قلندرانہ صفت کے مالک بھی تھے۔ شاعری کے ساتھ صحافی بھی تھے، چالیس سال تک اپنا اردو ہفت روزہ اخبار نوائے وطن پابندی کے ساتھ نکالا، عرصہ تک پنجاب وقف بورڈ کے تحت انبالہ میں مسجد سائیں توکل شاہ میں امامت کے فرائض انجام دیے، قاری حافظ سہارنپوری کا مجموعہ کلام 'چراغ رہگذر' کے نام سے 2010 میں شائع ہوکر ادبی حلقوں میں کافی مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ مرحوم اپنے اکابرین کے ساتھ مدنی گھرانہ سے خصوصی تعلق رکھتے تھے، قاری صاحب کی نماز جنازہ اسلامیہ ڈگری کالج میں جمعیۃ علماء ہند کے صدر محترم مولانا سید ارشد مدنی نے پڑھائی، نماز جنازہ و تدفین میں عزیز و اقارب کے علاوہ دیگر احباب نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 8 دسمبر 2016

فرحت قادری

گیا: اردو کے معروف شاعر فرحت قادری کا 10 دسمبر 2016 کو انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 88 سال تھی۔ پسماندگان میں چار بیٹیاں اور تین بیٹے شامل ہیں۔ نیو کریم گنج قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ شہر کے معزز لوگوں کے ساتھ ساتھ ادبی حلقہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے نماز جنازہ میں بڑی تعداد میں شرکت کی اور پرنم آنکھوں سے انھیں سپرد خاک کیا۔ انھیں ادب سے اتنا زیادہ شغف اور لگاؤ تھا کہ ضعیفی میں بھی کتابوں سے جڑے رہتے تھے۔ آپ کی ایک کتاب 'شیشہ اور پتھر' مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا کے ایم اے کے نصاب میں تھی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 دسمبر 2016

پروفیسر نور العین علی

نئی دھلی: پروفیسر حبیب الرحمٰن صدیقی کی بیٹی اور اسمٰعیل میرٹھی کی پوتی پروفیسر نور العین علی کا 25 دسمبر 2016 کو ناگپور واقع ایک اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ دہلی میں واقع ان کے رشتے دار حکیم حسین ظہیر نے بتایا کہ ان کی تدفین 26 دسمبر کو صوبہ مہاراشٹر کے امراوتی کیمپ میں بعد نماز ظہر ادا کی گئی۔ اسی ماہ کے آغاز میں انھیں اچانک طبیعت خراب ہونے پر اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔ ان کی عمر تقریباً 90 سال تھی۔ معروف علمی گھرانے سے وابستہ سابق پرنسپل ٹیچر ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی پروفیسر نور العین علی کی وابستگی تھی۔ مرحومہ خوش اخلاق، نیک و مخلص اور صوم و صلوٰۃ کی پابند تھیں۔ انھیں ملک کی کئی اکادمیوں نے اعزاز سے نوازا تھا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ نے بھی انھیں غالب ایوارڈ سے نوازا تھا۔ ان کا شمار معروف ڈرامہ نگاروں میں کیا جاتا تھا۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر تقریباً 60 ڈرامے تحریر کیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 26 دسمبر 2016

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

نئی دھلی: ہندوستانی سیاست کے ایک بے لوث خادم، مجاہد آزادی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق استاد اور سابق ممبر پارلیمنٹ (راجیہ سبھا) ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی کا دہلی کے اپولو اسپتال میں طویل علالت کے بعد تقریباً 95 سال کی عمر میں 10 جنوری کو شام 5 بجے انتقال ہوگیا۔ ان

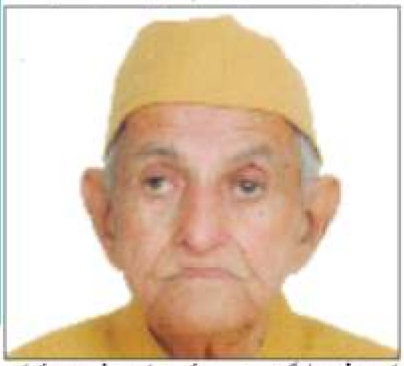

کی تدفین علی گڑھ میں ہوئی۔ ڈاکٹر ہاشم قدوائی کی پیدائش سرکاری ریکارڈ کے مطابق 31 مارچ 1921 ہے۔ ان کے والد ڈپٹی کلکٹر عبدالمجید دریابادی تھے جو مولانا عبدالماجد دریابادی کے بڑے بھائی تھے۔ مرحوم کے دو بڑے بھائیوں حکیم عبدالقوی دریاآبادی، حبیب احمد قدوائی اور بڑی بہن عابدہ خاتون کی وفات ہوچکی ہے۔ سب سے چھوٹے بھائی عبدالعلیم قدوائی باحیات ہیں۔ مرحوم کی اہلیہ زہیرہ خاتون بنت مولانا عبدالماجد دریابادی کا انتقال 12 جنوری 2005 کو ہوا تھا۔ ان کے پس ماندگان میں تین صاحب زادیاں رشیدہ خاتون، خالدہ خاتون، سارہ خاتون نیز دو صاحب زادے ڈاکٹر محمد سلیم قدوائی اور عبدالمعز قدوائی ہیں۔ ان کی زندگی قابل رشک تھی اور ان کی حیات 'یقیں محکم عمل پیہم' سے تعبیر تھی۔ انھوں نے درجنوں کتابیں تصنیف کیں اور تادم حیات لکھنے پڑھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ اے ایم یو میں کوئی 35 برسوں تک پالیٹیکل سائنس پڑھاتے رہے۔ ان کے شاگردوں میں نائب صدر جمہوریہ محمد حامد انصاری بھی شامل ہیں۔ مرحوم ایک قوم دوست مسلم تھے اور ہندوستان چھوڑو تحریک کے طلبہ گروپ میں شامل تھے۔ پچھلے سال 27 ستمبر کو یہاں نائب صدر جمہوریہ حامد انصاری نے اپنے گھر پر مرحوم کی آپ بیتی پر مبنی کتاب 'نیشنلسٹ مسلم' کا اجرا کیا تھا۔ یہ کتاب 1947 سے قبل جنگ آزادی کی جدوجہد میں وطن پرستوں کے رول اور اس کے بعد کے حالات کا بھرپور احاطہ کرتی ہے، جس میں علی گڑھ اور کانگریس پارٹی کی تاریخ کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سید احمد خاں نے

ان کے انتقال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ایک زندہ تاریخ کے حامل ڈاکٹر ہاشم قدوائی کا انتقال قوم وملت کے لیے آزادی کے بعد ایک عظیم سانحہ ہے۔

روز نامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 11 جنوری 2017

بلراج مین را

نئی دهلی: اردو کے ایک عظیم فکشن نگار بلراج مین را کا 15 جنوری 2016 کو ان کی رہائش گاہ پر انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر تقریباً 72 سال تھی۔ پسماندگان میں ایک بیٹا اور بہو شامل ہے۔ ذرائع نے بتایا کہ ان کی آخری رسوم میں ادبی اور سماجی حلقوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ مسٹر مین را نے 1956 سے لکھنا شروع کیا تھا۔ انھوں نے 1990 میں منٹو کی تحریروں کو چھ جلدوں میں دستاویزات کے نام سے جمع کیا تھا۔ ان کی پہلی کتاب 'سرخ وسیاہ' منظر عام پر آئی تھی۔ ان کی دوسری کتاب کہانیوں کا مجموعہ 'مقتل' ہے جو 2007 میں شائع ہوئی تھی۔ انھوں نے 1980 میں شعور کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا تھا۔ گرچہ اس کا صرف چھ شمارہ ہی نکل سکا لیکن وہ اپنی چھاپ چھوڑ گیا۔ انھوں نے دیویندر ستیارتھی پر پہلا کام تھا۔ یہ کام انھوں نے 'کتاب نما' کے لیے کیا تھا۔ ان کی کہانی 'ماچس' پر امریکہ میں 'ماچس بکس' کے نام سے ایک فلم بھی بن چکی ہے۔ ان کے انتقال پر مشہور نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنے گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے بلراج مین را کو اس عہد کا اردو کا ایک عظیم افسانہ نگار قرار دیا اور کہا کہ اردو دنیا ایک بہترین افسانہ نگار سے محروم ہو گئی ہے۔ روز نامہ 'انقلاب' دہلی، 16 جنوری 2017

شہباز ندیم ضیائی

نئی دهلی: پرانی دہلی کے مشہور ومعروف شاعر شہباز ندیم ضیائی کا ایل این جے پی اسپتال میں 15 جنوری 2016 کو انتقال ہو گیا۔ وہ متعدد امراض میں مبتلا تھے۔ لال کنواں کے کٹرہ شیخ لال چند میں رہنے والے 65 سالہ بزرگ شاعر شہباز ندیم ضیائی کے اجداد امروہہ سے دہلی آکر بس گئے تھے۔ دہلی کی ادبی محفلوں کی جان کہلائے جانے والے شاعر شہباز ندیم ضیائی کے اب تک 6 مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں سے ایک پر دہلی اردو اکادمی نے ایوارڈ بھی دیا تھا۔ ان کے پسماندگان میں اہلیہ، چار بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔ روز نامہ 'انقلاب' دہلی، 16 جنوری 2017

خراج عقیدت:

سید کوثر جعفری کو خراج عقیدت

مالیرکوٹله: پنجاب اردو اکادمی میں معروف قلمکار، عاشق اردو اور محب اردو سید کوثر علی شاہد جعفری کے انتقال پر ایک تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا جس میں مرحوم کی موت کو اردو شعرو ادب کے لیے ایک ناقابل تلافی نقصان قرار دیا گیا۔ اس تعزیتی نشست کی صدارت صادق حسین نقوی ممبر پنجاب وقف بورڈ نے کی۔ نشست کے آغاز میں پروفیسر محمود عالم نے مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے انھیں صحیح معنوں میں اردو کا بہی خواہ، ہمدرد اور خدمت گار قرار دیا جنھوں نے اپنے نامساعد حالات میں بھی اردو کی شمع کو روشن رکھا۔ اردو رابطہ کمیٹی پنجاب کے کنوینر ظہور احمد ظہور نے کہا کہ کوثر نے بحیثیت استاد بچوں کی کردار سازی میں ہمیشہ ہی نمایاں رول ادا کیا۔ ادارہ ادب اسلامی کے جنرل سکریٹری رمضان سعید نے کہا کہ مرحوم ہمیشہ ہی غیر ضروری باتوں سے گریز کرتے تھے اور ادبی گفتگو کے موضوع پر ہی اپنی توجہ مرکوز رکھتے تھے۔ مفتی اعظم پنجاب ارتقا الحسن کاندھلوی نے مرحوم کوثر علی شاہد جعفری کی علمیت، ان کی لیاقت اور پابندیٔ وقت کا خصوصی طور پر ذکر کیا اور ان کی مقناطیسی شخصیت کا اجمالی جائزہ بھی پیش کیا۔ صدر مجلس صادق حسین نقوی نے انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ کوثر نے اعلیٰ انسانی اقدار کو ہمیشہ سینے سے لگائے رکھا۔ تعزیتی نشست کے آخر میں پنجاب اردو اکادمی کے سکریٹری پروفیسر منظور حسن نے سید کوثر علی شاہد جعفری کے انتقال پر قرارداد پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ مرحوم صحیح معنوں میں اردو کی بقا اور اس کے فروغ کے زبردست حامی تھے جو ہمیشہ ہی اس کی بہتری اور مقبول عام بنانے کے لیے کوشاں رہے۔ اس تعزیتی نشست میں نظامت کے فرائض ڈاکٹر سلیم زبیری نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ روز نامہ 'جدید خبر' دہلی، 5 جنوری 2017

حکیم مفتی احمد حسن ٹونکی

نئی دهلی: آل انڈیا یونانی طبی کانگریس راجستھان اسٹیٹ کے سرپرست حکیم مفتی احمد حسن ٹونکی کے انتقال پر آل انڈیا

یونانی طبی کانگریس، مرکزی کمیٹی کی جانب سے ایک تعزیتی نشست کا اہتمام دریا گنج، نئی دہلی میں کیا گیا۔ واضح ہو کہ حضرت حکیم مفتی احمد حسن ٹونکی 102 سال کی عمر میں 27 نومبر 2016 کو جے پور میں اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔ ان کی پیدائش شمس العلما مولوی امام الدین خانؒ کے خانوادے میں جنوری 1914 (ٹونک، راجستھان) میں ہوئی۔ سرزمین ٹونک وہی مقام ہے کہ جسے ایک وقت میں پورے ہندوستان میں واحد شرعی ریاست ہونے کا شرف حاصل رہا ہے اور وہاں کے مشاہیر اپنے علوم وفنون سے ایک عالم کو منور کرتے رہے ہیں۔ آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر سید احمد خاں نے بتایا کہ 1999 میں 'اردو ڈے' کے موقع پر یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا اور اُردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کی جانب سے عالمی یوم اردو ایوارڈ برائے ترویج وترقی اردو زبان اور طب یونانی سے سرفراز کیا گیا تھا۔ انھوں نے مزید بتایا کہ ایسی شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔ اظہار تعزیت کرنے والوں میں پروفیسر غلام قطب چشتی، ڈاکٹر ساجد نثار، ڈاکٹر نواز الحق اجمیری، ڈاکٹر عبداللہ خاں، ڈاکٹر سنجے دھینگرا، ڈاکٹر شمشاد احمد، اسرار احمد اُجینی، محمد صابر آرکو، حکیم حافظ مرتضیٰ دہلوی، حکیم عطاء الرحمٰن اجملی، ندیم عارف اور محمد عمران قنوجی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ دعائے مغفرت کے ساتھ تعزیتی نشست اختتام پذیر ہوئی۔

پریس ریلیز: محمد عمران قنوجی، پریس سکریٹری، آل انڈیا یونانی طبی کانگریس، نئی دہلی، 2 دسمبر 2016

ڈاکٹر محمد ہاشم علی

گنگوتری: گنگوتری میں مایہ ناز محقق اور ماہر دکنیات ڈاکٹر محمد ہاشم علی صاحب مرحوم سابق صدر شعبۂ اردو مانسا گنگوتری کی وفات پر ایک تعزیتی پروگرام پیش کیا گیا۔ پروفیسر محمد ہاشم علی 86 سال کی عمر پا کر اس دنیائے فانی سے رحلت کر گئے۔ صدر شعبہ پروفیسر مسعود سراج نے مرحوم کے تعزیتی پروگرام کا انعقاد کیا، پروفیسر مسعود سراج صدر شعبۂ اردو مانسا گنگوتری نے مرحوم سے اپنے ذاتی تعلقات کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر محمد ہاشم علی مرحوم ایک مایہ ناز محقق، نقاد اور ماہر دکنیات تھے، مرحوم کا حافظہ کافی قوی تھا، ہزارہا اشعار اور اقتباسات ان کو ازبر تھے، دکنیات اور ترقی پسند ادب پر گہری نظر تھی۔ آخر میں سید شفیع احمد نے مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کی، پروگرام کی نظامت فضیل اختر ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو مانسا گنگوتری نے کی۔ اس تعزیتی پروگرام میں پروفیسر راجنا رجسٹرار آف میسور یونیورسٹی، جناب عبدالسلام صاحب سنڈی کیٹ ممبر آف یونیورسٹی آف میسور، پروفیسر مہیش اور دیگر شرکا نے شرکت کی۔

پریس ریلیز: نعمت اللہ خان، گنگوتری، 9 دسمبر 2016

بھیونڈی کتاب میلے کے کچھ مناظر

URDU DUNIYA Monthly, February-2017, Vol.19, Issue:02
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2017-19
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/01/2017
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم وآگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی وتحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش وجستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail::ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025